''چہارسُو''

..... بلہہ کیہ جاناں میں کون .....

چند دن پہلے دورِ حاضر کی معروف نثر نگار ذکیہ مشہدی صاحبہ کی طرف سے ایک خوبصورت تحفہ ''بلہہ کیہ جاناں میں کون'' موصول ہوا۔ ناول پڑھنا شروع کیا تو تحریر نے اپنی گرفت میں لے لیا اور پھر اختتام تک اسکا سحر قائم رہا۔ ناول بہت دلچسپ اور بامعنی ہے۔ مصنفہ نے بڑے اہم موضوع کو لیا ہے۔ مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو ہندو مذہب کے ساتھ ساتھ اور مذاہب کا بھی گہرا علم ہے۔ مذہب اسلام کے عقائد اور ہندوستان کے اسلامی معاشرے کے ریت رواجوں کے ساتھ ہندو عقائد اور ریت رواجوں کو بھی اچھی طرح بیان کیا ہے۔ ہمارا ملک جن حالات اور پریشانیوں سے گزر رہا ہے انکے علاوہ بین الاقوامی حالات کا ذکر بھی بڑی دردمندی کے ساتھ کیا ہے۔

کردار مختصر ہیں لیکن سب اپنی جگہ باکمال۔ سب سے اچھی بات یہ کہ ان میں سے کسی میں negativity نہیں ہے۔ ناول کی بنیادی تھیم میں بین المذاہب شادی ہے لیکن دونوں طرف کے لوگ کھلے ذہن کے خوش اخلاق لوگ ہیں بیشک عقیدے اور تہذیبی وثقافتی اعتبار سے ان میں فطری اختلافات موجود ہیں۔ ان کے رشتوں میں مٹھاس بھی ہے درد اور کسک بھی مذہب نے دنیا کو خانوں میں بانٹ دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسانیت سے بڑا کوئی مذہب نہیں۔ میں مصنفہ کی اس بات سے اتفاق کرتی اور انہیں مبارکباد دیتی ہوں کہ وہ اپنی بات دلچسپ پیرائے میں خوبصورتی کے ساتھ قارئین تک پہنچانے میں کامیاب ہیں۔ انہوں نے کہیں بھی ناصح کا کردار نہیں اختیار کیا۔

رینو بہل

قیمت: ۱۶۰ روپے، دستیابی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔

..... گلاب بصد آب .....

تصور اقبال کا نیا شعری مجموعہ ''گلاب بصد گلاب'' اس وقت میرے سامنے ہے۔ یہ مجموعہ ان کے پچھلے مجموعوں کی طرح ان کی شاعری کی سادگی، پُرکاری اور صداقت شعاری کے عناصر کی کھُل کر ترجمانی کر رہا ہے۔ ان کے افکار پر اسلامی افکار کا رنگ غالب ہے جو قاری کو گاہے گاہے زندگی کی اعلیٰ اور مثبت قدروں کی طرف راغب کرتا ہے۔ فکر صالح کی مہک ان کی پوری شاعری میں موجود ہے۔ ایسی مہک جس سے دل معطر اور مشامِ جاں مشک بار ہو جاتے ہیں۔ تصور اقبال کو معاشرے میں ہونے والے حوادث کا بھی بخوبی ادراک ہے اور وہ بے مہریٔ ایام کے ہاتھوں ستائے ہوئے آج کے انسان کے دکھ درد سے بھی خوب واقف ہیں۔ معاشرے میں ناانصافی، عدم رواداری، ظلم، بدعنوانی اور طبقاتی محرومیوں پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ غمِ دوراں کے ستائے ہوئے انسانوں کے حالات بھی انکے لیے سوہانِ روح ہیں لیکن باایں ہمہ وہ غم جاناں کی کسک بھی دل میں شدومد سے محسوس کرتے ہیں۔ ان کی شاعری غمِ ذات اور غمِ کائنات کی تشریح وتفسیر ہے۔ وہ شعر کے اسلوبی تقاضوں کو بھی خوب سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ موقع کے مطابق عمدہ تشبیہات، استعارات، رمز وایما اور دیگر شعری محاسن سے اپنے کلام کو مرصع کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سید قاسم جلال

اشاعت: ۲۰۲۰ء، قیمت: ۴۰۰ روپے، دستیابی: اردو بخش، لاہور۔

..... بساط .....

اشرف جاوید ایک فطری شاعر ہیں۔ ان کا تخلیقی معیار بلند ہے کیوں کہ وہ شاعری کو ایک سنجیدہ عمل سمجھتے ہیں۔ اشرف جاوید کے اب تک کئی شعری مجموعے شائع ہو کر ادبی حلقوں کی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ان کا کلام تربیت یافتہ تخلیقی ذہن کا مظہر ہے۔ رسمی اظہار سے ہٹ کر وہ اپنی بات اپنے انداز میں کہتے ہیں۔ ان کے کلام میں ذاتی کیفیات کے ساتھ ساتھ عصری اور سماجی شعور جمالیاتی سطح پر اجاگر ہوا ہے۔

اشرف جاوید کی غزل کے تیور، خدوخال اور مزاج بالکل مختلف ہے۔ ہنر پر اُن کی دسترس، خیال کی ندرت، بیان کی فصاحت اور غزل کی تشکیلِ نو کا عمل یقیناً قابل توجہ ہے۔ برسوں بعد غزل نے کروٹ لی ہے تو اس کا نیا رخ سامنے آیا ہے جو دل پذیر بھی ہے اور مستقبل گیر بھی۔ میں انہیں نئے شعری مجموعے ''بساط'' کی اشاعت پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

پروفیسر سحر انصاری

اشاعت: ۲۰۲۰ء، قیمت: ۶۰۰ روپے، دستیابی: رنگِ ادب پبلی کیشنز، اردو بازار، کراچی۔

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۳۰،شمارہ:مارچ،اپریل ۲۰۲۱ء

بانی مدیراعلیٰ

سیدضمیرجعفری

مجلسِ مشاورت

○☆○

قارئین چہارسُو

○☆○

زرِسالانہ

○☆○

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

مدیرمسؤل

گلزارجاوید

○☆○

مدیرانِ معاون

بیناجاوید

فاری شا

محمدانعام الحق

عروب شاہد

آمنہ علی

رابطہ:537/D-1 ‘گلی نمبر 18،ویسٹریج-III‘راولپنڈی،46000،پاکستان۔

فون:(+92)-51-8730633-8730433

موبائل:(+92)-336-0558618

ای۔میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر:فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازارراولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق ------- شعیب حیدر زیدی
تزئین ---------------- عظمیٰ رشید
کمپوزنگ ------------- تنویر الحق

قرطاسِ اعزاز ۵
مدھر چاندنی ------------ محمد انعام الحق ۶
خوابیدہ فسانے ---------- عطیہ سکندر علی ۸
براہِ راست -------------- گلزار جاوید ۱۰

افسانہ
زندہ درگور ------------- نورالحسنین ۱۸
کچھ باتیں، یادیں اور توقعات --- حمایت علی شاعر ۲۱
فقط بیان تک ----------- سلام بن رزاق ۲۳
کہانیوں کی پٹاری --------- نگار عظیم ۲۶
ایوانوں کے خوابیدہ چراغ ----- علی احمد فاطمی ۳۲
تلک الایام ------------ خان حسنین عاقب ۳۸
خالق کا کرشمہ ---------- انتخاب حمید ۴۳
آہنکار ---------------- بشر نواز ۴۸

ناول کا باب
چاند ہم سے باتیں کرتا ہے ------- نورالحسنین ۵۰

عزم وایمان
محمد شاہد صدیقی شاہد، نسیم سحر۔ ۶۰

افسانے
ہم سفر کوئی مل جائے گا --------- فیروز عالم ۶۱
سرفروشی کی تمنّا ------------- رینو بہل ۶۵
مٹّی کی ٹوکری --------------- جمیل احمد عدیل ۶۹
بٹوارہ ----------------- تنویر احمد تماپوری ۷۰
لاک ڈاؤن -------------- فرخندہ شمیم ۷۲

شب کے اندھیرے
محسن نقوی، سلیم کوثر، اشفاق حسین، نسیم سحر، واصف حسین واصف، نذیر قیصر، زبیر فاروق، اشرف جاوید، عظیم بخت، ڈاکٹر ریاض احمد۔ ۷۴

افسانے
یہ کیسے رشتے ------------- وحشی سعید ۷۹
تہی دامن -------------- ناہید طاہر ۸۲
جیکٹ کے داغ ----------- فیصل عظیم ۸۵
وقت کی آواز ------------- رعنا کوثر ۸۷
صحرا میں اذان ------------ گلزار جاوید ۸۸

صدائے شش جہات
جنید آزر، فیصل عظیم، قاسم جلال، نزہت شاہ، نسیم عزیز، عمیر نجمی، فرح کامران، محبوب اصغر، عبدالسلام عارف، نصرت بخاری، رفیع الدین ذکی، احمد نثار، نوید سروش، افق فریدی، رئیس صدیقی۔ ۹۱

سفرنامہ
برطانیہ سے جاپان --------- یعقوب نظامی ۹۶

دنیا میرے آگے
مارفین کی دنیا ----------- تابش خانزادہ ۱۰۰

حکمِ الٰہی
رضیہ اسماعیل، رؤف خیر، عبداللہ جاوید، یوگیندر بہل تشنہ، حمیدہ معین رضوی، علیم صبا نویدی، انجم جاوید، ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی، مشیر طالب، وشال کھلر، نصرت بخاری۔ ۱۰۲

نشانِ راہ
تاریخ کے نقوش -------- ڈاکٹر مبارک علی ۱۰۸

آئینۂ فن
بادِ ساز گار لوگ ------------ ناصر علی سید ۱۰۹
سادگی وتہہ داری --------- آفاق عالم صدیقی ۱۱۱

ایک صدی کا قصہ
شکیل بدایونی ------------ دیپک کنول ۱۱۲

رس رابطے
جستجو، ترتیب، تدوین -------- وجیہہ الوقار ۱۱۶

---☆---

سن چکے جب حال میرا لے کے انگڑائی کہا
کس غضب کا درد ظالم تیرے افسانے میں تھا
(شاد عظیم آبادی)

قرطاسِ اعزاز

نور الحسنین

کے نام

مدھر چاندنی

محمد انعام الحق

(اسلام آباد)

ادبی نام : نورالحسنین

پورا نام : نقشبندی سید نورالحسنین

نام والد : نقشبندی سید نورالوحید

(مرحوم۔جاگیردار آصف جاہی سلطنت)

نام والدہ : غوثیہ بیگم (مرحوم۔جاگیردار پمپری راجہ)

تاریخ پیدائش: ۱۹ / مارچ ۱۹۵۰ء

مقام پیدائش: اورنگ آباد (دکن)

شریکِ حیات: یاسمین حسنین (مرحومہ)

اولادیں

۱۔ سید نورالوحید۔فرحاج۔اہلیہ صبا تحسین

۲۔ سیدہ بتول فاطمہ۔ذوجہ۔سید رعناذ کی الدین۔

۳۔ سید نورالفرید۔فرحان۔

۴۔ سیدہ عائشہ فاطمہ۔ذوجہ۔سید صمدالحق۔

موبائل نمبر: 09890849736,9284606318

ای میل: nuurulhusnain@ymail.com

رہائش: 31 -12 -1، پرگتی کالونی۔گھاٹی۔اورنگ آباد 431001 (مہاراشٹر)

تعلیم: ایم۔اے اُردو (میرٹ)

ابتدائی تعلیم تعلقہ کنڑ ضلع اورنگ آباد

میٹرک تک کی تعلیم مولانا آزاد ہائی اسکول اورنگ آباد (دکن)

گریجویشن مولانا آزاد کالج اورنگ آباد پنڈت نہرو کالج اورنگ آباد

پوسٹ گریجویشن مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد

پہلی کہانی کی اشاعت (جب ساتویں کا طالب علم تھا)

انسانیت (بچوں کا صفحہ۔کھلتی کلیاں۔روزنامہ ہندوستان۔ممبئی)

پہلا افسانہ ''کالے ہاتھ'' (ماہنامہ۔بانو۔دہلی)

افسانوں کے مجموعے

۱۔ سمٹتے دائرے ۱۹۸۵ء

۲۔ مورقص اور تماشائی ۱۹۸۸ء

۳۔گڑھی میں اُترتی شام ۱۹۹۹ء

۴۔فقط بیان تک ۲۰۱۲ء

ناول

۱۔اَہنکار (مادیت اور انسانی رشتوں کے تصادم پر مبنی ۲۰۰۵ء

۲۔ایوانوں کے خوابیدہ چراغ (۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی پر پہلا مکمل ناول) ۲۰۱۳ء

۳۔ چاند ہم سے باتیں کرتا ہے (۵۰۰ق۔م تا اکیسویں صدی تک پھیلی ہوئی داستان عشق) ۲۰۱۵ء

۴۔ تلک الایام۔تصوف اور عصری مسائل پر مبنی ناول

تنقید

۹۔ نیا افسانہ۔نئے نام (۱۹۷۰ کے بعد اُبھرنے والے افسانہ نگاروں پر مضامین۔ ۲۰۱۲ء

۱۰۔ نیا افسانہ نئے نام۔جلد دوم ۲۰۱۶ء

۱۱۔ خوش بیانیاں۔(خاکے) ۲۰۰۳ء

۱۲۔ انسان امر ہے (اسٹیج ڈرامہ۔ریڈیائی ڈرامہ اور فیچرز) ۲۰۰۹ء

۱۳۔اقبال متین سے اُنسیت (شخصیت اور فن) ۲۰۱۲ء

۱۴۔فلم فہمی۔(اس موضوع پر یشونت راؤ چوہان اوپن یونیورسٹی کے لیے نصابی کتاب لکھی)

بچوں کے لیے

۱۵۔گڈو میاں۔(کہانیاں) ۱۹۸۸ء

۱۶۔چوتھا شہزادہ (کہانیاں) ۲۰۰۹ء

۱۶۔حضور کا اقبال بلند رہے۔(ڈرامے) ۲۰۰۸ء

۱۷۔انڈو ایران کلچرل سوسائٹی اورنگ آباد کے لیے مجاہدین آزادی اور اُن کی حیات پر ایک مجلّہ ترتیب دیا۔

ناولوں کو بیرون ملک مقبولیت

۱۔ناول، ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' چونکہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے پس منظر میں لکھا گیا۔کینڈا کے ٹی۔وی چینل ''را'' نے اس پر پورے ایک گھنٹے کا پروگرام ٹیلی کاسٹ کیا۔

۲۔ناول ''چاند ہم سے باتیں کرتا ہے'' اسے بھی بے انتہا مقبولیت مل رہی ہے۔ چونکہ اس ناول میں بھی زماں و مکاں کی قید سے پرے ایک بہت وسیع پس منظر میں بیان کیا گیا ہے جو ۵۰۰ق۔م سے اکیسویں صدی کے ایک دہے پر محیط ہے۔

اس ناول پر بھی کینڈا کے ''را'' ٹی۔وی چینل نے ایک گھنٹے کا پروگرام ٹیلی کاسٹ کیا۔

اعزاز و انعام

۱۔ پانچ مرتبہ۔مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی سے کتابوں پر انعام ملا۔

۲۔مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی سے اسٹیٹ لیول کا انعام۔شاہ سراج اورنگ آبادی۔بھی عطا ہوا۔

۳۔اُتر پردیش اردو اکادمی سے تین مرتبہ فکشن کا بڑا ایوارڈ اور ایک مرتبہ افسانوی مجموعہ 'سمٹتے دائرے' پر ایوارڈ ملا۔
۴۔کل ہند اردو پریشد سوسائٹی پونا کی جانب سے فکشن ایوارڈ، عصمت جاوید ایوارڈ سے نوازا گیا۔
۵۔چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ کی جانب سے فکشن کا، منظر کاظمی قومی ایوارڈ برائے ۲۰۱۷ء
۶۔دوہا قطر عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ برائے 2020ء کا اعلان۔

ملازمت

۱۔معین العلوم ہائی اسکول اورنگ آباد
۲۔ سینئر اناونسر۔آل انڈیا ریڈیو اورنگ آباد سے ریٹائرڈ۔
(ریڈیو کے لیے تقریباً کلاسیکی ادب کو تیرا تیرا اپی سوڈ میں لکھا بھی اور پروڈیوز کے ساتھ ساتھ مرکزی کردار کی صدا کاری بھی کی۔بے شمار ڈرامے اور فیچرز لکھے۔فلمی پروگرام بھی ترتیب دیئے۔)
۳۔ اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر۔گیان وانی۔اورنگ آباد۔چار برس تک۔ کنٹریکٹ کی بنیادوں پر کام کیا۔
(یہ ایک ایجوکیشنل چینل ہے۔اس کے لیے بھی اسی مناسبت سے پروگرام تیار کیے۔)
ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی میں پانچ سال تک' بورڈ آف اسٹڈیز کا ممبر، اور اپنے پریڈ میں نصاب کو جدید ادب اور مابعد جدید ادب سے آراستہ کرنے میں بھرپور معاونت کی۔)

درسی نصاب میں شمولیت

۱۔ ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی کے گذشتہ ایم۔اے۔اردو کے نصاب میں افسانہ 'گڑھی میں اُترتی شام'
۲۔ مہاراشٹر سیکنڈری بورڈ کے گیارہویں جماعت کی گذشتہ اردو کی کتاب میں افسانہ 'بارش'
۳۔ بمبے یونیورسٹی کے بی۔اے کے سال دوم کے نصاب میں ڈرامہ 'حضور کا اقبال بلند رہے'
۴۔ مہاراشٹر پرائمری بورڈ کی جماعت دوم اردو کی نصابی کتاب میں کہانی 'آم کا درخت'
۵۔ مہاراشٹر سکنڈری بورڈ کی جماعت نہم میں افسانہ'' ۱۹، مارچ ۲۳۵۰ء ''

صحافت

روزنامہ 'آج' اور روزنامہ اورنگ آباد ٹائمز میں تقریباً پانچ برس تک مزاحیہ کالم لکھا۔
مدیر۔سہ ماہی کتابی سلسلہ۔ دل رس۔
کتابی سلسلہ ''عالمگیر ادب'' کی مجلس مشاورت کا فعال رکن۔

سیمیناروں میں شرکت

۱۔دہلی۔۲۔علی گڑھ۔۳۔ممبئی۔۴۔میرٹھ۔۵۔حیدرآباد۔۶۔بھیونڈی۔۷۔پونا۔ ۸۔شولاپور۔۹۔جلگاؤں۔۱۰۔پربھنی۔۱۱۔جالنہ۔۱۲۔ناندیڑ وغیرہ میں متعدد مرتبہ

رسائل و جرائد

ہندو پاک کے تمام اہم ادبی رسائل کے علاوہ مختلف ممالک سے نکلنے والے رسائل میں بھی افسانے اور مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

مجھ پر ایم فل اور پی ایچ ڈی

۱۔ سینٹرل یونیورسٹی حیدرآباد میں شیخ مہتاب نامی طالبہ نے میرے پہلے ناول 'آہنکار' پر ایم فل کی ڈگری حاصل کی۔
۲۔ ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد کی طالبہ حنا کوثر نے میرے افسانوں پر ایم۔فل کی ڈگری حاصل کی۔
۳۔ سینٹرل یونیورسٹی حیدرآباد میں طالبہ عائشہ بی بی نے میرے ناول 'ایوانوں کے خوابیدہ چراغ' پر ایم فل کیا۔
۴۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں طالبہ شمع پروین تاریخی ناولوں پر پی ایچ ڈی کر رہی ہے جس میں میری دونوں ناولیں ا۔ایوانوں کے خوابیدہ چراغ اور ۲۔چاند ہم سے باتیں کرتا ہے۔شامل ہیں۔
۵۔ گلبرگہ یونیورسٹی میں شمیم ریحانہ بیگم میری ادبی خدمات پر پی۔ایچ ڈی کیا۔
۶۔ چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی۔میرٹھ میں سہارن پور کی ایک طالبہ نصرت انصاری میرے ناولوں میں کردار نگاری پر ایم۔فل کی ڈگری حاصل کی ہے
۷۔ تروپتی یونیورسٹی مدراس میں ایک طالبہ سی۔فوزیہ ''نورالحسنین فن اور شخصیت پر پی۔ایچ ڈی کر رہی ہے۔
۸۔ سوامی رام تیرتھ یونیورسٹی ناندیڑ میں محمد واجد نامی طالب علم نے میرے افسانوں کے تقابلی مطالعے پر پی۔ایچ ڈی کی سند حاصل کی ہے۔
۹۔ سوامی رام تیرتھ یونیورسٹی ناندیڑ میں طالب علم حسیب الحسن نے میری افسانہ نگاری پر ایم فل کیا ہے۔
۱۰۔ دلّی یونیورسٹی دہلی سے ایک طالب علم ذبیح اللہ میری فکشن نگاری پر ایم۔فل کر رہا ہے۔

اے خدا

نکال کر خلد سے ہمیں اِس زمین پر تُو نے دی رہائش
گلوں کی خوشبو پھلوں کی لذت چہار سو رحمتوں کی بارش
یہ تندرستی یہ حسن و خوبی تری عنایت تری نوازش
یہ طاقِ نسیاں ہوئیں تمام اب جو آپڑی ہے اک آزمائش

حافظ محمد احمد (راولپنڈی)

خوابیدہ فسانے

عطیہ سکندر علی
(سکھر)

تمھیں معلوم ہے میں تمھیں کتنا عزیز رکھتا ہوں۔اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ تم اورنگ آباد کے اُن چند ذہین ترین نئے لکھنے والوں میں سے ہو، جن کے روشن مستقبل کے تصور سے میری نجی تسکین کا سامان ہوتا ہے۔ابھی کل ہی کہیں تمہارے اس افسانوی مجموعے پر مہاراشٹر اسٹیٹ اُردو اکادمی کے انعام کا اعلان پڑھ کر مجھے ازبس مسرت ہوئی۔اس تعلق سے تمھیں مبارکبادی کا خط لکھنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ تمہاری یہ چٹھی آ گئی، ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ تمہاری حوصلہ افزائی کے اسباب کی ذمہ داری میں مجھ سے کوتاہی واقع ہو؟

تمہارے اس افسانوی مجموعے کے افسانے اور تمہاری تمام تر تخلیقی شرکتیں تمہاری جن بے چینیوں کا آئینہ کرتی ہے اور تم جس ریاض وانہاک سے اپنے کام میں جُٹے ہوئے ہو، میں چاہتا ہوں کہ اس کے نتیجے کے طور پر تمہارے یہاں فنّی اور جمالیاتی سطح پر اور زیادہ۔۔۔بہت زیادہ استحکام کا سبب ہو۔ایسی باتیں صرف ایسے ہی نوجوان لکھنے والوں سے کی جاسکتی ہیں جن کا فن اُن کی بے تابی، باضمیر عبادت اور آمادگی کی گواہی دیتا ہے۔

حال ہی میں ''ادبِ لطیف'' (پاکستان) کے سالنامے میں میں نے تمہاری کہانی 'بازیگر' پڑھی ہے جو اپنے باطن میں بہت جڑی ہوئی اور وضاحتوں کے بجائے اپنے واقعاتی اصرار کے باعث فوری طور پر اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور مجھے واقعی اچھی لگی۔

جوگندر پال (دہلی)

آپ کی عنائتوں کا شکریہ، پہلے ''فقط بیان تک'' پھر 377 صفحات پر مشتمل ناول '' ایوانوں کے خوابیدہ چراغ '' اس سے قبل ''کئی چاند تھے سرآسماں'' جو ہماری تاریخ کے ایک خاص عہد کا ثقافتی مرقع تھا۔آپ کا یہ ناول آپ کے Sence of Histro کا غماز ہے۔ہندو مسلم ایکتا 1857ء کی بغاوت میں عام آدمی کی شرکت، کارل مارکس نے بھی یہ کہا تھا کہ اب تک تاریخ نویس بادشاہوں، شہزادوں کے گرد گھومتی رہی ہے۔اُن کے گرد نہیں جو تاریخ بناتے ہیں۔ عام آدمی دراصل تاریخ کے معمار ہیں۔کوئی ایک فرد نہیں۔

آپ نے عوامی نقطہ نگاہ سے ان خوابیدہ ایوانوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔اپنے موضوع اور Story line کو برقرار رکھتے ہوئے فضاء بندی (Settings) اور کردار سازی کی ہے۔ یہ ناول ہماری اُنیسویں صدی کی زوال آمادہ سوسائٹی کا ترجمان ہے۔

ایک زمانے میں تاریخی ناول میں پڑھا کرتا تھا، یا یوں کہیے کہ تاریخی ناول کہہ کر ہی یہ ناول فروخت ہوتے تھے، مگر اُن میں Fiction کے عناصر زیادہ ہوتے تھے بہ نسبت Facts کے۔آپ کے یہاں حقائق اور Happyings پر زور ہے۔جو دورِ حاضر کے ناولوں کا خاصہ ہے۔

انیس رفیع (کلکتہ)

آپ کی دونوں کتابیں ملیں۔''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' اور ''فقط بیان تک''

آپ نے اتنی اچھی کتابیں ہمیں بھیجی۔بہت خوشی ہوئی۔آپ کے افسانے تو پڑھتے رہتے ہیں۔ناول نہیں پڑھے تھے۔

یہ ناول بھی میں نے ابھی پورا نہیں پڑھا ہے، لیکن آپ نے جن مسائل پر یہ ناول لکھا ہے، وہ بہت اہم ہے۔اُردو میں اچھے ناول اب بہت کم لکھے جارہے ہیں۔آپ کے ہاں کہانی سنانے کا جو انداز ہے۔وہ افسانے کے موضوع کی اہمیت بھی بڑھا دیتا ہے۔

آج ہمارے چاروں طرف جو خوف، نا اُمیدی اور سیاست کی دہشت پھیلی ہوئی ہے۔آج کے ادیب اس ماحول کی صرف عکاسی ہی نہیں کر پا رہے ہیں بلکہ اسے بدلنے کے راستے بھی ڈھونڈ رہے ہیں۔اب آپ ہی لوگ اُردو افسانے کے فن کو آگے بڑھانے کے ذمہ دار ہیں۔آپ نے کتاب کا نام لکھا ہے ''فق 'بیان تک'' اس بیان کو جاری رکھیے۔

جیلانی بانو (حیدرآباد)

آپ کا ناول'' ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' اور افسانوں کا مجموعہ'' فقط بیان تک'' ایک ہی پیکٹ میں ملے۔اس ادبی تحفہ کے لیے آپ نے مجھے بھی یاد رکھا اس کے لیے بے حد شکریہ۔

آکاش وانی کے مشاعرے میں شرکت کے موقع پر جن تین چار صدق وصفا سے ملنے کی خواہش تھی، اُس میں آپ کا نام بھی تھا۔۔حصے میں کچھ پل کی ٹیلی فون والی گفتگو آئی، ''نیا افسانہ۔نئے نام'' جب آپ نے مجھے بھیجی تو میں نے اُس کی باقاعدہ ایک گوشہ عافیت میں بیٹھ کر ورق گردانی کی تھی۔تب مجھے یہ اچھا لگا تھا کہ دو تین نقادوں کی درباردایوں کے شور وغوغا میں نئے لکھنے والوں میں آپ جیسے ادیب بھی ہیں جو اپنے معاصر ادب کے سنجیدہ مطالعے کو اپنے پر فرض گردانتے ہیں۔اورنگ آباد بلانے والوں نے کچھ زیادہ ہی شعبہ جاتی دباؤ ڈالا تو طبعیت آمادہ ہوگئی، خیال تھا کہ آپ سے آپ کے ادبی منصوبوں پر تفصیلی گفتگو ہوگی۔وقت تھا مگر کوئی معتبر رہنما ہاتھ نہ آیا۔

مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے آزادی کی قومی تحریک کو موضوع بنا کر ''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' جیسا ناول اُردو دنیا کو دیا۔حیات اللہ انصاری کا تین جلدوں والا ناول ''لہو کے پھول'' اس موضوع پر نہ سنگِ میل بن سکا اور نا ہی

''چہارسُو''

اُس کا کچھ چرچا ہی ہوا۔

آپ نے معین الدین جینا بڑے کے جس شکوے کا ذکر کیا ہے جو آپ کے لیے ناول لکھنے کی تحریک کا سبب بھی بنا، وہ مضمون ''ذہنِ جدید'' ہی میں شائع ہوا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ہی کی طرح دس پندرہ ذہن اور ادب پرست ایسے اور بھی ہوتے جو اپنے معاصر ادب کے منظرنامے پر تفصیل سے کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے کہ اب زیادہ تر نقاد تعلقاتِ عامہ اور خوشنودی کے لیے لکھ رہے ہیں۔

آپ یہ مجھ پر چھوڑ دیجیے کہ آپ کے ناول، افسانوں پر'' ذہن جدید'' میں کون لکھتا ہے۔

زبیر رضوی (دہلی)

میں نے آپ کے افسانے پچھلے تین روز میں بغور پڑھے ہیں اور انتہائی دلچسپی سے پڑھے ہیں۔ آپ کے افسانوں کی جسمانی ساخت دلآویز اور جاذب نظر ہے۔ سب کے سب دلچسپ اور لائقِ مطالعہ ہیں۔ یہ وصف بہت کم جدید افسانہ نگاروں کے یہاں ملتا ہے۔ آپ کے موضوعات عصری زندگی کے مسائل سے بھی متعلق ہیں اور حیاتِ انسانی کے بنیادی رویوں کے ساتھ بھی'' رنگوں کے اسیر'' کا ''میں'' ایک فرد واحد نہیں بلکہ معنوی دائرے عمل میں سی فس کے سے کرب کی تصویر ہے'' اللہ پانی دے'' کا مرکزی کردار غیر محفوظیت کے تسلسل میں جکڑا ہوا ہے۔ اگر وہ فیصلے کے انداز میں عمل کا انتخاب کر سکتا تو شاید اس تسلسل سے آزاد ہو جاتا۔'' گود بھری رہے'' انسانی صورتِ حال کے جذباتی تضادات کی تصویر ہے۔'' پچھلی رُت کا آخری مسافر'' ناگزیر نقطہ انہدام میں تحلیل ہوتی ہوئی روشنی کا سفر ہے۔ ازدواجی جھگڑے، نسوانی آزادی، شناخت، مزاج، رفتار، کی انتہا، نصب العین کی تلاش، سراب کی حقیقت، ایک نسل کا دوسری نسل کے ساتھ رشتہ، یہ سب مسائل آپ کے افسانوں میں سامنے آتے ہیں۔ آپ کی فنی کامیابی کا ثبوت یہ ہے کہ آپ ان کو بیان کی سطح سے اُٹھا کر ارفع تخلیقی سطح سے روشناس کروایا ہے، رنگوں کے اسیر، اللہ پانی دے، اور 'جانشین' خاص طور پر پسند آئے، حق تو یہ ہے کہ آپ کے سبھی افسانے لائقِ تحسین ہیں۔ مبارکباد قبول کیجیے۔

بلراج کومل (دہلی)

''آہنگار'' کی مرسلہ جلد پرسوں ہی مل گئی تھی۔ اُسی روز شب میں اس کا مطالعہ کرنے بیٹھا تو مسلسل پڑھتا ہی چلا گیا، اس کا سبب آپ کی برجستہ تحریر کا سحر آگیں تواتر بھی ہے، اور آپ کی تخلیقی لیکن اندرونی شخصیت کی اس میں تہہ داری بھی مضمر ہے شانتی کی منہ بولتی تصویر مینا اور کونڈی بابا کا کردار جیسے آپ کے ضمیر کی آواز ہو اور سمپت راؤ آپ ہی کا ہمزاد۔ جو کچھ بھی ہو لیکن ناول کا ہر باب بڑا ہی جاندار ہے اور کچھ ایسا ہی تاثر دیتا ہوا کہ آپ سے میں بہ اصرار یہی کہوں گا کہ آگے آپ اب سے ناول نگاری ہی کو اپنا مستقبل نوشت وخواند کا شغل بنا لیجیے۔ آج اس کی ضرورت بھی ہے کہ اپنے گردوپیش سے محسوس مواد چن کر خواہ وہ تہذیبی ہو یا سماجی، شہری ہو یا دیہی، بلکہ اور آگے بڑھ کر وہ مادی ہو یا روحانی ہی کیوں نہ ہو۔ ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہر طرح کے بحران اور تجربات وحادثات کے تمام تر پہلوؤں کو جس طرح آپ نے سمجھایا ہے اس کا چلن اب عام ہو جانا چاہیے تاکہ انسان بہتر زندگی بسر کرنے کا عرفان وادراک حاصل کر سکے۔ بشر نواز صاحب کا پیش لفظ بھرپور ہے، اور آپ کے عندیہ اور طرزِ نگارش کا تخصیصی مکاشفہ، پھر بھی زیرِ نظر ناول سے متعلق میں یہ ضرور عرض کروں گا اور بلاخوفِ تردید کہ'' آہنگار'' 2005ء کا ایک نمائندہ ناول قرار دیئے جانے کے لائق ہے۔

عتیق احمد عتیق (مالیگاؤں)

''مورِ رقص اور تماشائی'' اور'' رنگوں کے اسیر'' آپ کی تخلیقیت افروز اور شناخت انگیز افسانوی کاوشیں ہیں۔ یہ کہانیاں سانس کے مانند فطری اور برجستہ انداز میں وقوع پذیر ہوئی ہیں، اور بے اختیار قاری کی روح کا زندہ اور دھڑکتا ہوا حصّہ بن جاتی ہیں۔ آپ جس ذہنی سلامت روی اور اقداری وجمالیاتی بصیرت کے ساتھ زندگی کی تلاش ومدام تلاش میں کوشاں ہیں اور اُس کی تہہ داری کے لیے مکمل قبولیت کے جذبے اور شعور کی پرورش کر رہے ہیں۔ اس نے آپ کی اکثر وبیشتر کہانیوں میں خوردبینی مشاہدہ، اکسیراتی تجزیہ، دل گداز ارادہ، اور شعور سوز تجزیے کی ایسی حسین اور رفیع افسانوی رنگولی سجائی ہے جو گردش کے ہلکے، دھندلے، دھیمے، اُداس، اور بھورے رنگوں سے لے کر انسانی جذبوں کے شوخ و شنگ رنگوں سے مملو ہیں۔'' رنگوں کے اسیر'' اور'' مورِ رقص اور تماشائی'' قدرِ اول کی کاوشیں ہیں جو جمالیاتی انبساط اور اقداری بصیرت کے ساتھ روشن صداقت کی نشاندہی کرتی ہیں کہ ان کا حساس اور دردمند اور مفکر خالق نہ صرف تخلیقیت پر ور میلان سے آگاہ ہے بلکہ زندہ افسانوی روایت پر اس کی گہری نظر ہے۔ پھر تخلیقت کیش افسانہ فطری حسن اور اقداری رفعت پیدا کرنے کیلیے جس جمالیاتی اور اقداری اسرار وحقائق کی آگہی ناگزیر ہے وہ اس سے بشمول ہے اور برابر خوب سے خوب تر کے جمالیاتی سفر پر مائل ہے۔

نظام صدیقی (الہ آباد)

آپ کی کتاب ''مورِ رقص اور تماشائی'' مل گئی، میں نے آپ کے افسانے بڑی دلچسپی سے پڑھے۔ سب افسانے بہت اچھے ہیں۔ مجھ کو'' اللہ پانی دے، اور جانشین،'' خاص طور پر پسند۔ آپ کو کہانی بیان کرنے کا سلیقہ ہے جو افسوس ہے کہ اب ہمارے افسانوں میں کمیاب ہے۔

نیر مسعود (لکھنو)

میں نے آپ کی کہانیاں دوبار پڑھی ہیں۔ آپ کے یہاں عصری آگہی کے ساتھ ساتھ فنی سوجھ بوجھ، اور کہانی پن موجود ہے، اور یہ آج کے دور میں بڑی بات ہے۔ کچھ نوجوان نئی بات کرنے کے شوق میں اور فیشن میں راہ سے بھٹک گئے ہیں۔ آپ کے پاس سنبھل کر چلنے کا انداز ہے جو بڑی بات ہے۔

شرون کمار (امرتسر)

☆

براہِ راست

اردو ادب میں سوچ، فکر، عمل پر جا بہ جا اور رنگ برنگی قدغنوں کے باوجود بہت کچھ نیا، منفرد، انوکھا اور اعتبار کا حامل کام عمل میں آیا ہے۔ تفصیل میں جانے کا محل نہیں آج کی نشست کے مہمانِ خاص جناب نور الحسنین صاحب کی خدمات، جستجو اور نتائج کو سامنے رکھا جائے تو مارے خوشی کے دل جھوم جاتا ہے اور بے ساختہ زبان سے یہ مصرع ادا ہوتا ہے:

''ایسی چنگاری بھی یارب، اپنی خاکستر میں تھی!''

آج کی محفل میں آپ کی شرکت، توجہ اور آپ کا انہماک ہماری رائے کو اعتماد بھی بخش سکتا ہے اور جناب نور الحسنین صاحب کے حوصلوں کو جِلا دینے کے کام بھی آ سکتا ہے گر یہ معجزہ ہوا تو چہارسو کا ایسا اعزاز ہوگا، جس پر یہ عاجز اور ادارہ چہارسو جس قدر بھی فخر کریں کم ہے۔

.....گلزار جاوید

☆ نورالحسنین صاحب۔۔۔ساتویں جماعت کا طالب علم جس جذبے اور مہمیز پر کہانی لکھتا اور اُس کا انجام کیا ہوتا؟

☆☆ گلزار جاوید صاحب۔۔۔آپ کا پہلا ہی سوال میرے ادبی رجحان سے متعلق ہے۔ میرا گھرانہ بہت حد تک صوفیانہ اور ادبی گھرانہ تھا۔ میرے دادا کے بڑے بھائی نورالضیاء جو نظام حیدرآباد کے دربار میں مفتی دین مبین تھے اور ضیاء یار جنگ کے لقب سے موسوم تھے۔ مشہور شاعر سکندر علی وجد میرے ننھیالی رشتہ دار تھے۔ جماعت علی شاعر میرے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ ہمارے پڑوسی مشہور شاعر بشر نواز تھے۔ میرے بچپن میں شہر میں بھی ادبی فضاء تھی۔ پھر حمایت بھائی ریڈیو میں کام کرتے تھے اُن کا کلام نشر ہوتا تھا۔ اس سارے ماحول نے میرے اندر بھی ایک خواہش کو پیدا کیا کہ میں بھی کچھ لکھوں۔ چنانچہ میں نے شاعری کرنے کی کوشش کی لیکن وہ میرے بس میں نہیں آئی تو میں نے نثر کا رخ کیا اور بچوں کے لیے ایک کہانی ''انسانیت'' جو روزنامہ ہندوستان کے بچوں کے صفحہ کھلتی کلیاں میں شائع ہوئی۔ اس کہانی کی اشاعت سے جہاں مجھے بے حد خوشی ہوئی وہیں میں بہت زیادہ خوف زدہ بھی ہو گیا کیونکہ میرے خاندان میں نصابی تعلیم سے ہٹ کر بچوں کو اس طرح لکھنے پڑھنے کی سخت ممانعت تھی۔ (اس کا اظہار حمایت بھائی بھی اپنی سوانح میں کر چکے تھے۔) بہرحال میں چوری چوری لکھتا رہا۔ اُس وقت انجام کی کیا فکر ہو سکتی تھی۔ دوست احباب تعریفیں کرتے اور اساتذہ ہمت افزائی کرتے تھے۔

☆ خاندانی پس منظر میں جاگیرداری کا ذکر آپ کے آباء و اجداد کی نسبت ہمارے اشتیاق کو سوا کر رہا ہے؟

☆☆ میرے اجداد میں سے سید شاہ ظہیرالدین جو غُجند میں رہتے تھے وہ وہاں سے ہجرت کر کے ایران، افغانستان سے درِ خیبر کے راستے لاہور تشریف لائے تھے اور وہاں کے ایک مقام ایمن آباد میں سکونت پذیر ہوئے اور وہاں پر خانقاہی نظام کی بنیاد ڈالی۔ اُن کے پوتے حضرت سید شاہ عنایت للّٰہی نے ہجرت کی اور امرتسر، پانی پت، دہلی ہوتے ہوئے برہان پور پہنچے اور وہاں سے مہاراشٹر کے علاقے بالا پور میں نقشبندیہ خانقاہ کی نیو رکھی، ایک دینی مدرسہ بھی قائم کیا۔ 1645ء میں ایک لائبریری کی سنگ بنیاد رکھی جو آج تک موجود ہے۔ آپ کے پوتے حضرت سید شاہ قمرالدین نقشبندی اورنگ آباد (دکن) میں پہنچے۔ آصف جاہی دورِ حکومت میں یہ واحد دینی درسگاہ تھی جہاں طلباء کے لیے اقامت خانے کا بھی بندوبست تھا۔ آپ درس قرآن حدیث کے علاوہ اُس دور کے مروجہ روزگار کی بھی تربیت فرماتے تھے۔ جاگیریں تب ہی سے ملنا شروع ہوئی تھیں جو میرے دادا سید نوعالمقتدی تک باقی تھیں۔ میری ننھیال پیپری چمنا راجہ کے زمیندار و جاگیردار تھے۔ لیکن سقوط حیدرآباد کے بعد جاگیرداری نظام ختم ہو گیا۔ بدن سے جبہ و دستار بھی اُتر گیا اور پیٹ بھرنے کے لیے ملازمتیں مقرر ٹھہریں۔ میرے والد عدالت میں ملازم تھے۔ جب میں چوتھی جماعت میں آیا تو میرے والد مرض فالج کے شکار ہوئے اور پھر ہم نے غربت کے دن بھی دیکھے۔

☆ حسنین صاحب جس قدر تفصیل اور شدت کے ساتھ آپ کے ہاں دیہی زندگی اور روزمرہ، رہن سہن، بود باش کا بیان قاری کی نظر سے گزرتا ہے اُسے پڑھنے کے بعد آپ کے ایام طفلی کی بابت اشتیاق فزوں تر ہو جاتا ہے؟

☆☆ بھائی میرے والد کا تبادلہ اورنگ آباد کے ایک تعلقہ کنڑ میں ہو گیا تھا اور میری ننھیال پیپری چمنا راجہ نامی دیہات تھی۔ میں نے ان مقامات پر آباد لوگوں کی زندگی بود باش بہت قریب سے دیکھی تھی۔ اُن کی بولی ٹھولی کو صرف سنا نہیں تھا بلکہ برتا بھی تھا۔ وہاں کے کھیت کھلیانوں میں بچپن گزرا تھا۔ امرائیوں میں ایک درخت سے دوسرے درخت پر چھلانگیں مارنا، ندی میں غوطے لگانا، کنویں سے موٹ کے ذریعے فصلوں کو پانی دینا، ہفتہ واری بازار میں گھومنا، لوہاروں کی بھٹی کے سامنے گھنٹوں کھڑے رہ کر کلہاڑی اور کھیتی باڑی کے بنتے اوزاروں کو دیکھنا، تربوز اور خربوز کی باڑیوں میں مٹرگشت کرنا وغیرہ وغیرہ۔ میرا پہلا ناول ''اُہنکار'' کا سارا منظرنامہ ان ہی دو بستیوں کے گرد گھومتا ہے۔ ناول کی کہانی انسانی رشتوں اور مادیت کے تصادم پر محیط ہے اسے بے حد پسند کیا گیا۔ میرے کچھ افسانے بھی دیہی موضوعات پر اسی لیے ہیں، بلکہ میرا وہ افسانہ جو میری شناخت کا سبب بنا''

''چہارسُو''

گڑھی میں اُترتی شام'' وہ سقوط حیدرآباد کے بعد دیہات کے ایک بڑے زمین دار کی کہانی ہے۔ جو کبھی شیروں کا شکاری تھا، بندوق کے چھن جانے کے بعد کس طرح تیتر اور بٹیروں کے شکار اور اُن کی بازیوں میں پناہیں ڈھونڈھتا ہے اُس کا بیان ہے۔ دیکھا جائے تو میں نے شہری اور دیہی مختلف موضوعات پر افسانے لکھے ہیں۔ افسانہ ''کلمہ گو'' کا پس منظر حیدرآباد دکن ہے۔ افسانہ ''پیپل کی چھتیاں'' شہر پونا سے تعلق رکھتا ہے۔ افسانہ ''یہ تیرے پُراصرار بندے'' کا سینریو شہر ممبئی ہے۔ یہ عشق نہیں آساں'' کا شہر اورنگ آباد ہے۔ افسانہ ''بھور بھئی جاگو'' ریاست کیرالہ کا ایک مقام اندلور ہے۔ افسانہ ''سبزۂ نورستہ کا نوحہ'' حیدرآباد، اورنگ آباد کا مہاجر شہر کراچی پہنچتا ہے اور واپسی پر اپنی باقیات کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ افسانہ '' آخری اسٹوری'' عراق کے زوال کے پس منظر میں ہے تو افسانہ '' بسلامت روی و باز آئی'' افغانستان کے اطراف گردش کرتی ہے۔ میں صرف دیہات یا دیہی زندگی کے اطراف ہی نہیں گھومتا رہا۔

☆ عملی زندگی کا آغاز، صحافت، ریڈیو، ڈرامے اور فیچرز لکھنے کے علاوہ آواز کا جادو بھی جگایا، ازاں بعد افسانہ، ناول، تحقیق، تنقید کے میدان میں طبع آزمائی کا عمل، آپ کی طبیعت کی سیمابیت کو اُجاگر کر رہے ہیں؟

☆☆ گلزار جاوید صاحب آپ کے اس ایک سوال میں کئی سوالات ہیں۔ میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا تب ہی سے اسکول میں ہونے والی گیدرنگ کے ڈراموں میں حصہ لینے لگا تھا۔ یوں میری زندگی میں ڈرامہ اور اداکاری پہلے آئی۔ یہاں تک کہ اسکول کے علاوہ شہر میں شوقیہ ڈرامے اسٹیج کرنے والوں کے ڈراموں میں بھی کام کرنے لگا تھا، پھر کالج میں ہونے والے ڈراموں میں بھی لیڈ رول میں ہی کرتا تھا۔ اسی طرح ساتویں جماعت سے میں نے قلم بھی تھام لیا تھا۔ میٹرک کے بعد میں صحافت سے جڑا اور مقامی اخبارات ''روزنامہ آج'' اور ''اورنگ آباد ٹائمز'' میں مزاحیہ کالم لکھنے لگا تھا۔ اس کے بعد میں ایک اسکول میں درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہو گیا۔ وہاں بھی میں نے اسکول گیدرنگ میں خوب ڈرامے کھیلے بھی اور کھلائے بھی، بعد میں میں ریڈیو کی ملازمت میں آ گیا، پہلے بھی ڈرامے لکھتا تھا یہاں مجھے ڈرامہ نگاری اور فیچر نگاری کے خوب مواقع ملے، حالانکہ بحیثیت ایک افسانہ نگار ادب میں میری شناخت بن چکی تھی لیکن ریڈیو پر میں نے اپنے افسانے پیش کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے اپنے ڈراموں اور فیچرز کی کتاب ''انسان امر ہے'' کہ پیش لفظ میں لکھا تھا، '' ڈرامہ میری پہلی شناخت ہے لیکن بحیثیت ڈرامہ نگار نہیں بلکہ ڈرامہ آرٹسٹ، اسی آرٹسٹ نے مجھ سے کئی کام کروائے۔ بچپن میں شرارتیں، تو بامعنی گفتگو کی چاہ میں مطالعے کا شوق پیدا کیا، جوانی میں قدم رکھا تو تو وہ سارے اسرار مجھ پر کھول دیئے جس کا سحر مقابل کو باندھے رکھتا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ مجھے افسانہ نگار بنانے میں بھی اسی آرٹسٹ کا ہاتھ ہے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنے افسانوں کہ ہر کردار میں خود جیتا ہوں، جو جھتا ہوں، اُلجھتا ہوں، کبھی سمٹ جاتا ہوں اور کبھی بکھر جاتا ہوں۔'' اسی دوران شادی بھی کی اور باپ بھی بن گیا۔

☆ جی۔۔۔ ہماری ناقص معلومات کے مطابق کڑے کوس کاٹ کر کہانی ہاتھ لگتی ہے جبکہ آپ کے ہاں کہانی کو آپ کا انتظار ہونا بجائے خود اپنے اندر کئی کہانیاں رکھتا ہے؟

☆☆ گلزار جاوید صاحب۔۔۔ میں سعادت حسن منٹو نہیں ہوں جن کے جیب میں کہانیاں ہوتی تھیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ مجھے کہانیاں سوجھتی ہیں۔ اور غالباً اُس کی وجہ یہ ہے کہ میرا تھوڑا بہت مطالعہ، مشاہدہ، تاریخ سے دلچسپی، میرے بچپن کی زندگی کو کھیت اور کھلیان کا میسر آنا، میرا ناسٹلجک ہونا، حالاتِ حاضرہ اور درپیش مسائل کا سامنے آنا، کچھ آس پاس رہتے بستے انسان، میرے عزیز و اقارب۔ مجھے کہانی کا سراغ مل جاتا ہے۔ جب کہانی سوجھتی ہے تو میں فوراً لکھنے کو نہیں بیٹھ جاتا بلکہ اُس کے متعلق سوچتا رہتا ہوں کہ اسے کس علاقے اور شہر دیہات کے پس منظر میں لکھنا چاہیے، اس کے کرداروں کا مذہب کیا ہوگا، بس کہانی کا کلائمکس نہیں سوچتا کیونکہ کہانی خود اپنا سفر طے کرتے ہوئے انجام تک پہنچا دیتی ہے۔

☆ کہانی کے گود میں پلنے اور بانہوں کے پالنے میں جھولنے یا گھٹنوں چلنے کا عمل عموماً کتنے عرصے پر محیط ہوتا ہے اور کہانی قسط وار لکھی جاتی ہے یا ایک ہی نشست میں؟

☆☆ کہانی جب پوری طرح دماغ میں پک جاتی ہے۔ یہ پکنے کا عمل کبھی دو چار دنوں میں طے ہو جاتا ہے کبھی ہفتوں بھی لگ سکتے ہیں۔ اس عمل میں دن ہفتوں اور مہینوں کی قید نہیں کیونکہ جب تک کہانی کا پہلا جملہ نہیں اُترتا میں لکھنا شروع نہیں کرتا اور جب اُتر جاتا ہے تو پھر میں ایک ہی نشست میں لکھ لیتا ہوں۔ کبھی کوئی ایسا لمحہ بھی آ جاتا ہے جب کہانی ایک دم سامنے آ جاتی ہے اور گھنٹے دو گھنٹے میں مکمل بھی ہو جاتی ہے۔

☆ وہ کون سی پیش بندیاں ہیں جو اپنی کہانیوں کے ذریعے علامت اور استعاروں میں پیش کرنے کے خواہش مند رہا کرتے ہیں؟

☆☆ میرا خیال ہے کہانی لکھنے سے پہلے اُس کے اسلوب علامتوں اور استعاروں کے بارے میں کوئی بھی ادیب نہیں سوچتا۔ کہانی کا موضوع خود یہ ساری باتیں اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ یوں جس طرح کوئی بچہ اپنا چہرہ مہرہ قد قامت رنگ روپ لے کر پیدا ہوتا ہے اسی طرح کہانی بھی اپنے بطن ہی میں سب کچھ لیے اُترتی ہے۔

☆ آپ جیسے نستعلیق تخلیق کار کے لیے شدت پسندی کا لیبل بجائے خود ناسمجھی کی دلیل ہے مگر سوال و جواز دریافت کرنا ہمارا فرض ہے؟

☆☆ ادیب بھی ایک انسان ہی ہوتا ہے۔ بحیثیت ادیب میں نہایت وسیع القلب ہوں لیکن بحیثیت ایک انسان مجھ میں بھی وہ ساری صفات ہیں۔ جب ظلم بربریت ناانصافیاں سامنے آتی ہیں تو احتجاج کی لئے بھی تیز ہو جاتی ہے۔ بحیثیت ایک انسان اور مسلمان ہونے کے ناطے اپنی قوم پر ہونے والے ظلم اور ناانصافیوں اور اقتدار کی جانب سے سامنے آنے والے غلط فیصلوں پر شدید ہونا بھی پڑتا ہے۔ مجھے اپنے قوم کا فرقوں میں تقسیم ہو کر کمزور ہونا پسند نہیں ہے۔ اسی لیے میں نے

افسانہ ''بھور بھائی جاگو'' لکھا، ملک کی گنگا جمنی تہذیب کو جب میں نے گنگا اور جمنا میں ڈوبتا ہوا دیکھا تو اُس کا احساس دلانے کے لیے میں نے افسانہ ''پیپل کی چھیاں'' لکھا، اسی طرح افسانہ ''بستی راج'' ہے جو آج کل جنگل راج سے بھی بھیانک ہوگیا ہے۔ میرا ناول ''تلک الایام'' میں ان مسائل کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ حقائق ہیں اس سے دامن بھی تو نہیں بچایا جاسکتا۔

☆ ایک زمانے میں آپ کی کہانیوں میں طبقاتی ذکر کا بڑا چرچہ ہوا کرتا تھا۔ آج کے دور میں طبقات کی تقسیم اور تفریق بلکہ مفہوم بدلنے کے بعد اس سوال کا کوئی جواز یا جواب بیان کرنے کی پوزیشن میں ہیں آپ؟

☆☆ دیکھیے جناب ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے جہاں مختلف مذاہب، مختلف کلچر، مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ مذہبی تہذیبی سوچ سے پرے یہاں تین طبقوں میں لوگ بٹے ہوئے ہیں۔ دولت مند طبقہ، درمیانی طبقہ اور سطح غربت سے نیچے کا طبقہ۔ ہر طبقے کے اپنے مسائل ہیں۔ مذہبی تہذیبی ٹکراؤ کا ہونا بھی عین ممکن ہے۔ معاش، روزگار کا حصول بھی درمیان میں ہے، بلکہ میں سمجھتا ہوں تیسری دنیا کے ممالک میں اس طبقاتی فکر سے نجات ممکن نہیں ہے اور ادب ہر صورت سماج سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔

☆ سچے کہانی کار کی پہچان اور شناخت کے علاوہ ضرورت کیوں آن پڑی جبکہ اکثر ناقدین ادب اس ساری جستجو اور کاوش کو کمزور اذہان کو بھٹکانے کی سعی لاحاصل سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے؟

☆☆ کوئی بھی ادیب خصوصاً آج کے دور کا، ناقدین کے نافذ کردہ دائروں کے درمیان رہ کر ادب تخلیق نہیں کرتا وہ جو کچھ دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے لکھتا ہے۔ ترقی پسند تحریک اور جدید رجحان میں ناقدین کی من مانی کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ترقی پسند ناقدین پھر بھی نرم گوشہ رکھتے تھے لیکن جدید ناقدین نے تو ادب کو اجتماعیت سے فرد تک محدود کر دیا تھا۔ اسی لیے ہندوستان میں بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں اُبھرنے والی نسل نے اپنا ادبی سفر کسی ناقد کی سرپرستی میں نہیں آزادانہ طور پر کیا ہے۔

☆ آپ کے ہاں اکثر فلیش بیک، فلم اور ریڈیو کی تکنیک کا استعمال کہانی کو اپنے مقصد سے ہٹا دیتا ہے۔ مثال کے طور پر چوتھے افسانوں کا مجموعہ ''فقط بیان تک'' کی آخری کہانی ''زہر'' کا حوالہ کافی ہے۔

☆☆ اس لحاظ سے تو میری ساری ہی کہانیاں اپنے مقصد سے بھٹکی ہوئی ہیں۔ پھر ان پر بات کرنا ہی فضول ہے۔

☆ کہانی کو فکشن بنانا بڑا فن گردانا گیا ہے آپ کے ہاں اس عمل کو کس طرح برتا اور سنوارا نکھارا جاتا ہے؟

☆☆ کوئی بھی کہانی اُس وقت تک افسانہ نہیں بنتی جب تک اُس میں اسلوب کا تجربہ، تکنیک کی حکمت عملی بیان کی ندرت نہ ہو۔ ہر قلم کار اپنی اپنی بساط بھر کوششوں سے برتتا ہے۔ میں چونکہ ریڈیو، ڈرامہ اور کچھ وقت ٹیلی وژن میں بھی گزار چکا ہوں تو وہاں کے تجربات اپنے افسانوں اور ناولوں میں برتنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے تو فلیش بیک تکنیک کے علاوہ شعور کی رو، خود کلامی، منظری تکنیک کا بھی استعمال کیا ہے لیکن یہ ساری تکنیک سوچ سمجھ کر نہیں بلکہ افسانے اور ناول خود اپنی ضرورت کے تحت استعمال کرواتے ہیں یہاں تک کہ لفظیات بھی۔

☆ ہر چند آپ کے ہاں جنس مخالف اور جنسی روئیوں کا برتاؤ دیکھنے میں آتا ہے مگر کچھ نازک مواقع ایسے بھی آتے ہیں جہاں ایک طرح کا خوف، جھجک یا پرہیز کا تاثر ملتا ہے؟

☆☆ کہانی کی تعمیر میں مرد عورت بوڑھے بچے حسب ضرورت شامل کیے جاتے ہیں۔ ان کے مختلف روئیوں کو برتا بھی جاتا ہے۔ جنسی جذبہ، یا جنسی ضروریات کو ہماری زندگی میں اُتنا ہی حق حاصل ہے جو کھانے میں نمک کو، اگر زیادہ ہو جائے تو کھانا بدمزہ ہو جاتا ہے اور کم ہو جائے تو اس کی کمی کا شدت کے ساتھ احساس ہوتا ہے۔ جہاں جہاں بھی اس کی ضرورت ہوتی ہے میں استعمال تو کرتا ہوں لیکن کبھی علامت کے ذریعے اور کبھی ڈھکے چھپے انداز میں۔ اسے آپ احتیاط پسندی کہیں یا جھجک۔ اُس کی وہ تفصیل میرے پاس نہیں ملتی جو میرے معاصرین کے پاس ہوتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کے بارے میں بھی یہی بات کہی گئی تھی، لیکن کیا اس سے ادھورے پن کا احساس ہوتا ہے؟

☆ یہ تاثر کس بنا پر قائم کیا گیا کہ آپ کی کہانیاں پڑھتے ہوئے قاری کے ذہن میں منٹو کی کہانیوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے؟

☆☆ سعادت حسن منٹو اُردو افسانے کے لیجنڈ ہیں۔ لیجنڈ وہی بنتا ہے جس کے فن کے اثرات اپنے بعد آنیوالی نسل پر نہیں نسلوں پر پڑتے ہیں۔ جو شعوری طور پر یا غیر محسوس طریقے، پر اُن کے فن میں محسوس کیا جاتا ہے۔ میں موضوعاتی لحاظ سے اُن کے قریب نہیں ہوں ممکن ہے کرافٹ میں کہیں قربت ہو، البتہ ایک قربت ہوسکتی ہے کہ جس طرح منٹو نے سماج کے ناپسندیدہ افراد میں خوبیاں تلاش کیں میرے افسانوں میں جو مجھے یاد آرہے ہیں اُن میں ''کلمہ گو'' اور ''بدذات'' میں بھی یہی کیفیت ہے۔

☆ بزرگانِ دین سے مکالمہ آپ کے کس اشتیاق کے سبب ذہن و دل میں اُجاگر ہوا، اس سے کیا حاصل ہوا؟

☆☆ میں جس خانوادے میں پیدا ہوا وہ عالموں اور صوفیوں کا گھرانہ ہے اور جس شہر میں رہتا ہوں وہ بے شمار صوفیوں اور سنتوں کا مسکن ہے۔ ریڈیو کی ملازمت کی وجہ سے اُن کے اعراس میں مجھے شریک ہونے کے مواقع میسر آئے ہیں۔ میرے خاندان کے بزرگوں کی حیات اور اُن کی تعلیمات پر کتابیں، مختلف تذکروں میں اُن کا ذکر موجود ہے۔ یہ سب باتیں مجھے اُکساتی تھیں۔ میں نے تصوف پر ایک باقاعدہ افسانہ ''تقلیب'' بھی لکھا ہے۔ اور بہت سارے افسانوں میں اُن کیفیتوں کو بیان کیا ہے۔ میں اسی موضوع پر ایک ناول بھی لکھنا چاہتا تھا اور ان بزرگوں کو کردار بھی بنانا چاہتا تھا۔ برسوں سے یہ پروجکٹ میرے ذہن میں تھا لیکن اُنھیں کردار بنانے کے لیے میرے پاس وہ تکنیک نہیں تھی۔ آخر مطالعہ نے بتایا کہ Schizophrenia نامی ایک ایسا مرض ہے جس میں مریض کو عجیب عجیب چہرے نظر آتے ہیں وہ اُن سے

باتیں بھی کرتا ہے۔وہ ایسے مناظر بھی دیکھتا ہے جہاں وہ کبھی گیا ہی نہیں ہوتا ہے۔اس مرض سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں نے ناول لکھا،میرے خاندانی بزرگ نجف سے تعلق رکھتے تھے جن کی زبان عربی تھی۔اُن کی زبان اور اپنی موجودہ زبان کے فرق کی خاطر میں نے صحیفوں کے ترجمے کی زبان اُن کے لیے استعمال کی،خیر ان باتوں کی تفصیل کی ضرورت نہیں،بہر حال اس وجہ سے ایک اچھوتا ناول لکھنے میں کامیاب ہو گیا۔اس سے بڑا اور کیا فائدہ مجھے چاہیے تھا۔

☆ واقعہ کربلا سے آپ کی عقیدت قابل تعظیم،تخلیقی رویئوں میں،ایثار و قربانی کے اس عظیم سانحہ کو آپ نے کس طور پر برتا اور سمویا ہے،نیز آج کل کے دور میں جو چھوٹی بڑی کربلائیں وقوع پذیر ہو رہی ہیں ادیب بالخصوص اُردو والے اُس کی جانب توجہ کیوں نہیں فرما رہے ہیں؟

☆☆ واقعہ کربلا سے مجھے ہی کیا سارے مسلمانوں کو عقیدت ہے۔ادب میں اس کا بہت زیادہ استعمال ہوا ہے۔میرے افسانے ''سبزۂ نورستہ کا نوحہ''میں میں نے اسے ذاتی غم میں تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے۔افسانے کا کردار اپنے بھرے پورے گھر اور اپنی محبوبہ سکینہ کو چھوڑ کر پاکستان ہجرت کر جاتا ہے۔پچاس برس کے بعد جب وہ واپس آتا ہے تو سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔جہاں اُس کا گھر تھا ،اب وہاں پر ایک عظیم الشان بلڈنگ کھڑی ہے۔اُس سے قریب عاشور خانہ ہے ۔محرم کی مجلس جاری ہے۔افسانے کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں کہ یہ واقعہ کس طرح ذاتی غم بنتا ہے قارئین سمجھ سکتے ہیں

''میرے کانوں میں آوازیں گونج رہی تھیں،''ہائے امام مظلوم آپ کے عزیز اور چہیتے باقی نہ رہے۔۔ہائے امام مظلوم آپ سے آپ کا مدینہ چھوٹ گیا ۔۔۔ہائے امام مظلوم آپ کی سکینہ بے سہارا ہو گئیں۔۔۔ہائے امام مظلوم آپ کا سب کچھ چھوٹ گیا۔۔۔ہائے امام مظلوم آپ کس کس پر صبر کریں گے؟

میں غم سے نڈھال بہت دیر تک سکتے کی حالت میں ڈوبا رہا اور پھر بوجھل قدموں سے چلتا ہوا جیسے ہی امام باڑے میں داخل ہوا،وہاں ماتم اپنے نقطہ عروج پر تھا۔سینے پر پڑنے والی ہر ضرب اور منہ سے نکلنے والی ہر آواز تشنہ شدیا حسین راست میرے دل پر بجلی بن کر گر رہی تھی۔ماتم داروں میں میں بھی شامل ہو گیا۔میری آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہو رہی تھی اور میری زبان سے پورے کرب کے ساتھ آوازیں نکل رہی تھیں ہائے تشنہ شدیا حسین۔ہائے تشنہ شد یا حسین۔ہائے تشنہ شدیا حسین۔''

ایسا نہیں ہے کہ موجودہ دور میں ہونے والی چھوٹی بڑی کربلاؤں پر آج کے ادیب نہیں لکھ رہے ہیں۔لکھ رہے ہیں۔اُن افسانوں کا ذکر کرنے بیٹھوں تو بات بہت طویل ہو جائے گی۔

☆ ماضی کی بازیافت آپ کا پسندیدہ موضوع ہے۔وقت کے تعین کے ساتھ اغراض ومقاصد اور نتائج بتلا کر قاری کی تشفی کیجیے؟

☆☆ دیکھیے جناب۔۔۔اگر حال بدحال ہو تو آدمی ماضی میں جیتا ہے۔ہمارا ماضی شاندار روائتوں کا امین ہے۔بہتر اقدار کا،اعلی اخلاق کا،فیاضیوں کا، ایثار و قربانیوں کا،عمدہ اقتدار کا،میں اپنے قارئین کو ماضی میں اس لیے نہیں لے جاتا کہ پدرم بود سلطان بلکہ اس لیے لے جاتا ہوں کہ اُنھیں احساس دلا سکوں کہ ہم اپنی روائتوں کو بھول رہے ہیں۔اپنی گنگا جمنی تہذیب سے دور ہو رہے ہیں۔انسان اب بھی اپنے کردار میں وہ صفات پیدا کر سکتا ہے اس کی خاطر میں کبھی حال سے ماضی کی طرف لے جاتا ہوں اور کبھی ماضی سے حال کی طرف لاتا ہوں۔اچھا ادب بھی وہی کہلاتا ہے جس کی جڑیں روایت میں پیوست ہوں اور وہ حال سے بھی مربوط ہو،جو عصری آگہی بھی بخشے اور حال سے آنکھیں بھی چار کر سکے۔میں ماضی کی غلطیوں کا احساس بھی دلاتا ہوں اور ماضی کی خوبیوں سے آگاہ بھی کرتا ہوں۔یہی میری تحریروں کا مقصد ہے۔

☆ ''تلک الایام''کا خالق اپنے ملک میں انصاف پر مبنی جس جمہوری نظام کا خواب دیکھتا ہے آج کے پُر تشدد ہندوستان میں اُن کے پورا ہونے کی کس قدر اُمید باندھی جاسکتی ہے؟

☆☆ اللہ فرماتا ہے کہ میں تمہارے گمان کے ساتھ ہوں اور میرا ایمان بھی یہی ہے کہ ہمیں اچھا گمان رکھنا چاہیے۔رہی بات آج کے تشدد کی تو ایک ہندوستان ہی کیا ساری دنیا اسی سے گزر رہی ہے۔ہاں شکلیں الگ الگ ہیں۔ماضی کے ادوار میں بھی یہی سب کچھ ہوتا رہا ہے۔تاریخ اپنے آپ کو دوہراتی رہتی ہے۔ہندوستان میں اب بھی بڑی تعداد سیکولر ذہنوں کی ہے۔ہمیں بہر حال اچھا گمان رکھنا چاہیے۔

☆ موجودہ دور کے مصائب و آلام سے منہ موڑ کر پانچ سو قبل مسیح کی روداد بیان کرنے کی ضرورت کیوں آن پڑی اور اس کام کی تکمیل میں کس قسم کی مشکلات و مسائل درپیش رہے؟

☆☆ یہ آپ نے بہت اچھا سوال کیا۔موجودہ ادب زیادہ تر مسائلی موضوعات پر منحصر ہو کر رہ گیا۔افسانوں اور ناولوں سے رومانی فضاء اور جمالیاتی نزاکتیں کم سے کمتر ہو گئیں۔ناول''چاند ہم سے باتیں کرتا ہے''اس کے لکھنے کی وجہ میں نے اس کے پیش لفظ میں بیان کی ہیں،آپ بھی دیکھ لیں،''میرے معاصرین، عصری،سماجی،سیاسی،معاشرتی موضوعات پر،بہت عمدہ ناول لکھ رہے ہیں۔اپنے تیسرے ناول کے لیے میں ایک ایسے موضوع کی تلاش میں تھا جو قدرے مختلف ہو، اور میں اپنے قارئین کو عصری ماحول کی جبریت،جس سے وہ خود دن رات جوجھ رہے ہیں کچھ دیر کے لیے فرحت و انبساط کی وادیوں میں لے جا سکوں۔''اس کی خاطر میں نے یہ ناول لکھا۔اس میں میں نے کچھ تجربات بھی کیے ہیں۔سب سے پہلے تو میں نے ناول کے فارم سے بغاوت کی۔اس ناول میں ایک کے بعد ایک کئی کہانیاں آتی ہیں۔یہ تکنیک میں نے عظیم کاویہ''مہا بھارت''سے لی ہے۔اُس میں بھی ایک کہانی کے ساتھ کئی کہانیاں آتی ہیں اور پھر اصل کہانی قائم رہتی ہیں۔میرا موضوع بھی عشق ہے جو آخر تک باقی رہتا ہے۔میرے اس ناول میں دراوڑ قوم بھی شامل ہے۔اُن کے داستان عشق کی کہانی میری اپنی لکھی ہوئی ہے۔دراوڑیوں کے بارے میں اُن کے رسومات رقص،رہن سہن،نام وغیرہ کا کہیں

اندراج نہیں ملتا۔ میں نے اُن کے لیے جس علاقے کو کیا وہاں کی قدیم زبان تیلگو ہے۔ سنسکرت میں بھی کئی الفاظ تیلگو زبان کے ہیں۔ اس سے اُس زبان کی عمر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے میں نے کرداروں کے نام رکھے، اُن کے کلچر کو ترتیب دیا۔ آریاؤں کے لیے بھی مجھے یہ سب کچھ کرنا پڑا۔ میرے تینوں ناولوں کے لیے مجھے بہت زیادہ ہوم ورک کرنا پڑا۔ خوب مطالعہ کرنا پڑا، نوٹس بنوانے پڑے، قدیم پینٹنگس دیکھنا پڑیں، نقشے سامنے رکھنا پڑے، تاریخ اور جغرافیہ کی کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا، تب کہیں یہ مکمل ہوسکے۔ اس لیے میرے بارے میں کہا جانے لگا کہ میں نے ناول کو بھی ریسرچ ورک بنا دیا۔ بلکہ ممتاز افسانہ نگار و ناول نگار ڈاکٹر عبد الصمد نے لکھا ہے کہ قرۃ العین حیدر کے بعد نئی نسل میں نورالحسنین ہی ہے جو ناول کے لکھنے سے پہلے تحقیقی مواد جمع کرتا ہے۔

☆ ''چاند ہم سے باتیں کرتا ہے'' میں تین تکنیک برتی گئی ہیں، تاریخی، نیم تاریخی، طبع زاد واقعات کی ترتیب و تنظیم، کرداروں کی آپسی گفتگو اور چاند سے مسلسل مکالمہ، حادثات واقعات، اتفاقات، عشق اور چاند کے مابین گفتگو قاری کے ذہن پر کچوکے لگا رہا ہے؟

☆☆ اصل میں عشق اور چاند ناول کے مرکزی کردار ہیں اور وہی پورے ناول کو آخر تک لے جاتے ہیں۔ چاند اکثر مقامات پر کرداروں سے راست گفتگو بھی کرتا ہے۔ یہ مکالمے قاری کو کچوکے لگاتے ہیں یا اُن کے تجسس کو بڑھاتے ہیں اس کا جواب تو قاری ہی دے سکتے ہیں لیکن ایک بات میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ قاری کو ناول سے باندھے رکھتے ہیں۔

☆ آپ کے ناول ''تلک الایام'' میں آر۔ ایس۔ ایس اور دیگر انتہا پسند جماعتوں کی نسبت جن خدشات کا اظہار کیا گیا ہے وہ جس قدر حقیقت پر مبنی ہے اور آج کے جلتے سلگتے ہندوستان بالخصوص اقلیتوں کے مستقبل کے حوالے سے محتاط تجزیہ کیا ہے؟

☆☆ ہر ملک میں نیک و بد، سیکولر اشرار انتہا پسند افراد ہوتے ہیں۔ ہمارا ملک جمہوریت پر یقین رکھتا ہے۔ یہاں کئی مذاہب آمنے سامنے ہیں تو ٹکراؤ تو ہوگا؟ اُن ممالک میں جہاں ایک ہی مذہب کے ماننے والے ہیں وہاں بھی اکثر وہ بیشتر ممالک جلتے سلگتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات بھی نہیں ہے تاریخ کا ہر دور کہیں نہ کہیں ان باتوں کا شکار ہوا ہے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے کہ مقابل کی قوم پوری طرح ختم ہوگئی۔ میں نے اپنے ناول میں اقلیتوں کے لیے ایک پیغام دیا ہے کہ مقابل کو اپنی ضروریات بنانے کے بجائے خود کو اُن کی ضرورت بنائیں۔ یہ خوبی پیدا ہو جائے تو کوئی بھی تنگ نظر جماعت آپ کی ضرورت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ کوئی بھی ادیب جو دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے وہی لکھتا ہے۔

☆ جب ایک پڑھا لکھا روشن دماغ قلم کار تہذیب و اخلاق کے زوال پر فکر مندی کا اظہار کرتا ہے تو قاری کے ذہن میں مختلف ادوار اور تہذیبیں اُبھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ آپ کس تہذیب اور اخلاق کے زوال پر آزردہ ہیں؟

☆☆ ہر وہ سوچنے والا ذہن جب مٹتی اقدار اور بدلتے اخلاق کو دیکھتا ہے تو وہ فکر مند ضرور ہوتا ہے۔ ماضی بعید کی بات چھوڑیے جب ہم ماضی قریب میں بھی اُن اعلیٰ روائتوں، تہذیب اور اخلاق کا خون ہوتے دیکھتے ہیں تو اس کا ملال ضرور ہوتا ہے۔ میں اُس گنگا جمنی تہذیب کا ماتم دار ہوں جو مذہبوں کے نام پر نفرت نہیں کرتے تھے۔ میں اُن اخلاق کا نوحہ گر ہوں جو پڑوسی سے کوئی رشتہ نہ ہونے کے باوجود بھائی، بہن، چچا، ماموں، خالہ کا درجہ دیتے تھے۔ عید اور تہوار مل جل کر مناتے تھے۔ میلے ٹھیلوں اور اعراس میں سب ایک ساتھ شریک ہوتے تھے۔ تعلیمی درس گاہوں اور کھیل کے میدانوں میں مل بانٹ کر کھیلتے تھے۔ میں آپسی اتحاد و اتفاق کو مٹتا ہوا دیکھتا ہوں تو آزردہ ہو جاتا ہوں۔

☆ ہندوستان میں روز آنہ دو درجن کے قریب کسان خودکشی کرنے پر مجبور ہیں۔ اس کے علاوہ اور کونسے مسائل ہیں جس کے سبب آپ کے ہاں زراعتی نظام کی نسبت عدم اعتماد اور بے چینی پائی جاتی ہے؟

☆☆ یہ سوال میرے جیسے ادیب کے بجائے کسی سیاست داں سے پوچھا جاتا تو وہ اُس کا بہتر جواب دے پاتا۔ ہمارے ملک میں کسان خودکشی کر رہے ہیں لیکن ہر روز دو درجن نہیں۔۔۔ اگر ایسا ہونے لگا تو کچھ ہی مہینوں یا سالوں میں ہمارے یہاں کسان دوا کو بھی نہیں ملیں گے۔ کسانوں کے ساتھ بے شمار مسائل ہیں۔ سب سے پہلا مسلہ پانی کا ہے۔ جو موسم برسات پر منحصر ہے۔ دوسرے کھیتی باڑی کے لیے عمدہ بیج، کھاد، فصلوں کو گھاس اور جنگلی پودوں سے بچانے کے لیے دواؤں کی ضرورت پڑتی ہے۔ بجلی کا ہر ماہ آنے والا بل، ان سب کی ادائیگی قرض کی بنیادوں پر ہوتی ہے۔ کبھی مہاجنوں سے اور کبھی بنکوں کی مدد سے رقم اُدھار حاصل کی جاتی ہے۔ اور دونوں ہی بنا سود کے رقم نہیں دیتے۔ ہندوستان میں اکثر ریاستوں میں کئی برسوں سے بارش بالکل نہیں ہوئی، بارش نہیں ہوئی تو فصلیں بھی پیدا نہیں ہوئیں۔ قرض وصولنے والے پیچھا نہیں چھوڑتے، حکومتیں اُن کے ویلفیر کے منصوبے تو بہت بناتی ہے لیکن وہ سہولتیں اُن تک نہیں پہنچ پاتیں۔ پھر کسانوں کو کوئی اور آمدنی کا ذریعہ بھی نہیں ہے۔ گھریلو اخراجات، تعلیمی مصارف، دکھ بیماریاں، بچوں کی شادی بیاہ سب کچھ کھیتی ہی پر منحصر ہے۔ جب چاروں طرف سے مایوسی چھا جاتی ہے تو آپ ہی بتائیں وہ کیا کریں گے؟۔۔۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے ملک کا کسان کھیتی باڑی سے منہ نہیں موڑنا چاہتا ہے۔ وہ ہر طرح کی مصیبتیں برداشت کرتا ہے لیکن کھیتی سے اُس کے دل میں وہی محبت باقی ہے۔

☆ اوپر بیان کردہ تجربات و شاہدات کے علاوہ وہ کونسے تجربات و مشاہدات ہیں جس سے نئی دنیا آباد کرنے کا کریڈٹ آپ کو دیا جاتا ہے؟

☆☆ ایک ادیب و شاعر کی سوچ اور فکر ایک عام آدمی سے کچھ مختلف ضرور ہوتی ہے۔ عام آدمی اُس پر وارد ہونے والی ہر آفت کو مقدر سمجھ لیتا ہے لیکن ایک ادیب اور شاعر اُس آنے والی آفات کو صرف مقدر نہیں بلکہ یہ بھی غور کرتا ہے کہ یہ کیوں اور کس نے لا دیا ہے۔ میرے افسانے ہوں یا ناول میں نے ایک بہتر نظام کا خواب دیکھا اور دکھایا ہے۔

☆ آپ کے ہاں سوالات جس قدر اُٹھائے گئے کم کم افسانہ نگاروں کے ہاں یہ عمل دیکھنے میں آیا ہے، سچی بات یہ ہے کہ آپ کے جوابات قاری کو مطمئن نہ کر سکے جس قدر سوالات کا تقاضہ تھا؟

☆☆ دیکھیے زندگی اور حالات کو دیکھنے اور پرکھنے کا ہر ایک کا اپنا اپنا انداز ہے۔ادب زمانے سے، حالات سے، مسائل سے اقتدار سے سوالات ہی پوچھ سکتا ہے۔اُس کا حل نہیں دے سکتا۔اسی لیے ادب کو احتجاج کا علم بھی کہا گیا ہے۔ ہم سب بھی آدھے ادھورے ہیں مکمل طور پر مطمئن کیسے کر سکتے ہیں؟

☆ کہا جاتا ہے کہ تخلیق کار، اپنی تحریروں کے ذریعہ آنے والے خطرات کی نشاندہی کر دے تو حق منصبی ادا ہو جاتا ہے۔اس حوالے سے آپ کے کردار اور نتائج ہمارے قارئین کے لیے باعث کشش ہوں گے؟

☆☆ ادب کا وجود ہی اس لیے ہوتا ہے کہ وہ نا انصافیاں، ظلم بر بریت، فرض اور حق سے آشنا کرے۔صرف عیش ونشاط کی وادیوں کی سیر ہی نہ کرائے۔بلکہ حال کا جائزہ لیتے ہوئے مستقبل کی نشان دہی بھی کرے۔میں نے بھی بساط بھر یہی کوشش کی ہے۔

☆ آپ بجا طور پر ڈالر، پونڈ، ریال اور دینار کے متلاشیوں کو غلط گردانیے، مگر اس ٹھوس حقیقت سے کسی طرح مفر نہیں کہ اس سیلاب بلا نے (ہماری مراد تیسری دنیا) سماجی، اخلاقی اور خاندانی قدروں کو روند کر رکھ دیا ہے۔کچھ علاج اس کا بھی، اے چارہ گراں ہے کہ نہیں؟

☆☆ میں اس نظریے کا قائل ہوں کہ کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ، تو میں ڈالر، پونڈ، ریال، دینار کی کمائی کا مخالف کیسا ہو سکتا ہوں آسودگی ایک نعمت ہے جو حواس، کردار اور اخلاق کو قابو میں رکھتی ہے۔بھوکے پیٹ تو عبادت سے بھی روکا گیا ہے۔اسی طرح مسلمانوں کو سائنس اور ٹکنالوجی میں آگے بڑھنا چاہیے۔میرا تو یہ بھی کہنا ہے کہ دینی علوم کا حصول تو ہم پر فرض ہے جو ہماری عاقبت سنوارتا ہے اور عصری علوم سے غفلت دنیا میں رسوائی کا سبب بنتی ہے۔ہم عصری علوم حاصل کریں گے تب ہی ڈالر اور پونڈ کما سکیں گے لیکن یہی ڈالر، پونڈ، دینار اور ریال کی زیادتی اگر آپ کو غلط راہوں پر ڈال دے تو پھر یقیناً سماج، معاشرے اور خاندانی وقار کو برباد کر دیتی ہے۔

☆ چلیے جو باہر چلے گئے، سو چلے گئے۔نتیجہ اور خمیازہ بھگت رہے ہیں مگر ہم جو ٹکڑوں میں بٹتے بٹتے ذات میں سمٹتے جا رہے ہیں اُس کے اخلاقیات کے ساتھ کہانی کا مستقبل بھی تاریک دکھائی دینے لگا ہے؟

☆☆ میں نہیں سمجھتا کہ جانے والوں کی وجہ سے کہانی کا مستقبل تاریک ہوگا، بلکہ اُن کی وجہ سے کہانی کو نئے موضوعات بھی مل رہے ہیں۔دوسرے یہ بھی کہ جانے والے سبھی بھٹک گئے ہیں؟ ایسا بھی نہیں ہے۔بھئی اُن کی وجہ سے ملک کو زرمبادلہ بھی تو مل رہا ہے۔اب رہی بات کہ ہم ٹکڑوں میں بٹتے بٹتے ذات میں سمٹ گئے ہیں؟ تو بھائی یہ آج کی بات نہیں ہے۔ہمارے فرقوں میں بٹ جانے کی بات کریں تو یہ نہ تو ڈالر اور پونڈ اور ریال کی وجہ سے ہوا نہ معاشی آسودگی کی چاہ میں جانے والوں کی وجہ سے ہوا، یہ کچھ اور مسلے ہیں۔

☆ ایک اچھے ناول کو ذات کا تضاد بتلا کر ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے بحث کا نیا در کیوں وا کیا ہے؟

☆☆ گلزار جاوید صاحب کوئی بھی ناول اگر سوال نہیں اُٹھاتا، یا اُس میں پیش کیے گئے معاشرے میں اگر تضاد نہ ہو تو کہانی کیسے آگے بڑھے گی۔یہ بات اُنھوں نے غالباً ناول ''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' سے متعلق کہی ہے۔1857 کا زمانہ نہ تو پوری طرح انگریزوں کا مخالف تھا اور نا ہی پوری طرح اُن کا وفادار تھا۔دلّی اور لکھنو میں ایک طرف آزادی کے متوالے تھے تو دوسری جانب اس سے بے نیاز تیتر بٹیر باز، طوائفوں کے کوٹھے بھی آباد تھے۔عیش وعشرت میں ڈوبے ہوئے خاندان بھی تھے۔تصوف کی خانقاہیں اللہ ہو کے نعروں کے بجائے ''انقلاب'' کی صداؤں سے گونج رہی تھی۔کچھ غدارِ وطن بھی تھے۔ان ساری باتوں کی طرف وہ اشارتاً کہہ رہے تھے۔

☆ فاطمی صاحب ہی نے آپ کے ناول ''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' کا تفصیلی اور مثبت محاکمہ کرنے کے بعد یہ کہہ کر دال میں کنکر ڈالنا کیوں ضروری سمجھا، کسی وجہ سے تکنیکی یا تاریخی اعتبار سے عمدہ ناول نہ ہو کر بھی قابل تعریف ہے؟

☆☆ ڈاکٹر علی احمد فاطمی صاحب نے ناول کے ایک ایک جز کا جائزہ لیا ہے اور بڑی عرق ریزی سے اُس پر روشنی ڈالی ہے۔میں سمجھتا ہوں اُنھوں نے یہ بات نہیں کہی ہے۔میں یہاں اُن کے الفاظ پیش کر رہا ہوں، ''نورالحسنین کا یہ ناول ان حوالوں سے خاصا کامیاب ناول ہے جو تاریخ کا ہی نہیں زندگی کے پیچ و خم اور کیف وکم کا مفکرانہ وفنکارانہ آئینہ دار ہے۔اِس عہد میں جب عام سماجی معاشرتی ناولوں کا ہی فقدان ہے، نورالحسنین نے تاریخی بلکہ اور آگے بڑھ کر فلسفیانہ نوعیت کا ناول لکھ کر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔جس کے لیے اُنھیں جتنی بھی مبارکباد دی جائے وہ کم ہے۔''

☆ حمایت علی شاعر نے آپ سے جن بڑے کارناموں کی اُمید یا آس لگائی تھی اُس پر آپ کس قدر پورا اُترے؟

☆☆ حمایت علی شاعر میرے پھوپھی زاد بھائی تھے۔اُن کی شخصیت ہم سارے ہی بھائی بہنوں کے لیے بڑی انسپائرنگ شخصیت تھی۔اُن کا کردار، اُن کے آداب واخلاق، اُن کی جدوجہد بھری زندگی، اُن کا ادبی سفر، کامیابیاں، معرکے، ہم سب اُن کے دیوانے تھے اور وہ بھی ہم لوگوں سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔چونکہ خاندان میں اُن کے بعد میں ہی ایک ایسا تھا جو تخلیقی ادب کا مسافر تھا۔اس لیے وہ مجھے بے حد چاہتے تھے، ایک بڑے بھائی کی حیثیت سے وہ ادب میں بھی مجھ سے بہت ساری توقعات رکھتے تھے۔یہاں ادبی شہرت کے لیے صرف کراچی، لاہور اور اسلام آباد ہی نہیں ہے کہ ان تین شہروں کی شہرت ہندوستان میں بھی روشن کر دیتی ہے۔اس کے برخلاف ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے۔کسی کی ادبی شناخت کا قائم ہونا آسان نہیں ہے۔یہاں بے شمار ادبی شہر ہیں یہاں کئی ایسی ادبی ریاستیں ہیں کہ اُن کے حلقوں تک فن کی رسائی بہت مشکل ہے۔ہر رسالہ ہر مقام تک نہیں پہنچتا۔ایسے حالات میں اُردو کے اُفق پر

اپنی شناخت بنانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ پھر علاقائی تعصب، گروہ بندیاں، ناقد کی اپنی پسند۔ان تمام مرحلوں سے گزرنے کے بعد ہی شناخت بنتی ہے۔اُس پر ادب میں اعتبار اور اعتماد قائم کرنا اور تنقیدی حوالہ بننا، آسان بات نہیں ہے۔میں اس منزل تک تو پہنچ گیا۔اللہ کا شکر ہے۔رہی بات کارناموں کی تو یہی کہوں گا کہ کوشش کر رہا ہوں۔

☆ کیا وہ بڑا ناول وجود میں آچکا ہے، جس کی بابت حمایت بھائی نے وثوق سے پیش گوئی کی تھی، گر نہیں تو کب تک آنے کے امکانات ہیں؟

☆☆ میں سمجھتا ہوں میں ابھی تک کامیاب نہیں ہوا۔کب تک آئے گا، یا نہیں آئے گا کچھ نہیں کہہ سکتا۔

☆ محترم خالد حسینی کی اس رائے سے اتفاق یا اختلاف جاننے کے بعد ہی سوال اُٹھایا جاسکتا ہے کہ آپ نے فکشن تخلیق کرتے ہوئے کسی عظیم سچائی تک پہنچنے کے لیے اُس کے گرد کتنے جھوٹ کے تانے بانے بُنے ہیں؟

☆☆ عموماً لوگ فکشن کو فسانہ کہتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ افسانہ ہو یا ناول کسی نہ کسی حقیقی واقعہ یا حقیقی کردار کی اُنگلی تھام کر ہی لکھا جاتا ہے۔اگر واقعہ کو جوں کا توں لکھ دیا جائے تو وہ خبر تو بن جاتا ہے لیکن فن پارہ نہیں بن پاتا۔اس کی خاطر ہی اسلوب تکنیک اور کچھ فرضی کرداروں کی ضرورت ہوتی ہے جنھیں شامل کیا جاتا ہے۔میرا ناول ''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' 1857ء کی پہلی جنگ آزادی پر پھیلا ہوا ہے۔جو ایک عظیم سچائی ہے۔اس ناول کے مرکزی کردار بادشاہ راجا اور نواب نہیں ہیں بلکہ فرضی کردار ہیں۔انگریزوں کے خلاف اُٹھنے والا یہ طوفان کسی بادشاہ یا راجا کی ایما پر نہیں اُٹھا تھا۔یہ ایک عوامی تحریک بن گئی تھی جس میں شامل ہونے والے افراد کو نہ کہیں کا راجا بنایا جانے والا تھا نہ ہی کوئی بڑا فائدہ پہنچنے والا تھا۔وہ لوگ اپنے ہتھیار، اپنا گھوڑا لے کر اور اپنی مرضی سے شامل ہوئے تھے، لیکن تاریخ میں اُن عام مجاہدین اور شہداء کا کہیں ذکر نہیں ہے۔تاریخ تو مورخ لکھتا ہے۔لیکن فکشن نگار اُن عام ہیروز کی طرف بھی دیکھتا ہے جن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ چنانچہ میرے فرضی کردار ایسے ہی مجاہدین اور اور شہداء کی علامتیں ہیں۔ناول میں اصلی کردار بھی ہیں کیونکہ اُن کے بغیر تاریخی واقعہ مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔وہ انگریز سردار جو گمنام ہیروز کے ہاتھوں مارے گئے میں نے اپنے فرضی کرداروں کا کارنامہ بنا دیا۔فکشن ایسے بہت سارے جھوٹ کا بھی سہارا لیتا ہے۔

☆ جین آسٹین نے ناول کے میڈیم میں دماغ کی اعلیٰ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے انسانی فطرت، خوبی اور ذہانت کو پُر لطف طریق پر پیش کرنے کی جو بات کہی ہے آپ اُس پر عمل کرنے میں کس قدر کامیاب ہوئے ہیں؟

☆☆ مجھے نہیں معلوم، یہ فیصلہ تو میرے قاری کریں گے۔ہاں یہ کہہ سکتا ہوں میرے ناول کے موضوعات اور اُن کے کردار، کرداروں کی نفسیات، پلاٹ کی ضروریات خود ہی اسلوب اور تکنیک بھاتی ہیں اور عقل و ذہانت کب یہ منزلیں طئے کر لیتی ہیں پتہ ہی نہیں چلتا۔

☆ چیسٹر کی رائے، ناول خود اپنے آپ میں سائنسی یا ما بعد الطبعیاتی موضوع پر لکھی گئی کتابوں سے زیادہ سچا ہوتا ہے کہ بارے میں آپ کی رائے اور عمل سے آگاہی قاری کے لیے فکری سامان مہیا کر سکتی ہے۔

☆☆ کہانی، قصہ اور داستان ہمارے پاس پہلے سے موجود تھی لیکن ناول کو کرافٹ کرنے کا فن ہم نے مغرب سے سیکھا ہے۔اس لیے وہ ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ادب سے ہٹ کر لکھی جانے والی کتابیں زیادہ تر مفرضوں کی روشنی میں لکھی گئی ہیں۔سائنسی کتابوں کی تھیوری کبھی بھی بدل سکتی ہے۔جیسے میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ ناول اور افسانے کی بنیاد کسی حقیقی واقعہ یا کسی کردار کی انگلی پکڑ کر ہی رکھی جاتی ہے۔جو لکھ دیا گیا، وہ لکھ دیا گیا۔وقت اُسے رد کر سکتا ہے لیکن اُسے بدل نہیں سکتا۔

☆ اب آجایئے اُردو زبان اور ادب کے مستقبل کی جانب، موجودہ عدم برداشت اور ہاؤ ہو کی گرد کب تک جمنے کے امکانات ہیں۔اس کے بعد ہمارے خطے بالخصوص ہندوستان میں اس زبان و ادب کے مستقبل کی بابت کس طرح کی اُمیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں؟

☆☆ اُردو زبان کا گراف تقسیم ملک کے بعد سے مسلسل گر رہا ہے۔اسے روزگار سے کاٹ دیا گیا ہے لیکن اس کے بعد بھی یہ زبان ابھی تک زندہ ہے اور اس میں ادب بھی برابر تخلیق ہو رہا ہے۔یہ اُس کی عوامی مقبولیت کی دلیل ہے۔حکومتیں عوام کی خواہش اور ضروریات کے مطابق کچھ کرنے کے لیے مجبور ہوتی ہیں خواہ معاملہ زبان ہی کا کیوں نہ ہو۔مہاراشٹر، بہار، آندھرا پردیش، کرناٹک اور کشمیر کی ریاستوں کی عوام نے اُردو کا دامن نہیں چھوڑا۔چنانچہ ان ریاستوں میں اُردو پوری طرح پھل پھول رہی ہے۔یہاں سرکاری اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں با ضابطہ اُردو پڑھائی جارہی ہے۔اس کے علاوہ جو خانگی اسکول اور کالج ہیں حکومت اُنھیں دیگر زبانوں کے برابر ہی گرانٹ دے رہی ہے۔مذکورہ ریاستوں میں گلی گلی اُردو اسکول ہیں۔کالج ہیں۔ہر ایک دو ضلع میں یونیورسٹیاں ہیں۔زبان کو نقصان پہنچاتے ہیں خود اُس کو استعمال کرنے والے۔مجھے یہاں سید محمد اشرف کی تقریر کا وہ جملہ یاد آرہا ہے کہ جس زبان نے اپنی تعمیر میں دو سو سال لیے ہوں، وہ مرنے میں بھی کم از کم اتنے ہی سال لے گی۔رہی بات ادب کی تو آج بھی شعراء ادباء ناقدین کی ایک کہکشاں ہندوستان میں روشن ہے۔

☆ ایک خیال یہ ہے کہ اُردو زبان و ادب کی رگوں میں دوڑنے والا تازہ خون، اُردو کی نئی بستیوں، امریکہ، برطانیہ، کینڈا اور مشرق وسطیٰ کی دین ہے۔آپ کے خیال میں Post Carona world ان بستیوں میں مقیم اُردو زبان سے جڑے لوگ اور وہاں سے ملنے والی کمک کی مستقبل میں صورتِ حال کیا ہوگی؟

☆☆ دیکھیے صاحب، آپ کے اس سوال کا جواب دینے میں نہ تو میں کسی کی دل شکنی کرنا چاہتا ہوں اور نا ہی کسی خوش فہمی کا شکار ہوں۔جن نئی بستیوں کا آپ نے ذکر کیا ہے، وہاں پہنچنے والے یا تو ہندوستانی ہیں یا پاکستانی ہیں۔جو وہاں پہنچے ہیں وہ ہی اُردو بولتے ہیں اور لکھتے پڑھتے ہیں لیکن اُن کے بچے تو اُردو

سے واقف ہی نہیں ہیں، کیونکہ اُن کا ذریعہ تعلیم اُردو نہیں ہے۔ کچھ ہی خاندان ہوں گے جو اپنے طور پر بچوں کو گھروں میں اُردو پڑھاتے ہونگے۔ بلکہ وہ خود بھی اپنے بچوں سے وہیں کی زبانوں میں گفتگو کرتے ہوں گے۔ تو یہ کمک کب تک اُردو کو تازہ خون پہنچائے گی؟ ہاں اُردو زندہ رہے گی اُس وقت تک جب تک غریب غرباء زندہ ہیں اور اُن کے بچے اُردو پڑھتے رہیں گے۔

☆ اپنے ملک اور علاقے کے میڈیا کے بجائے کینڈین ٹیلی وژن ''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' اور آپ کے دیگر کارناموں کی جانب کیونکر متوجہ ہوئے؟

☆☆ یہ بات میں بہت افسوس کے ساتھ کہہ رہا ہوں، میڈیا پر ادب اور ادبیات کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ پہلے ریڈیو سے کتابوں پر تبصرے بھی نشر کیے جاتے تھے اور اُن کے انٹرویو بھی لیے جاتے تھے۔ لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ یہ روائتیں ختم ہوگئیں ہیں۔ کینڈین ٹیلی وژن ''را'' باقاعدہ مسلسل ادبی پروگرام، کتابوں پر مفصل گفتگو اور انٹرویوز ٹیلی کاسٹ کرتا ہے۔ چنانچہ دیگر ادبی شخصیات اور کتابوں کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے میری کتابوں پر بھی مذاکرے پیش کیے اور میرے متعلق گفتگو بھی ہے۔ اس میں میرا عمل دخل کچھ نہیں ہے۔ یہ سب ان کی اپنی پلاننگ ہوتی ہے۔

☆ Post Carona اور نیو ورلڈ آرڈر کے بعد کی دنیا میں پرنٹ میڈیا کی موت واقع ہونے کی پیشن گوئی کے بعد تیسری دنیا بالخصوص برصغیر انڈو پاک میں خصوصیت کے ساتھ ناک سے پرے نہ دیکھنے والے اُردو ادب اور ادیب کس طرح جانبر ہوں گے؟

☆☆ برادرم گلزار جاوید صاحب۔۔۔ اس سارے انٹرویو میں آپ نے جس طرح عام انٹرویوز سے مختلف سوالات کیے، آپ کے ویژن میں ادب، ادیب کے علاوہ اُس کے اطراف کا ماحول، سیاسی معاشرتی نظام، خود اس کا اپنا ادب، نظریہ، بدلتی اقدار، فکر کے زاویے، اُردو کی نئی بستیاں اور میڈیا کے رول سب کچھ شامل ہیں۔ اُن کے جواب دینے میں بھی بڑا لطف آیا، مجھے خوشی ہے کہ آپ کی نظر عصری ادب اور عصری مسائل پر بھی حاکمانہ ہے۔ ایک مدیر اگر ان صلاحیتوں کا حامل ہو تو اُس کا رسالہ کن خوبیوں سے آراستہ ہوگا۔ اس کا اندازہ سب کو ہوسکتا ہے۔ میں آپ کی فکر و عصری باخبری کو سلام کرتا ہوں۔ اب آپ کے سوال کی طرف آتا ہوں۔ آج کا دور تیز تر ترقی یافتہ دور ہے۔ سائنس اور تکنالوجی کا دور ہے۔ ساری دنیا سمٹ کر ایک گاؤں بن گئی ہے۔ اس لحاظ سے ایک ادیب کے سامنے ملکی اور عالمی موضوعات پھیلے ہوئے ہیں۔ کچھ پرائیوٹ چینلز نے بے شمار کلاسیکی افسانوں اور ناولوں کو پکچرائز بھی کیا ہے۔ ایسے دور میں تیسری دنیا کے ادب اور ادیب جو ناک سے پرے نہیں دیکھتے اُن کے ادب کا کیا ہوگا؟ یہ آپ کی فکر ہے۔ تو بھائی کسی افسانے یا ناول کو پکچرائز کرنے کے لیے ہر صورت میں اُس کا کاغذ پر ہونا بہت ضروری ہے۔ اب ایک پین ڈرائیو میں لاکھوں کتابوں کی پی ڈی ایف فائیلیں محفوظ ہوجاتی ہیں۔ لیکن اس کی خاطر بھی کتاب کا موجود ہونا بہرحال ضروری ہے۔ ادب اور ادیب کا کام اسی طرح جاری رہے گا۔ اس انٹرویو کے لیے آپ کا بہت شکریہ۔

''سالِ نو کا تحفہ''

اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل انتونیو گوتیرس کا نئے سال کا پیغام پہلی بار اردو ترجمہ کے ساتھ نشر کیا گیا۔ اقوام متحدہ میں عمومی طور پر پیغامات 6 زبانوں میں نشر کیے جاتے ہیں۔ اقوام متحدہ کی 6 سرکاری زبانیں عربی، چینی، انگریزی، فرانسیسی، روسی اور ہسپانوی ہیں۔ اس عالمی فورم پر ہونے والی تمام تر سرگرمیوں کو صرف 6 زبانوں میں ترجمہ کیا جاتا ہے۔ ایسا پہلی بار ہوا کے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کا بیان اردو ترجمے میں بھی نشر کیا گیا۔ انتونیو گوتیرس نے اپنے پیغام میں کہا عزیز دوستو! 2020 آزمائشوں اور سختیوں کا سال رہا۔ کورونا وائرس نے ہماری زندگیوں کو بری طرح متاثر کیا ہے اور اس کے سبب دنیا کو دکھ اور تکالیف دیکھنی پڑیں۔ ویڈیو پیغام میں کہا گیا کہ بہت ساری قیمتی جانیں ضائع ہوئیں اور یہ وبا اب بھی پھیل رہی ہے۔ اس کی وبا کی نئی شکلیں بھی سامنے آرہی ہیں۔ غربت، عدم مساوات اور بھوک بڑھ رہی ہے، ملازمتیں ختم ہورہی ہیں، قرضے بڑھ رہے اور بچوں کو بھی مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ انہوں نے کہا گھریلو تشدد بڑھ رہا ہے اور ہر جگہ عدم تحفظ پایا جاتا ہے لیکن ایک نیا سال آرہا ہے جس میں ہمیں امید کی کرن نظر آرہی ہے۔ لوگ اپنے آس پاس حتی کے اجنبی افراد کی بھی مدد کررہے ہیں۔ اگلی صفوں میں کام کرنے پر تن، من اور دھن کی بازی لگا رہے ہیں۔ سائنسدان کم ترین مدت میں ویکسین تیار کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ ماحولیاتی تباہی سے بچاؤ کیلئے ممالک نئے معاہدے کررہے ہیں، اگر ہم مل کر کام کریں گے تو امید کی کرنیں پوری دنیا پر پھیل سکتی ہیں، سب سے مشکل ترین سال کا یہی سبق ہے، ماحولیاتی تبدیلی اور کورونا وائرس سے صرف متحد ہوکر ہی نمٹا جا سکتا ہے تاکہ ایک پائیدار مستقبل کی طرف بڑھا جا سکے۔ سال 2021 کیلئے اقوام متحدہ کو عزم یہ ہے کہ 2050 تک کاربن سے پاک گیسوں کے اخراج کے ہدف کو حاصل کرنے کیلئے عالمی اتحاد قائم کیا جائے، ہر حکومت، شہری اور کاروباری ادارہ اس مقصد کے حصول میں اپنا کردار ادا کرسکتا ہے۔ آیئے مل کر ایک دوسرے کے ساتھ اور ماحول کے ساتھ امن کا رشتہ قائم کریں اور ماحولیاتی بحران کا مقابلہ کریں، کورونا وائرس کا پھیلاؤ روکیں اور سال 2021 کو بحالی کا سال بنائیں۔ تباہ کن وائرس کے اثرات سے بحالی، معیشتوں اور معاشروں کی بحالی میں اقوام متحدہ کی طرف سے آپ سب کو نئے سال کی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

زندہ در گور

نورالحسنین
(اورنگ آباد)

ایک عجیب سی تنہائی تھی جیسے وہ زندہ در گور ہو گئے ہوں، نہ کوئی پُرسانِ حال تھا۔ نہ کوئی انسانی آواز سنائی دیتی تھی۔ اُنھوں نے اپنے موبائیل کی طرف دیکھا، اُس کا اسکرین بھی سیاہ تھا اور شاید وہ بھی اُن ہی کی طرح تنہا ہو چکا تھا۔ اُنھوں نے اُسے آن کیا اور بٹن دبا کر کان تکیس Cuntacts کا پیج دیکھا، جانے والی کالس Calls سے وہ بھرا ہوا تھا لیکن آنے والی کسی کال کا اُس میں اندراج نہیں تھا۔ اُنھوں نے اُس پر سے اپنی نظریں پھیر لیں۔ بیڈ سے لٹکی ہوئی اپنی ٹانگوں کو اوپر کھینچا اور گھٹنوں کو اوپر اُٹھایا، اپنے دونوں ہاتھوں کے گھیرے میں اُنھیں کس لیا اور اپنی گردن جھکا دی۔ گردن کو جھکانا ہی تھا کہ جیسے اُن کے دماغ کا بٹن آن ہو گیا۔ کیا وقت آ گیا ہے۔ ورنہ یہی شہر تھا، کیسی گہما گہمی رہتی تھی کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ سڑکوں پر بھاگتی دوڑتی موٹروں کا ریلہ رُکنے کا نام نہ لیتا تھا۔ بیچ بیچ میں آٹو والے اور موٹر سائیکل سوار الگ رش کرتے اور فٹ پاتھ پر پیدل چلنے والے انسان، دھکا کّی کھاتے آگے بڑھتے نظر آتے تھے، لیکن اب تو سب کچھ سنسان ہو گیا ہے۔ گھروں کے دروازے کھڑکیاں تک بند ہیں گویا فرعون کی بستی میں عذاب اُتر آیا ہے کہ جو بھی باہر نکلے گا موت اُسے دبوچ لے گی۔

منیر الدین نے گھٹنوں سے گردن اوپر اُٹھائی اور اپنے اطرف کا جائزہ لینے لگے۔ سوشیل ڈِسٹنس Social distance کے حساب سے مریضوں کے بیڈ لگے ہوئے تھے وہ سب ایک دوسرے سے اُتنے ہی ن سوشیل Un social تھے اور اپنے اپنے خداؤں کو یاد کر رہے تھے۔ کسی ڈاکٹر یا نرس کا پتہ نہیں تھا۔ اُنھوں نے ایک بار پھر اپنے موبائیل کو ہاتھوں میں اُٹھایا اور اُسے چیک کرنے لگے کہیں یہ سائلنٹ موڈ Silent mood پر تو نہیں چلا گیا، لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اُنھوں نے پھر ایک بار اُسے تکیے کے پاس رکھ دیا۔ اُن کا ذہن پھر ایک بار سوچنے لگا تھا اور کیسی کیسی تصویریں سامنے گردش کرنے لگی تھیں۔ جن میں بیٹوں کے ساتھ ہی ساتھ عزیز و اقارب، دوست احباب، ملنے جلنے والے، کاروباری رابطہ رکھنے والے، گاہک، مسجد میں ساتھ نمازیں پڑھنے والے ساتھی، اُن کی دکان اور گھریلو ملازم اُن کا اپنا بھرا پورا گھر دونوں بیٹے، بہوئیں، تین پوتیاں ایک پوتا گھر کے سامنے بڑا سا لوکھنڈی دروازہ اور اُس کے سلاخوں کے گیپ سے جھانکتا ہوا ٹائیگر، جس کی زبان جبڑے سے باہر نکلی ہوئی رہتی تھی۔ اُن سب میں ایک ٹائیگر ہی تو تھا جس سے اُنھیں سخت نفرت تھی۔ جس وقت ایک پلّے کی صورت اُسے اُن کے بیٹے نے گھر میں لایا تھا تو وہ اُسی وقت سخت برہم ہو گئے تھے کہ اس نجس جانور کو کیوں لایا ہے۔ یہ گھر میں رہے گا تو فرشتے گھر میں نہیں آئیں گے۔ کتے کے پلے نے اُنھیں محبت بھری نظروں سے دیکھا تھا، اسے واپس کر دے۔ اُنھوں نے اُس کی محبت بھری نظروں سے اپنی نظریں ہٹا کر بیٹے کی طرف دیکھا تھا تو اُنھیں جواب ملا تھا، یہ گھر میں نہیں گیٹ کے پاس ہی رہے گا۔

منیر الدین صوم وصلواۃ کے پابند، نہایت ہمدرد اور شریف انسان تھے۔ اونچا پورا قد صحت مند جسم، اُن کے چہرے پر شرعی داڑھی، اور لبوں پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی، نہایت خوش مزاج طبیعت، لمبا سفید کرتا ٹخنوں سے اوپر پاجامہ۔ سر پر دو پلی ٹوپی، گھر سے دکان پر جانے کے لیے جب بھی وہ ورانڈے میں آتے کتا دم ہلاتے ہوئے اُن کی طرف دوڑتا ہوا آتا اور وہ اُسے جھڑک دیتے اور وہ زمین پر بیٹھ کر دم ہلانے لگتا تھا اور وہ بے نیازی سے پھاٹک کھول کر جیسے ہی باہر نکلتے۔ آداب سلام کا سلسلہ شروع ہو جاتا اور وہ تیز تیز قدم اُٹھانے لگتے۔ قریب ہی اُن کی کرانے کی بڑی سی دکان تھی، جس پر گاہکوں کا ہمیشہ رش رہتا تھا۔

''یہ انڈہ کھالو۔۔۔'' اُن کے سامنے پورے حفاظتی ڈریس میں ملبوس نرس کھڑی تھی اور انڈے کی پلیٹ اُن کے بیڈ پر رکھ دی گئی تھی۔ اُنھوں نے نرس کی طرف دیکھا تو وہ بولی، ''اس کے بعد یہ گولیاں کھالینا۔ دستانہ پہنے ہوئے ہاتھ سے گولیاں اُن کی ہتھیلی پر گریں اور دوسرے ہی لمحے نرس اگلے بیڈ کی طرف بڑھ گئی۔

اب دن بھر کوئی نہیں آئے گا اور میرے کان انسانی آواز سننے کے لیے ترس جائیں گے۔ اُنھوں نے اپنے آپ سے کہا تھا اور طنزیہ نظروں سے پلیٹ کی طرف دیکھا تھا۔

ملک میں کورونا کی وبا تیزی سے پھیل رہی تھی۔ حکومت نے گھروں میں رہنے کی تاکید کی تھی۔ ابتداء میں لوگوں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ بازار اور سڑکوں پر وہی رش تھا لیکن جب لوگ مرنے لگے اور حکومت نے مکمل لاک ڈاؤن لاگو کر دیا۔ سارے کاروبار بند ہو گئے۔ ٹرینوں کی آمد و رفت رُک گئی۔ بسیں اپنے اپنے ڈپوز میں جمع ہو گئیں۔ آٹو اور کرائے پر چلنے والی کاریں بند ہو گئیں۔ کارخانوں کی چمنیوں سے نکلنے والا دھواں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ مزدور بے روزگار ہو گئے۔ ہاتھ گاڑیوں پر سبزی ترکاری، پھل، ضروریاتِ زندگی کا سامان اور بچوں کے کھلونے بیچنے والے گھروں میں قید ہو گئے تو بھوک محنت کے ہاتھوں سے بھیک پر اُتر آئی۔ فاقوں سے لوگ تڑپنے لگے تو ایسے میں خیر خضرات بشکل حاتم طائی کے سامنے آئے، جنھیں سات سوالوں کے بجائے ایک ہی سوال حل کرنا تھا، یعنی زندہ رہنے کے اسباب تھیلوں میں بھر کر غریب اور مفلس افراد کے گھروں تک پہنچانا تھا۔ وہ بھی ایسے حالات میں جبکہ موت اُن سے تین گز کے فاصلے پر جال لیے کھڑی تھی۔ سڑکوں پر پولیس گشت کر رہی تھی اور جو بھی اشیائے ضروریہ کی خاطر باہر نکلتا اُس کی کمر اور پنڈلیوں پر پولیس کے ڈنڈے برسنے لگے تھے۔ اخبارات، ریڈیو، ٹیلی وژن کے چینلوں اور سوشیل میڈیا پر اس وباء کی بھیانک اطلائیں تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔ حتیٰ کہ موبائیل پر نمبر ڈائل کرتے ہی کورونا مرض کی شدت

''چہارسُو''

اور اُس کی احتیاطی تدابیر پہلے سننے کو ملتی تھی۔ پورے ملک پر ایک خوف مسلط ہو گیا تھا۔ زندگی معطل ہو گئی تھی اور موت کے پنجے دراز ہو گئے تھے۔ ان ایام میں منیر الدین اور اُن کے بیٹے بھی غریب رشتہ داروں اور بے بس افراد کی مدد کے لیے پیش پیش تھے۔ وہ محلّہ محلّہ ضروریات زندگی کا سامان پہنچا رہے تھے۔

اسپتال کی رات پر خوف کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ منیر الدین جب بھی آنکھیں بند کرتے قبرستان کا اندھیرا اُن کی آنکھوں میں در آتا اور وہ گھبرا کر آنکھیں کھول دیتے۔ اُن کے دماغ میں توبہ و استغفار کا ورد شروع ہو جاتا۔ کبھی وہ اُٹھ بیٹھتے، کبھی اُن کا دل ٹہلنے کو کرتا۔ اُنھوں نے سامنے نظریں دوڑائیں، وارڈ میں نئے مریضوں کی بھی حالت وہی تھی جو منیر الدین کی تھی لیکن کسی میں ہمت نہیں تھی کہ ایک دوسرے کے قریب جاتے یا آپس میں گفتگو کرتے۔ سبھی ڈرے سہمے لیٹے ہوئے تھے۔ اچانک کچھ مریضوں نے بیڈ پر ہاتھ پیر پٹخنا شروع کر دیا۔ اُن کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکلنا شروع ہو گئیں، گویا کوئی جانور کو ذبح کر رہا ہو، اور اسپتال کا سناٹا بے حد ڈراؤنا ہو گیا۔ منیر الدین نے جو یہ منظر دیکھا تو اول تو وہ بھی گھبرا گئے لیکن پھر فوراً وارڈ سے باہر نکلے اور جیسے ہی کوری ڈور میں اُن کی نظر نرس پر پڑی اُنھوں نے گھبرائی ہوئی آواز میں بنا سانس لیے مریضوں کی کیفیت بیان کر دی۔ نرس نے نہایت اطمینان سے گردن ہلائی جیسے اُس کے لیے یہ روز کا معمول تھا۔ وہ ڈاکٹر کو بلانے کے لیے چل پڑی اور وہ وارڈ میں واپس آ گئے۔ تمام مریضوں پر گھبراہٹ طاری تھی لیکن وہ خوف زدہ نظروں سے تڑپتے ہوئے مریضوں کو دیکھ رہے تھے۔ وارڈ پر موت کا سایہ اُتر چکا تھا۔ کچھ ہی لمحوں میں ڈاکٹر اور اُن کا ماتحت عملہ آ چکا تھا اسٹریچر پہنچ گئے تھے اور اُن تڑپتے ہوئے مریضوں کو آئی سی یو وارڈ میں منتقل کرنا شروع ہو چکا تھا۔

رات پل پل گزر رہی تھی۔ سارے ہی مریضوں کی نیندیں اُڑ چکی تھی۔ سبھی اپنے اپنے عقیدوں کے مطابق دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہے تھے۔ وارڈ پر مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دیوار پر آویزاں گھڑی ٹک ٹک ٹک کی آوازوں میں اپنا سفر طے کر رہی تھی اور اُس کے نیچے دیوار پر سر کے بل چپکی ہوئی چھپکلی منہ پھاڑے اپنے شکار کی منتظر تھی کہ کب وہ غافل ہوتا ہے اور وہ اُس پر جھپٹتی ہے۔ کھڑکیوں کے باہر اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ دور کھڑا ہوا لیمپ پوسٹ کسی عذاب الٰہی کے عتاب سے رد کی ہوئی دعا کے مانند سر جھکائے چپ چاپ کھڑا تھا۔ دور کہیں کسی پیڑ کی ڈالی پر بیٹھا اُلّو وو وو کی تکرار سے ماحول کو اور بھی ڈراؤنا بنا رہا تھا۔ رات کاٹے نہ کٹتی تھی۔ اچانک اسٹریچر کی آواز نے وارڈ میں لیٹے ہوئے مریضوں میں گھبراہٹ سی پیدا کر دی۔ وارڈ بوائے اُسے ڈھکیلتے ہوئے اندر کی جانب لا رہے تھے۔ جوں جوں وہ قریب ہوتے جا رہے تھے مریضوں کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں اور آخر اُنھوں نے دیکھا پلاسٹک میں لپٹی ہوئی لاش کو اُنھوں نے ایک خالی بیڈ پر ڈال دیا اور پھر اسٹریچر کو ڈھکیلتے ہوئے جس طرح آئے تھے واپس ہو گئے تھے۔

سارے ہی مریض اپنے اپنے بیڈ پر دم سادھے اُٹھ کر بیٹھ گئے تھے اور یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ مرنے والا کون تھا۔ لیکن اُن میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اُس کے بارے میں کوئی بات ہی کرتے۔ بس ایک اُداس خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ٹھیک اُسی وقت قریب کی مسجد سے فجر کی اذان کی آواز اُبھری اور منیر الدین کو اپنا ٹائیگر یاد آ گیا جو ہر روز فجر کی اذان سے کچھ پہلے زور زور سے بھونکتا تھا اور اُنھیں اُس پر غصہ آتا تھا کہ کم بخت صبح کی اذان سے پہلے اپنی آواز سناتا ہے۔ وہ باہر نکل کر اُسے ڈانٹتے تھے لیکن آج وہ خود اذان کے بعد اُس کی آواز کو یاد کر رہے تھے۔ اُنھیں سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ بھونک بھونک کر اُنھیں نماز کے لیے بیدار کرتا تھا۔ بے اختیار اُن کی نفرت محبت میں تبدیل ہو گئی تھی اور اُن کا دل چاہ رہا تھا کہ کاش وہ اس وقت اُن کے سامنے ہوتا تو وہ اُسے اپنے سینے سے لپٹا کر خوب خوب پیار کرتے۔۔۔ اذان ہو چکی تھی لیکن مسجد کے دروازے اُن پر بند تھے۔ ساری عمر باجماعت نمازیں پڑھنے والا اپنی عمر کے آخری پڑاؤ میں جبکہ موت تین گز کے فاصلے پر ہو، وہ بارگاہِ الٰہی میں معافی مانگنے کے لیے بھی نہیں آ سکتا، ایسا اُصول تو کسی جابر بادشاہ کے دربار کا بھی نہیں تھا۔ اُنھوں نے اپنے دل ہی دل میں کہا، تب کسی نے اُن کے کان میں کہا، تمہاری مسجدیں تو مانند موبائیل ہیں جو تمہاری عبادتیں اور دعائیں اُس تک پہنچاتی ہیں، ہوش کے ناخن لو اب تو خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کے دروازے بھی تم پر بند ہیں۔ بے اختیار اُن کی آنکھوں میں آنسوں رولنے لگے، وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتے تھے لیکن رو نہ سکے۔ شاید یہ بھی اُسی کی مرضی تھی۔

نماز سے فراغت پا کر بھی وہ اُداس تھے۔ ذہن ایسے ہی بے شمار سوالوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ اُنھوں نے اپنے سامنے دیکھا، کوئی رام نام جپ رہا تھا، کوئی اپنے سینے پر اُنگلی سے صلیب کا نشان بنا رہا تھا لیکن اطمینان کسی کے چہرے پر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اُنھوں نے پھر ایک بار اپنی گردن گھٹنوں میں ڈال دی، اور اُن کی آنکھیں اُن کے اپنے گھر میں کھل گئیں۔ کیسا محبتوں سے بھرا ہوا گھر تھا۔

'' بابا جان ناشتہ تیار ہے۔'' بڑی بہو نے اطلاع دی، '' آج مسجد ہی میں آپ کو دیر ہو گئی۔''

'' ہاں۔۔۔'' پیڑھ پر سے پوتے کو نیچے اُتارتے ہوئے اُنھوں نے کہا، '' چلیں۔۔۔''

کچن میں ڈائینگ ٹیبل پر چھوٹی بہو رکابیاں لگا رہی تھیں اور دونوں بیٹے اور پوتیاں اُن کے منتظر تھے۔ وہ جیسے ہی کرسی پر بیٹھے اور پہلا لقمہ منہ میں ڈالا، اُن کی نظر کمان سے ہوتی ہوئی وراںڈے کے نیچے کھڑے ہوئے ٹائیگر پر پڑی۔ اُن کے چہرے کے تاثرات بدل گئے اور اُنھوں نے بڑے بیٹے کی طرف دیکھا، '' کتنی بار کہا ہے کہ اُسے باندھ کر رکھا کرو، لیکن تم کو یاد ہی نہیں رہتا۔''

'' جی۔۔۔'' اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

ٹائیگر للچائی نظروں سے سب کی طرف دیکھ رہا تھا، لیکن کس میں ہمت تھی جو اُس کی طرف ایک ہڈی ہی اُچھال دیتا۔ سب کھانے میں مگن تھے۔ بڑی بہو نے کوفتوں کی پلیٹ اُنکی طرف بڑھائی اور چھوٹے بیٹے نے دال کا کٹورہ جونہی اپنی طرف کھینچا، ہاتھ ٹکرا گئے اور ایک کوفتہ ٹیبل پر گر گیا۔ اُنھوں نے اُسے اُٹھایا اور ٹائیگر کی جانب اُچھال دیا۔ ٹائیگر نے اُچک کر اُسے منہ میں جھیل لیا

''چہارسُو''

اورنہایت ممنونیت بھری نظروں سے منیرالدین کی طرف دیکھا،'' بابا جان آج آپ نے ۔۔۔۔۔'' بڑا بیٹا اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔ یہ واقعی پہلا اتفاق تھا کہ اُنھوں نے کوئی چیز اپنے ہاتھوں سے ٹائیگر کی طرف اُچھالی تھی۔ اُن کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور ٹائیگر اُسے منہ میں سنبھالے گیٹ کی طرف چلا گیا تھا۔

ہم سب ایک دوسرے کا کتنا خیال رکھتے تھے۔ کھانا سب ملکر ایک ساتھ ہی کھاتے تھے۔ اکثر ڈائینگ ٹیبل پر ہی کاروباری، نجی گفتگو بھی ہوجاتی۔ مختلف مسلے مسائل بھی حل ہوجاتے۔ سب ہی ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھتے تھے۔ ایک بار میرا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا تو سب بے حد پریشان ہوگئے تھے۔ میرے دونوں بیٹوں نے ہی مجھے اسپتال میں پہنچایا تھا۔ تب میری خیریت دریافت کرنے کے لیے سارا خاندان ہی پہنچ گیا تھا اور میرے بیٹوں نے میری اس قدر خدمت کی تھی کہ گھر کا راستہ ہی بھول گئے تھے، لیکن اس بار بیماری کا علم ہوتے ہی سب کس تیزی سے مجھ سے دور بھاگے تھے اور مجھے اسپتال ایمبولینس گاڑی اس طرح لے کر آئی تھی جیسے کسی عادی گناہ گار کو پولیس اپنی گاڑی میں لاد کر لے جاتی ہے۔ منیرالدین کی آنکھوں میں اچانک وہ سارا منظر بھی اُبھر آیا اُنھیں گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی اور اُنھوں نے گھٹنوں سے اپنی گردن اوپر اُٹھالی۔

'' اس لاش کے اتم کریا کرم کے واسطے تم دیکھنا اس کا کوئی وارث نہیں آئے گا۔'' دیوار سے ٹیک لگائے سب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک مریض نے کہا۔ اُس کی آواز گہرے دکھ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

سب نے سامنے کے بیڈ پر پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھا۔

'' ایسا نہیں ہے۔ میں ایک ہفتے سے اسی دواخانے میں ہوں۔ کوئی کوئی آتے بھی ہیں۔''

منیرالدین پوری توجہ کے ساتھ اُن کی باتیں سن رہے تھے۔

سامنے کے مریض نے چھت کی طرف گھورتے ہوئے کہنا شروع کیا،'' وہ بھی کیا کریں گے۔۔۔'' اُس نے منیرالدین کی طرف دیکھا،'' اِدھر آنے کا مطلب موت کو گلے لگانا ہی تو ہے۔''

'' اور کیا۔۔۔'' ایک آواز اُبھری،'' یہ اُس وقت کی بات ہے جب میں پازیٹیو نہیں ہوا تھا۔ ہمارے محلے میں ایک ماں نے بیٹے کو باپ کے مردے کو گھر میں لانے سے منع کر دیا تھا۔۔۔'' اُس نے ایک سرد آہ بھری،'' اب کاہے کی نماز جنازہ اور۔۔۔'' وہ ایک دم خاموش ہوگیا اور اُس کی گردن جھک گئی۔ بس اُس کے آنسو گر رہے تھے۔

منیرالدین نے پھر ایک بار اپنی گردن کو گھٹنوں میں ڈال دیا تھا۔ اے اللہ یہ کیسی نفسانفسی کے دن تو دکھا رہا ہے۔ کوئی کسی کا پُرسان حال نہیں ہے۔ کیا دنیا سے ہمدردی، خلوص اور محبت کے جذبے ختم ہوگئے؟ لوگ تو پہلے بھی بیمار ہوتے تھے۔ مرتے بھی تھے۔ مگر غم بانٹے بھی جاتے تھے۔ اب تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہر دن حشر کا دن ہے۔

پتہ نہیں وہ کب تک اور کیا کیا سوچتے رہے۔

سارے ملک میں وباء کا زور بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ حکومت بار بار لاک ڈاؤن پر عمل کروا رہی تھی۔ بھوک، بے روزگاری اور بے وطنی ایک مسلہ بنی ہوئی تھی۔ اسکول کالجس بند کر دیئے گئے تھے۔ چاروں طرف وہی خوف اور بے بسی کا عالم تھا۔

منیرالدین خاموش تماشائی ہو کر رہ گئے تھے۔ اُن کا موبائیل بھی اُنھیں بس حسرت سے ہی تکا کرتا تھا۔ کئی دنوں سے اُنھوں نے اُس کا استعمال بھی چھوڑ دیا تھا۔ اسپتال کے روز و شب ایسے ہی گزر رہے تھے۔ ہر دن نئے نئے مریض داخل ہوتے۔ اکثر مریضوں کی حالت نازک ہوجاتی۔ اُنھیں آئی سی یو میں داخل کیا جاتا۔ اُن میں کچھ شفایاب ہوجاتے اور کچھ موت کے حوالے ہوجاتے۔ کبھی ورثا آجاتے اور کبھی لاشوں کو اسپتال کے افراد ہی ٹھکانے لگا دیتے۔ بقیہ مریضوں کے ٹیسٹ بھی جاری تھے۔ جن کی رپورٹ نگیٹیو آجاتی وہ خوشی خوشی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے تھے۔

منیرالدین حسب معمول اپنے بیڈ پر لیٹے ہوئے تھے۔ وارڈ میں کچھ نئے مریض داخل کیے گئے تھے۔ اُن کے چہروں پر خوف اور مایوسی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اُنھوں نے اُن کی طرف سے اپنی نظریں پھیر لی تھی اور جونہی دیوار کی طرف دیکھا، دیوار گھڑی بند ہوگئی تھی۔ اُنھوں نے اُس چھپکلی کو تلاش کرنا شروع کیا لیکن اُس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ کیا وہ بھی گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ ہی اپنا شکار کرتی تھی؟ اُنھوں نے اپنی آنکھیں سامنے کیں تو ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں وارڈ میں داخل ہوئے۔ اُنھوں نے وہاں پر موجود مریضوں کی طرف نظریں دوڑائیں کہ یہ اب کس کے لیے آئے ہیں لیکن ڈاکٹر کا رخ اُن کی طرف ہی تھا، وہ سب تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اُن ہی کی طرف آرہے تھے۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر نے قریب پہنچ کر اپنا دستانے والا ہاتھ اُن کے کندھے پر رکھا،'' مسٹر منیر الدین تمہارے کل کے ٹیسٹ کی رپورٹ آگئی ہے۔ اُنھوں نے ڈاکٹر کی طرف اطمینان بھری نظروں سے دیکھا،'' ڈاکٹر اب مجھے کسی رپورٹ سے ڈر نہیں لگتا، میں جان گیا ہوں مجھے یہاں سے کہاں جانا ہے۔''

'' اوہ نو۔۔۔ مبارک ہو۔ تمہاری رپورٹ نگیٹیو آگئی ہے۔ یہ رہا تمہارا سرٹیفکٹ۔ اب تم اپنے گھر جا سکتے ہو۔''

اپنے سرٹیفکٹ کو ہاتھوں میں تھامے وہ ڈاکٹر کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اُن پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔ ڈاکٹر نے اُن سے کیا کچھ کہا، اُنھوں نے سنا ہی نہیں تھا۔ ایک دم اُن کو اپنے بچوں کا خیال آیا، اُن کی پازیٹیو رپورٹ آنے کے بعد تو اُنھوں نے اُن کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا کہ اُن کا بھی تو ٹیسٹ کیا گیا ہوگا؟ کیا پتہ اُن کی رپورٹ کیسی آئی ہوگی؟ وہ بھی کسی اسپتال میں بھرتی کیے گئے یا پھر۔۔۔۔ وہ سر سے پیر تک کانپ گئے تھے۔ شاید اسی لیے اُن کی کوئی کال مجھ تک نہیں پہنچی تھی۔ اُنھوں نے موبائیل کو آن کیا، لیکن اُن کا نمبر ڈائل کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اُنھوں نے موبائیل کو اپنے جیب میں رکھ لیا اور بے دلی کے ساتھ وارڈ سے باہر نکل گئے۔

کچھ باتیں، یادیں اور توقعات

حمایت علی شاعر

(●)

نورالحسنین، میرا ماموں زاد بھائی ہے اور مجھ سے عمر میں بہت چھوٹا ہے۔ وہ پالنے میں ہمک رہا تھا جب میں نے اورنگ آباد چھوڑ دیا تھا اور کراچی آ گیا۔۔۔ یہ 1951 کی بات ہے۔ اپنے نامساعد حالات کے سبب برسوں میں ہندوستان جانہ سکا۔ بس خط و کتابت کے باعث وہاں کی خیریتوں سے آگاہ رہتا۔ کبھی کبھی جاتا بھی تو سب بچوں کو کھیلتا اور بڑا ہوتا دیکھتا اور خوش ہو کر آ جاتا۔۔۔ کئی سال گذر گئے ایک بار اپنی بیگم کے ساتھ گیا تو سبھی کو ماشاءاللہ نوجوان دیکھا اور سبھی کو کچھ نہ کچھ بننے کی آرزو میں پایا۔ سبھی تعلیم یافتہ تھے۔۔۔ میرا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔ میری طرح سبھی نے اپنے والدین کی آرزو پوری کر دی تھی۔

اُن سب میں نورالحسنین مجھے سب سے مختلف نظر آیا۔ وہ آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھا اور بحیثیت افسانہ نگار اپنی ایک پہچان بناتا جا رہا تھا۔ فطرتاً میرا جھکاؤ اُس کی طرف بڑھ گیا۔ میں دل ہی دل میں اُسے اپنے سے بہت قریب محسوس کرنے لگا۔

علم اور ادب کا شوق میرے اور بھائیوں میں بھی ہے لیکن ایک مسلسل اور مربوط لگاؤ۔۔۔ جو نورالحسنین کو بے قرار رکھتا ہے وہ دوسروں میں کم کم ہے۔ کچھ ہی برسوں میں اُس کے افسانوں کے مجموعے بھی شائع ہو گئے۔ ''سمٹتے دائرے، مور رقص اور تماشائی، اور 'گڑھی میں اُترتی شام'' پھر اُس کے خاکوں کا مجموعہ'' خوش بیانیاں'' جس میں اُس نے میری تصویر بھی کھینچی ہے۔ مجھے یہ تو اندازہ تھا کہ وہ مجھے اپنا'' آئیڈیل'' سمجھتا ہے۔ مگر۔۔۔ میں نے چونکہ اپنے گھرانے میں، سب سے پہلے غلط روی اختیار کی تھی اس لیے میری طرف اُس کا کھینچاؤ غیر معمولی محسوس نہیں ہوا، لیکن، میں کبھی کبھی ایک گناہ گار کی طرح اپنے آپ سے شرمندہ بھی رہتا۔

خدا جانے اُس کے والدین اُسے کیا بنانا چاہتے ہوں، ہمارا گھرانہ، مولویوں، جاگیرداروں اور زمینداروں کا گھرانہ ہے۔ کچھ بزرگ فوج، پولس اور دوسرے محکموں میں ملازمتیں بھی کرتے رہے۔ اس لیے شہر میں معزز، اور ''بڑے آدمی'' سمجھے جاتے رہے۔ میں ایک بگڑا ہوا، آوارہ نوجوان تھا۔ اسی لیے بہت جلد اورنگ آباد چھوڑ بیٹھا اور پھر ملک ہی سے نکل آیا، اور اب ''ایک اور مثال'' قائم ہو چکی تھی۔ مگر اُس وقت تک شاید گھر کے تاریک گوشوں میں تھوڑی بہت روشنی آ چکی تھی۔ نورالحسنین سے اُس کے ہم عمر بھی متاثر تھے اور اُس کی طرف رشک بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔ اِس عمر میں مجھے ایسی نگاہیں نصیب نہیں ہوئی تھیں بلکہ میرے ہم عمر مجھ سے دور ہی رہتے تھے۔ سگریٹ پینے اور ہوٹلوں میں بیٹھنے کی وجہ سے میری ''آوارگی'' مُسلّم'' ہو چکی تھی لیکن میرے برعکس نورالحسنین ایک قابلِ تقلید نوجوان تھا۔ اُس کی شرارتیں، اُس کی حاضر جوابی، خاندان میں اُس کے ہم عمر فخریہ طور پر ایک دوسرے سے بیان کرتے، اُس کا ڈراموں میں کام کرنا سب کو پسند تھا۔

نورالحسنین کے افسانوں نے اُس کی شخصیت کے خدوخال تو اُبھار ہی دیئے تھے، مگر میں شاعری کے میدان میں ''غزل گو'' شعراء کا حشر دیکھ کر خوف زدہ رہتا تھا، کبھی کبھی نورالحسنین کے بارے میں بھی میرے دل میں یہ خدشات اُبھرنے لگتے وہ'' افسانہ نگاری'' کر رہا تھا۔ اردو میں ان دونوں اصناف میں لکھنے والوں کی کمی نہیں۔ ہر لکھنے والا اِن ہی اصناف سے مشق شروع کرتا ہے۔ اور پھر ان ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ غزل گو شعراء کو'' مشاعرہ '' خراب کرتا ہے اور افسانہ نگاروں کو'' رسائل'' ۔۔۔ مختصر ہونے کے سبب سبھی رسائل غزلوں اور افسانوں سے بھرے نظر آتے ہیں۔ ادب میں ''تسکین قلب'' کے یہ وسیلے اُس اضطراب کو ختم کر دیتے ہیں جو کسی بڑی تخلیق کا ضامن ہوتا ہے۔ غزل میں جتنی بڑی شاعری ممکن تھی۔۔۔ غالبؔ تک ہو چکی۔ اب اس صنف میں نئے امکانات کی گنجائش بہت ہی کم ہے۔ اب تو جتنے بڑے غزل گو آ رہے ہیں وہ سب میرؔ، نظیرؔ اور غالبؔ ہی کی بازگشت نظر آتے ہیں۔ ہاں، نظم نگاری میں بہت امکانات ہیں۔ یہی حال ناول، افسانے اور ڈرامے کا ہے۔

جہاں تک نورالحسنین کی افسانہ نگاری کا تعلق ہے وہ اوروں سے مختلف نظر آتا ہے۔ مگر اُسے ابھی وہ پذیرائی نہیں ملی جس کا اُسے حق ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کے سیاسی حالات کے سبب اُس کی آواز یہاں بھی نہیں پہنچ سکی۔ بس مخصوص حلقے اُس کے ہنر کے معترف ہیں۔ ناقدین ادب بھی ''حلقہ'' بندی کے شکار ہیں۔ ایسے قدرداں بہت کم ہیں جو مفادات سے بے نیاز ہوں۔ یہ المیہ دونوں ممالک کا ہے اور آج اُردو۔۔۔ چونکہ زوال پذیر معاشرے کی ترجمان ہے اس لیے اُس کے لکھنے والے اور بولنے والوں میں'' آزادی کے بعد'' بھی معاشرتی بُرائیاں جگہ جگہ نظر آتی ہیں، حسد، تنگ نظری، حلقہ بندی، خود پسندی اور اس قسم کی دوسری بدعتیں جتنی اردو والوں میں ہیں، دوسری زبانوں کے ادیبوں میں شاید اتنی نہ ہوں گی۔

میں نورالحسنین کے افسانے پڑھ کر اکثر یہ سوچتا تھا کہ یہ نوجوان کوئی بڑا کام بھی کر سکتا ہے۔ اُردو میں بڑا ناول یا بڑا ڈرامہ بہت کم ہے۔ میں سوچتا کہ دنیا کی مختلف زبانوں کے بڑے ناولوں اور ڈراموں کو نظر میں رکھتے ہوئے ہمارے لکھنے والوں کے دل میں یہ آرزو کیوں پیدا نہیں ہوتی؟ ''آگ کا دریا'' اور ''اُداس نسلیں'' وغیرہ نے جو شہرت اور عزت حاصل کی ہے۔۔۔ ایسی دوسرے ناول بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ کب اس طرف راغب ہونگے۔ ہندوستان اور پاکستان میں موضوعات کی بھی کمی نہیں ہے۔

''چہارسُو''

کچھ برس پہلے جب میں ہندوستان گیا تھا تو اردو میں علاقائی زبانوں کے فکشن اور شاعری کے تراجم اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ان میں خصوصاً ملیالم، تامل، تیلگو اور مراٹھی زبان کے ناولوں نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ بنگالی، پنجابی اور گجراتی ناول تو پاکستان میں بھی دستیاب ہیں۔مگر دوسری زبانوں کی تحریریں یہاں نہیں ملتیں۔ان علاقائی زبانوں کی تخلیقیت کو پڑھ کر مجھے بھی اُن کی عظمت کا پہلی بار احساس ہوا تھا۔

میں نے زبانی طور پر، ان خیالات کا اظہار اپنے ہندوستانی بھائیوں سے بھی اکثر کیا ہے۔شاید نورالحسنین سے بھی کہہ چکا ہوں۔نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ نورالحسنین ایسا کام ضرور کرے گا۔کچھ مہینے قبل میرے بھائی عنایت علی نے اپنی مرتب کردہ کتابوں، ''مٹی میرے دیار کی'' (مراٹھواڑہ کا سو سالہ افسانوں کا ادب) ''دامن یوسف'' (مشہور مزاح نگار یوسف ناظم کی شخصیت اور فن) اور'' یادِ وجد'' (سکندر علی وجد کی شخصیت اور فن) کے ساتھ نورالحسنین کا ایک مختصر سا ناول'' آہنکار'' بھی مجھے بھیجا۔۔۔اس کتاب کے ملتے ہی میں اسے پڑھنے بیٹھ گیا۔اور پھر(تھوڑے وقفے کے بعد) دوبارہ اسے پڑھا۔دوسری بار پڑھتے ہوئے میں نے یہ بات بھی نظر میں رکھی کہ یہ نوجوان اس فن سے کس قدر آگاہ اور اپنی تخلیق میں کتنا منفرد ہے؟

اب میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر نورالحسنین ارادہ کرلے تو ایک بڑا ناول بھی لکھ سکتا ہے۔'' آہنکار'' میں اُس نے کردار نگاری کا ہنر دکھایا ہے اور جن نفسیاتی عوامل اور اس سے متعلقہ گوشوں پر نظر رکھی ہے۔وہ اُس کی باریک بینی کی دلیل ہے۔۔۔پھر ایک خاص بات جو بہت کم ناولوں نظر آتی ہے۔۔۔وہ اُس کا بولتا ہوا منظر نامہ ہے۔اُس نے منظر نامے کو بھی جگہ جگہ'' کردار'' بنایا ہے۔منظر کی وہ تمام جزئیات، جن سے اُس کی دلکشی عبارت ہوتی ہے۔کہانی کی داخلی حقیقتوں کے ترجمان بن کر زندگی کی معنویت کو وسعت عطا کرتے ہیں، اور ناول کے کرداروں کو'' زندہ انسانوں'' کی صف میں پہنچا دیتے ہیں۔وہ قاری کو یہ سوچنے پر مجبور کردیتے ہیں کہ ناول نگار کتنی گہری نظر رکھتا ہے۔'' انسان'' کے بارے میں اُس کی آگہی کتنی تہہ دار اور بلیغ ہے۔

میں یہ تو نہیں کہتا کہ یہ ناول کوئی سقم نہیں رکھتا، کہیں کسی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔۔۔چند مقامات ہیں۔مجھے یہ بھی احساس ہوا، مگر کہانی کے تجسس اور بنیادی کرداروں کی خوبیوں کے سبب یہ سوچ کر آگے بڑھ گیا کہ یہ نورالحسنین کا پہلا ناول ہے ۔ جزوی باتوں پر نہیں سوچنا چاہیے۔خوب سے خوب تر کی منزلیں بہت آگے ہوتی ہیں۔آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔اور اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اُس کا نیا ناول کب اُئے گا۔

اورنگ آباد میں ایک بار تاریخی موضوعات پر گفتگو ہوئی تو میں نے کہا تھا کہ اپنے شہر کا تو میں بھی گناہ گار ہوں۔اورنگ آباد خود ایک بڑا موضوع ہے۔ اس کا پہلا نام'' کھڑکی'' تھا، بعد میں ملک عنبر کے بیٹے فتح خان کے نام پر'' فتح نگر'' ہوا، اور پھر اورنگ زیب اس شہر کا مقدر بن گیا۔کاش اس کا نام ولی اور سراج کے نام پر ہوتا، یا اُن صوفیائے کرام کے نام پر ہوتا جو خلد آباد اور اورنگ آباد میں محوِ آرام ہیں۔اس پر کسی اہلِ محفل نے کہا تھا کہ اورنگ زیب بھی بہت مذہبی آدمی تھا۔ میں نے کہا کہ اگر ایسا ہوتا تو وہ تخت وتاج چھوڑ دیتا اور اپنے ملک میں بادشاہت کی بجائے'' خلافت'' رائج کردیتا۔اور ایک غیر اسلامی سیاست کی روایت کو جاری نہ رکھتا۔(خلافت ۔۔۔ بادشاہت کے خلاف اسلام کا ایک انقلابی کارنامہ تھا اور جمہوریت کی طرف پہلا قدم) مگر چودہ سو سال میں یہ توفیق کسی مسلمان بادشاہ کو نہ ہوئی۔کیا اس موضوع میں کسی بڑے ناول کے امکانات نہیں ہیں، یہ بڑی باتیں چھوڑیئے، ہماری دکنی زبان جو اُن دنوں ہمارے ادب اور تہذیب کی نمائندہ تھی۔۔۔تقریباً ختم ہوگئی۔اور اُس کی جگہ فارسی سرکاری زبان قرار پائی، اور ہمارے ادب میں فارسی اصناف داخل ہوگئیں۔ سیاست کے حوالے سے تجزیہ کیا جائے تو شیواجی مہاراج اور شمالی ہند میں خوشحال خان خٹک کی بغاوتیں اُس وقت کے ہندوستان کا آئینہ دکھاتی ہیں جب یہاں کے مختلف قومیں اپنی اپنی حدود میں خود آگہی سے سرشار ہورہی تھیں اور سیاسی طور پر بیدار ہوچکی تھیں۔ان موضوعات پر بھی ناول لکھا جاسکتا ہے۔ خود اورنگ زیب کی محبوبہ زین آبادی کی داستان بھی قابل مطالعہ ہے۔دکن اور ہندوستان کی تاریخ میں ایسے کئی موضوعات ہیں جن پر ناول لکھے جاسکتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ نورالحسنین کوئی نہ کوئی ایسا ادبی، تاریخی ناول ضرور لکھے گا جو تاریخ ادب میں بے مثال ہوگا۔

اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے۔

دیر آید درست آید

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

چہارسو گاہے گاہے نظر سے گزرتا رہتا ہے۔فکری اعتبار سے ادبی رسائل میں اپنے انفرادی تشخص کے ساتھ چہارسو کا سفر قابل تحسین ہے۔کچھ عرصے پہلے ہندوستان کے اہم ادیب سلیم شہزاد پر گوشہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی۔تازہ شمارے میں پاکستان میں ادب وتنقید کے معتبر حوالے مبین مرزا پر ایک بھرپور گوشہ آپ کی ادارتی صلاحیتوں اور سنجیدہ و باوقار اہل علم کی پزیرائی کے جذبے کو نمایاں کرتا ہے۔ باکمال اور صاحب الرائے اہل قلم سے مبین مرزا کی ادبی زندگی اور افکار پر عمدہ مضامین لکھوانے پر آپ مبارک باد کے حق دار ہیں۔آپ کی توفیقات میں مزید اضافوں کے ساتھ چہارسو کی ترقی کے لئے بھی دعا گو ہوں۔

صبیح رحمانی (کراچی)

''فقط بیان تک''

سلام بن رزاق
(ممبئی)

نورالحسنین معاصر اُردو افسانے کا ایک معتبر نام ہے۔ ۱۹۸۰ء کے بعد اہم لکھنے والوں میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔ اُنھوں نے ترقی پسند افسانے کی نظریہ سازی اور جدید افسانے کی چیستاں طرازی سے حتی المقدور اپنے افسانوں کو پاک رکھا ہے۔ البتہ ترقی پسندی اور جدیدیت کے صحت مند رُجحانات اور میلانات سے کسبِ فیض ضرور کیا ہے جس کی جھلکیاں اُن کے افسانوں میں موجود ہیں۔

وہ پچھلے تیس پینتیس برس سے لگاتار لکھ رہے ہیں۔ اب تک اُن کے چار مجموعے آچکے ہیں۔ افسانوں کے علاوہ تنقید، ڈرامہ، ناول، خاکے اور بچوں کے ادب میں اُنھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ حال ہی میں اُن کا دوسرا ناول'' ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' شائع ہوا ہے اور اُردو حلقے میں اُس کی خاصی پذیرائی ہورہی ہے۔ ''فقط بیان تک'' اُن کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں کُل سترہ کہانیاں ہیں۔ ان میں شریک بیشتر کہانیاں برِصغیر کے مختلف ادبی جرائد میں شائع ہوکر قارئین سے داد پا چکی ہیں۔

'ماضی کی بازیافت' نورالحسنین کے پسندیدہ موضوعات میں سے ایک ہے وہ تہذیب واخلاق کے زوال کے تئیں بھی خاصے فکرمند نظر آتے ہیں۔ مجموعے کے شروع کے دونوں افسانے،'' سبزۂ نورستہ کا نوحہ، اور' ایک اُداس شام' میں انہی موضوعات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔' سبزۂ نورستہ کا نوحہ' میں ماضی کی یادوں کو بڑے دردمندانہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ سجاد حسین جو تقسیم کے بعد پاکستان چلا گیا تھا اب ایک عرصے کے بعد اپنے آبائی وطن آیا ہے۔ اُس کی یادداشت میں ماضی کا ایک ایک گوشہ، ایک ایک چہرہ اُبھر رہا ہے۔ اُس کے سارے پُرکھے اور خاندان کے بزرگ پیوندِ زمین ہو چکے ہیں۔ اب اُن کی یادوں کے سوا کچھ باقی نہیں بچا ہے۔ محرم کا مہینہ ہے اور امام باڑے میں مرثیہ پڑھا جارہا ہے۔ وہاں آوازیں گونج رہی ہیں،'' ہائے امامِ مظلوم آپ سے آپ کا مدینہ چھوٹ گیا۔''

سجاد حسین کو بھی اپنا وطن چھوٹنے کا غم ہے۔ مرثیے کے الفاظ سجاد حسین کے غم کو شدید کر دیتے ہیں۔ آخر کار افسانہ اپنے اختتام کو پہنچتے پہنچتے ایک نوحے کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور سجاد حسین کے ساتھ قاری کا دل بھی اُس غم ناک کیفیت سے بوجھل ہوجاتا ہے۔

واقعہ کربلا کو نورالحسنین نے ذاتی غم میں تبدیل کرکے پورے افسانے کو ایک استعارہ بنادیا ہے۔

''ایک اُداس شام'' میں تہذیبی رشتوں کے ٹوٹنے اور ایک مشترکہ خاندان کے بکھرنے کے المیے کو بیان کیا گیا ہے۔ مشترکہ خاندان میں سب آپس میں ایک دوسرے سے جس اخلاص ومحبت اور شفقت واحترام سے پیش آتے تھے، اُنھیں یاد کرکے راوی افسردہ ہوجاتا ہے، یہ افسانہ بھی 'سبزۂ نورستہ کا نوحہ' کی طرح فلیش بیک کی تکنیک میں لکھا گیا ہے جس میں ماضی کے چھوٹے چھوٹے مناظر کو ایک دوسرے سے اسی طرح مربوط کیا گیا ہے کہ پورا افسانہ کسی فلم کی ریل کا سا تاثر پیش کرتا ہے، اگر غور سے دیکھیں تو 'ایک اُداس شام' سبزۂ نورستہ کا نوحہ' ہی کی ایک کڑی (Squal) معلوم ہوتی ہے۔ 'بسلامت روی و باز آئی' افغانستان پر امریکہ کے ہوائی حملوں کے پس منظر میں لکھا ہوا ایک پُراثر افسانہ ہے۔ جلال خان ایک امن پسند افغان شہری تھا لیکن ایک ہوائی حملے میں دوسرے مکانوں کے ساتھ اُس کا گھر بھی تباہ ہوجاتا ہے۔ حملے میں اُس کی جان سے پیاری بیوی گلریز خانم ہلاک ہوجاتی ہے تب سے وہ کاندھے پر 'لانچر' اُٹھائے غیر ملکی طیاروں کو نشانہ بنانے کے فراق میں پہاڑیوں کو اپنا مسکن بنالیتا ہے۔ اُس کا بارہ سالہ بیٹا لالے خان جو' جبل السراج' کے مدرسے میں زیرِ تعلیم تھا اُس کے ساتھ ہے۔ ایک ہوائی حملے میں جلال خان شدید زخمی ہوجاتا ہے اور لالے خان رونے لگتا ہے مگر جلال خان اُسے آنسو بہانے سے منع کرتا ہے اور حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کی یاد دلاتے ہوئے کہتا ہے،'' اب تمہاری باری ہے لالے خان۔ اُٹھاؤ لانچر اور آگے بڑھو۔'' لالے خان لانچر لے کر آگے بڑھتا ہے اور سامنے سے آنے والے ایک طیارے کو نشانہ بناتا ہے۔ اس طرح گویا وہ باپ کی جگہ سنبھال لیتا ہے۔

افسانے میں افغانستان کے جنگجویانہ ماحول کی فضابندی بڑی چابکدستی سے کی گئی ہے۔ جلال خان کے مکالموں کو پٹھانی لب ولہجے میں اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ افسانے میں حقیقت پسندی کا رنگ گہرا ہوجاتا ہے۔ پورے افسانے پر جلال خان چھایا ہوا ہے۔ افسانے میں اُس کی بہادری اور انتقامی جذبے کی ایسی بھرپور عکاسی کی گئی کہ افغانی قوم غیرت اور حمیّت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ لالے خان کا لانچر اُٹھالینا اس بات کا اشاریہ ہے کہ اب وہاں نئی نسل بھی امریکیوں کے خلاف کمربستہ ہوچکی ہے۔ حشو وزاید سے پاک یہ ایک چست درست افسانہ ہے۔ تاہم افسانے میں لالے خان کی عمر صرف بارہ برس بتائی گئی ہے۔ کیا بارہ برس کا لڑکا اپنے کاندھے پر لانچر کا وزن اُٹھا سکتا ہے؟ لالے خان نہ صرف لانچر اُٹھاتا ہے بلکہ طیارے پر ٹھیک نشانہ بھی لگاتا ہے جبکہ اُسے لانچر چلانے کا کوئی تجربہ بھی نہیں ہے کیوں کہ وہ تو مدرسہ جبل السراج میں زیرِ تعلیم تھا۔ بہر کیف ان تسامحات سے صرفِ نظر کریں تو افسانہ قاری کے ذہن پر ایک گہرا تاثر مرتسم کرتا ہے اور اُس کے ذہن میں تادیر بم کے دھماکے گونجتے رہتے ہیں۔

ایک کامیاب افسانے کی خوبی یہی ہے کہ اپنے اختتام کے بعد بھی قاری کے ذہن پر اپنا نقش قائم رکھے۔ 'بسلامت روی وباز آئی' مجموعے کا کامیاب ترین افسانہ ہے۔

''ڈاکو پھر آگئے'' ایک طنزیہ افسانہ ہے۔ ٹھاکر جرنیل سنگھ حکومت

کے اعلان کے بعد ڈاکو گیری چھوڑ کر سرکار کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے مگر اُسے رہ رہ کر اپنے ماضی کا دبدبہ اور دولت کی ریل پیل یاد آتی رہتی ہے۔ وہ پھر سے ڈاکوؤں کا پیشہ اختیار کرنا چاہتا ہے لیکن اب واپس بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ اُس کا بیٹا پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بن گیا ہے۔ وہ اسی شش و پنج میں مبتلا رہتا ہے کہ ایک دن اُس کا بیٹا بتاتا ہے کہ وہ معمولی آپریشن کی بھی تگڑی فیس وصول کرتا ہے۔ تب وہ خوشی سے پوچھتا ہے کہ اُس کے جتھے کے دیگر ڈاکوؤں کے بچے کیا کر رہے ہیں تو اُسے جواب ملتا ہے کہ کوئی لیڈر ہے، کوئی وکیل ہے، کوئی پولس انسپکٹر ہے اور اور وہ سب دونوں ہاتھوں سے خوب کمائی کر رہے ہیں۔ یہ سن کر جرنیل سنگھ کو اطمینان ہوجاتا ہے کہ اُس کا پورا جتھہ پھر سے سرگرم ہوگیا ہے اور دولت کے ساتھ ساتھ عزّت بھی کما رہا ہے۔ افسانے کا رمزیہ ہے کہ ظاہری صورت بدلنے سے انسان کی فطرت نہیں بدلتی۔ ''ڈاکو پھر آ گئے'' عنوان بھی افسانے کی تھیم کے عین مطابق ہے کہ ڈاکو بھی عوام کو لوٹتے ہیں اور آج سماج کے ذمہ دار، انتظامیہ کے عہدہ دار اور انسانیت کی بقاء کی قسم کھانے والے پیشہ ور ماہرین بھی وہی کام کر رہے ہیں۔

''کلمہ گو'' ابوداد ا کی کہانی ہے جو ضرورت مندوں کو سود پر روپیہ دیتا ہے۔ بُرے وقتوں میں بستی کے لوگوں کی مدد بھی کرتا ہے۔ وہ غنڈہ ہے، عورتوں کا رسیا ہے، مگر اُس کے اپنے کچھ اُصول ہیں۔ وہ جمعہ کے دن کوئی بُرا کام نہیں کرتا اور اپنے آپ کو کلمہ گو مسلمان کہتا ہے۔ جب ماریا برونٹ، اُس کے لیے ہوئے قرض کے پانچ ہزار روپیے لوٹا نہیں پاتی تو کہتی ہے، '' مین۔۔۔ ہم انگریز کمیونٹی کبھی کسی کا احسان نہیں رکھتی۔ امارے پاس جو کچھ تھا اُس سے ام سب کا پے منٹ کر دیا۔ ابھی تمہارا پے منٹ کرنے امارے پاس روپیہ نہیں ہے۔ ام جانتا۔۔۔ تم روپیہ کے بدلے ام سے کیا چیز لے گا۔ ام وہ تم کو انٹریسٹ کے ساتھ دینے کو آیا ہے۔ کم آن۔۔ وصول کرلو۔۔۔!''

وہ جمعہ کا دن بھی نہیں تھا لیکن ماریا کا یہ جملہ کہ ہم انگریز کمیونٹی کبھی کسی کا احسان نہیں رکھتا، ابوداد ا کی مذہبی حمیت کو بیدار کر دیتا ہے۔ اور وہ اُسے یہ کہہ کر رخصت کر دیتا ہے کہ، ''ہم بھی مسلمان ہے۔ کلمہ گو۔'' یہاں قاری کی نظر میں ابوداد ا کا قد ایک دم بلند ہوجاتا ہے۔ ابوداد ا بدمعاش تھا، سود خور اور غنڈہ تھا مگر ایک عورت کی مجبوری کا فائدہ اُٹھانا اُس کے ضمیر کو گوارا نہیں تھا۔ اس افسانے کو پڑھتے ہوئے بے اختیار منٹو کا مشہور افسانہ ''ممد بھائی'' یاد آجاتا ہے، اگرچہ دونوں افسانوں کا ٹریٹ منٹ الگ ہے مگر ابوداد ا اور ممد بھائی میں کئی باتیں مشترک بھی ہیں۔

'' بس شرط اتنی ہے'' کا موضوع نوجوان نسل کی بے روزگاری اور اُن کا فرسٹریشن ہے۔ مختلف مذہب کے چار نوجوان ایک نئی دنیا بسانا چاہتے ہیں مگر جب ایک 'بنتِ حوا' آکر اُن سے کہتی ہے کہ کیا وہ اُس سے ایک ایسی نسل پیدا کرنے کا وعدہ کر سکتے ہیں جو مذہبی تعصب، نسلی امتیاز سے پاک ہو اور دنیا میں عزّت و وقار سے جینا چاہتی ہو تو اس شرط کو سن کر وہ چاروں نوجوان پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ اس افسانے سے غالباً یہ پیغام دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ نئی نسل صرف 'نعرہ بازی' پر یقین رکھتی ہے۔ جہاں عملی قدم اُٹھانے کا وقت آتا ہے وہ بغلیں جھانکنے لگتی ہے۔

یہ ایک معمولی بلکہ کمزور افسانہ ہے جس میں تمثیل، فنتاسی اور حقیقت پسندی کچھ اس طرح گڈمڈ ہوگئے ہیں کہ پورا افسانہ ایک ملغوبہ بن گیا ہے۔

''کھڑکی سے آنے والا جھونکا'' میں دکھایا گیا ہے کہ ایک نوجوان اکثر ایک خاتون کو گھورتا رہتا ہے۔ اس بات کو لے کر خاتون کا ادھیڑ عمر شوہر ذہنی اور جذباتی کش مکش میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ مگر آخر میں پتہ چلتا ہے کہ اُس خاتون میں اُس نوجوان کو اپنے ماں کی 'شبیہ' نظر آتی تھی۔ کہانی دلچسپ ضرور ہے مگر افسانہ نگار نے کلائمکس پر قاری کو چونکانے کے لالچ میں کہانی کو بلاوجہ طول دیا ہیا گرچہ نورالحسنین کی نثر میں ایک کشش ہے لیکن پھر بھی قاری کہیں کہیں اُکتاہٹ کا شکار ہوجاتا ہے۔

''بیساکھیوں پر کھڑے لوگ'' بھی ایک بوڑھے کی نفسیاتی کشمکش کی کہانی ہے۔ بوڑھے کی بیوی مرچکی ہے۔ بیٹا روشن مستقبل کی چاہ میں سمندر پار چلا گیا ہے اور بوڑھا آرام گھر میں اپنی زندگی کے دن گزار رہا ہے۔ وہاں جو ڈاکٹر روٹین چیک اپ کے لیے آتی ہے۔ ڈاکٹر کو دیکھ کر یا اُس سے مل کر اُسے اپنی بیوی کے ساتھ گزارے ہوئے ایام یاد آتے ہیں۔ یہ کہانی حال، ماضی پر پھیلتے ہوئے شاندار مستقبل کی چاہ میں اپنوں کو فراموش کرنے کی کہانی ہے۔ بظاہر یہ ایک بڑی عمر کے مرد اور چھوٹی عمر کی لڑکی کی محبت کی کہانی ہے لیکن بباطن محض ایک دوسرے سے انڈراسٹینڈنگ کی کہانی ہے۔ یہی وہ سوچ ہے جو بیساکھی کے سہارے آگے بڑھتی ہے مگر بعض مقامات پر ماضی اور حال اس طرح گڈمڈ ہونے لگتے ہیں کہ قاری کو رُک کر غور کرنا پڑتا ہے۔

''فقط بیان تک'' مجموعے کا ٹائٹل افسانہ ہے۔ پولس دہشت گردی کے شبہ میں اکثر مسلم نوجوانوں کو نشانہ بناتی ہے۔ آئے دن اخباروں میں اس قسم کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ پولس کی سفاکی اور بے ضمیری کی داستانیں بھی اخباروں کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ مگر اس افسانے میں معمول کے خلاف ایک پولس والے کا ضمیر جاگتا ہے اور وہ ایک نیتا کو قتل کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر سیکیوریٹی گارڈ کے سپاہی اُسے گولی مار کر ہلاک کر دیتے ہیں۔

کہانی کے بین السطور میں یہی بات کہی گئی ہے کہ پولس وغیرہ تو محض سیاسی بساط کے مہرے ہیں جنھیں سیاست داں جس طرح چاہے استعمال کرتے ہیں اگر کسی نے مخالفت کی تو اُسے راستے سے ہٹا دیا جاتا ہے۔

زراعتی ترقی اور روزگار کی فراہمی کی خاطر حکومت نے بند باندھنے اور نہری نظام کو لاگو کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کی خاطر ہر چھوٹی بڑی ندّی نالوں پر بند تعمیر کیے گئے اور بند کی تعمیر کی خاطر کئی دیہاتوں کو خالی کیا گیا اور اُنھیں دوبارہ کسی اور مقام پر آباد ہونے کے لیے رقومات دی گئیں لیکن ان رقومات کی دستیابی اس قدر تاخیر سے ہوتی ہے کہ آباد گھر برباد ہوجاتے ہیں اور جب رقم ملتی ہے تو اُس سے

نہ تو کھیت خریدے جاسکتے ہیں اور نہ گھر تعمیر ہوسکتے۔ ''دھوپ میں جلتا گاؤں'' اسی تھیم کو لے کر چلتا ہے۔ گاؤں کے وکاس کے لیے اکثر نیتا جھوٹے وعدے کرتے ہیں۔ گوبند راؤ احتجاج کرتا ہے۔ اُسے سرپھرا کہہ کر گرفتار کرلیا جاتا ہے۔ افسانے میں قحط زدہ گاؤں کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ خاصی متاثر کُن ہے۔

''دوسرے کنارے تک'' یہ افسانہ انسانی سوچ کی گھناونی صفات کا پردہ چاک کرتا ہے ۔ یہ ایک ایسے افسر کے عشق کی کہانی بیان کرتا ہے ہے جو اسکول میں طالب علمی کے زمانے میں اپنی جان بچانے والی ایک معمولی چپراسی کی لڑکی کے عشق میں گرفتار ہوجاتا ہے اور ماں باپ لڑکی ہی کو قصوروار ٹھہراتے ہیں اور وہ اُس لڑکی سے کنارہ کش ہوجاتا ہے۔ لیکن جب اُس کی اپنی لڑکی کا معاملہ سامنے آتا ہے تو لڑکے کو قصوروار سمجھا جاتا ہے۔ یہ کہانی امیر لڑکا اور غریب لڑکی جیسی روایتی کہانیوں جیسی ایک کہانی ہے جو قاری کے دل پر کوئی خاص تاثر قائم نہیں کرپاتی۔

''ایک عذاب اور'' میں بظاہر افسانہ نگار کی خودستائی جھلکتی نظر آتی ہے مگر کہانی کا بنیادی تھیم یہی ہے کہ ہر دور کا کہانی کار اپنے موضوعات خود منتخب کرتا ہے۔ اس لیے ایک عہد کی سچائیوں کا موازنہ دوسرے عہد کی سچائیوں سے نہیں کیا جاسکتا۔

''جنت کا پھول'' کا موضوع مسلکی اختلاف ہے۔ نوجوانی میں ہر فرد بڑا انقلابی ہوتا ہے، یہاں تک کے استخارہ کے پس پردہ بھی اپنی مطلب براری کے وسیلے ڈھونڈھ لیتا ہے۔ اصغر علی بھی اپنی جوانی میں یہی سب کچھ کرچکے ہیں، لیکن جونہی اُن کو شبہ ہوتا ہے کہ اُن کی بیٹی کسی غیر مسلکی نوجوان سے محبت کرتی ہے تو اُن کی نیندیں حرام ہوجاتی ہیں، مگر جب اُن کی غلط فہمی دور ہوجاتی ہے تو اُنھیں بڑا اطمینان ہوتا ہے۔۔۔ اور کہانی بغیر کسی تاثر کے ایک بے کیفی کے ساتھ ختم ہوجاتی ہے۔

جدیدیت اور تجریدیت کی یلغار کے زمانے میں اردو میں کرداروں پر افسانے لکھنے کا رواج ختم ہوگیا تھا۔ مگر اِدھر ستّر اور اسّی کی دہائی کے بعد لکھنے والوں نے کم کم سہی اس طرف توجہ دی ہے اور اُردو افسانے میں حروفِ تہجی یا ہندسوں کی بجائے چلتے پھرتے کردار نظر آنے لگے ہیں۔ نورالحسنین کے افسانے ''جال اندر جال'' میں قاری کی ملاقات ایک ایسے ہی جیتے جاگتے کردار سے ہوتی ہے۔ سبحان چچا کسی زمانے میں ایک خوشحال، خوش مزاج اور خوش پوش شخص ہوا کرتے تھے، خاندان کے بچوں سے محبت کرنا اور اُن پر بے دریغ خرچ کرنا اُن کا وطیرہ تھا۔ اب وہ بوڑھے ہوگئے ہیں اور ملازمت کے قابل نہیں رہے ہیں۔ اُن کی کوئی اولاد بھی نہیں ہے، لہٰذا وہ اپنے گزارے کے لیے لوگوں سے جھوٹ بول کر پیسے وصول کرتے ہیں۔ اس لیے خاندان کے لوگ اُن سے ملنے سے کتراتے ہیں۔ افسانہ نگار نے اپنے اطراف کے ماحول کا نقشہ کھینچتے ہوئے بتایا ہے کہ، گھر، دفتر، پڑوس ہر جگہ ہر کوئی جھوٹ کا سہارا لیتا ہے مگر اُن کا جھوٹ سکۂ رائج الوقت کی طرح چل جاتا ہے مگر سبحان چچا کی مفلسی کے سبب اُن کے جھوٹ کو کھوٹا سکہ قرار دیا جاتا ہے۔ افسانہ نگار نے اس افسانے کو ''جال اندر جال'' کا عنوان دے کر معنیٰ خیز بنادیا ہے۔

''بھیڑ میں گھرا شخص'' ایک رومانی کہانی ہے جس میں ''وہ کون تھی'' قسم کا سسپینس پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے مگر افسانے کا اسرار کہانی کے اختتام سے پہلے ہی فاش ہوجاتا ہے اور کہانی مٹی کے گھروندے کی طرح ڈھے جاتی ہے ۔ کہانی کے کلائمکس پر ''او ہنری'' کا اثر غالب ہے۔

''کرچیاں'' ایسے سینکڑوں ہزاروں لوگوں کی کہانی ہوسکتی ہے جو بہتر مستقبل کی تلاش اور زیادہ دولت کمانے کی دوڑ میں شامل ہوکر بیرونِ ملک جاتے ہیں لیکن جب واپس آتے ہیں تو خود اُن کا گھر اور گھر کے افراد بیگانہ ہوجاتے ہیں، کلائمکس میں افسانے کا راوی ٹوٹی ہوئی پلیٹوں کی کرچیاں چُنتا ہے۔ افسانے کا عنوان بھی 'کرچیاں' ہے یہ کرچیاں اُس کے ماضی کی یادوں کی بھی ہوسکتی ہے، یا رشتوں کی شکست و ریخت کی بھی، جو اُس کے وجود میں گڑ جاتی ہیں ۔ ملاقاتی کارڈ کا پھاڑ دینا حالات سے سمجھوتہ کرنے کا استعارہ ہوسکتا ہے۔ افسانے پر تجریدیت غالب ہے۔ اس سے پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ اس قسم کے تجریدی یا نیم تجریدی افسانے ماضی میں کافی لکھے جاچکے ہیں جو قاری کو کسی گہرے تجربے سے روبرو کرائے بغیر چینی کی پلیٹ ہی کی طرح ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جاتے ہیں ۔

مجموعے کی آخری کہانی ''زہر'' بڑی عمر کے مرد اور چھوٹی عمر کی عورت کی اولاد کی چاہ کی کہانی ہے۔ اولاد کی یہ تڑپ اُن سے زیادہ اُن کے دلوں میں باہر کے افراد پیدا کرتے ہیں۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے اُن کے دکھ کو مزید گہرا کرتے ہیں۔ اس کہانی کی سب سے بڑی خامی اس کی بے جا طوالت ہے۔ تقریباً چونتیس صفحات پر پھیلی ہوئی اس کہانی کا مطالعہ قاری کے لیے ایک تھکا دینے والا تجربہ ہے۔ اس کہانی میں بھی قدم قدم پر فلیش بیک کا استعمال کیا گیا ہے۔ نورالحسنین چونکہ سمعی ذریعہ ابلاغ سے وابستہ رہے ہیں لہٰذا وہ فلم اور ریڈیو کی تکنیک سے بخوبی واقف ہیں۔ اسی لیے اُنھوں نے اپنی کہانیوں میں بار بار فلیش بیک، فلیش فارورڈ، فیڈ ان، فیڈ آوٹ اور مونتاج جیسی تکنیک کا خوب استعمال کیا ہے، لیکن کہیں کہیں یہ استعمال ضرورت سے زیادہ ہوا ہے جو کہانی کی فطری اُٹھان میں رُکاوٹ پیدا کرتا ہے۔

''فقط بیان تک'' کے افسانوں کا یہ ایک سرسری جائزہ ہے۔ میں نے افسانوں کی خوبیوں اور خامیوں کو معروضی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ نورالحسنین کا ادبی سفر ابھی جاری ہے۔ اُن کے سامنے امکانات کی وسیع دنیا موجود ہے لہٰذا ختمِ کلام کے طور پر صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ اُردو افسانے کو اُن سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں اور اُمید کی جاسکتی ہے کہ وہ ان توقعات پر کھرے اُتریں گے۔

''کہانیوں کی پٹاری''

نگار عظیم
(دہلی)

درمیانہ قامت، چوڑے کندھے، آب دار کتابی چہرہ، اونچی پیشانی جس پر پڑی تین لکیریں زندگی کے جدوجہد بھرے سفر کی نشان دہی کرتی نظر آتی آتیں۔ شربتی آنکھوں کی گہری جھیلوں میں سیکڑوں کہانیاں تیرتی ہوتیں۔ سلونا رنگ، ستواں ناک، متبسم لبوں پر غموں کا پہرہ صاف دکھائی دیتا۔ کسی وقت کالے گھنے بالوں میں آڑی مانگ خوب پھبتی اور مزاج کے تیکھے پن کا بھی پتہ دیتی۔ لیکن فکرات ذمہ داریاں اور لمبی تنہائی کے بوجھ نے کالے گھنیرے بالوں کا تمام ذخیرہ لوٹ لیا اور مانگ ہلکی پڑ گئی۔ لہجہ میں نرمی، باتوں میں محبت کی گرمی، مزاج میں خودداری، چال میں خوداعتمادی، نفیس لباس غرضیکہ مردانہ وجاہت سے پُر اپنے نام نورالحسنین کی تمام صفات سمیٹے یہ چھتنار سا وجود تمام زندگی نام ونمود سے بے نیاز رشتے ناطے نبھانے اور محبتوں کے چراغ روشن کرنے میں منہمک رہا اور اسی کو زندگی کا حاصل سمجھتے ہوئے سات دہائیاں چھولیں۔ خدا نے بھی تمام آزمائشوں سے بہ حسن وخوبی گزارا اور خوب نوازا۔

صحافت کی ریڈیو پر اناؤنسر رہے، ڈرامے لکھے، فیچرز لکھے خود بھی اسٹیج ڈرامے کیے۔ قلم کے ساتھ ساتھ آواز کا جادو بھی جگایا۔ تحقیق، تنقید اور تخلیق میں جی کھول کر طبع آزمائی کی۔ خدا سب سے بڑا تخلیق کار ہے اگر وہ اس تخلیقیت کا ایک ذرّہ بھی کسی کو عنایت کردے تو خدائے برتر کی اپنے بندے سے محبت کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوگی۔ اس نے نورالحسنین کو ایک ایسے جزیرے کی منصبی عطا کی، جہاں وہ تازندگی فائز رہیں گے۔ قلمی جہاد میں ان کا قلم اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہے گا۔

ہر تخلیق کار کا سفر زندگی کی نشوونما کی طرح پروان چڑھتا ہے اور اپنا راستہ طے کرتا ہے، جن میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو صرف قلم اور کاغذ تک محدود ہوتے ہیں۔ نرم نرم صوفوں پر بیٹھتے ہیں اور غربت کی کہانیاں لکھتے ہیں، جس کا ان کی ذاتی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ اپنے نظریہ سے زمانے کو دیکھتے ہیں اور پیش کرتے ہیں۔ نام ونمود بھی کما لیتے ہیں اور دولت بھی۔ لیکن کچھ اس سے مختلف بھی ہوتے ہیں جن کا وجود اپنی زمین، مٹی، آب وہوا اور تہذیب سے کبھی الگ نہیں ہوتا۔ مجبوریاں، محرومیاں، نامرادیاں رشتے ناطے دکھ درد اور محبتیں ان کے وجود میں خون کی طرح شامل ہوکر گردش کرتی رہتی ہیں۔ زندگی کی جدوجہد سرد گرم موسم ان کے تخلیقی تخم کو خوب توانائی عطا کرتے ہیں۔ تب وہ صرف قلم کار نہ ہوکر تخلیق کار بھی ہوتے ہیں۔

نورالحسنین کا شمار انھیں تخلیق کاروں میں ہوتا ہے۔ نورالحسنین نے زندگی کی دھوپ چھاؤں دیکھی ہے، وہ زندگی کے نشیب وفراز سے پاؤں میں چھالے لے کر گزرے ہیں۔ درد کی چبھن کو محسوس کیا ہے، چہروں کی جھریوں کو پڑھا ہے۔ تنہائی کے تلخ گھونٹ بھی پیئے ہیں تو محبت سے سرشار بھی ہوئے ہیں۔ ادب کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھنے سے پہلے ہی وہ اس کی افادیت اور اصول کو سمجھ چکے تھے کہ 'جو ادب سماج سے کٹ کر لکھا جاتا ہے وہ محض لفاظی ہوتا ہے' (ایک زندہ کہانی) سماج کا مطلب زندگی کا ہر پہلو۔

نورالحسنین کے کہانی محل کی سیر کریں تو عنوانات سے ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ انھوں نے کائنات وحیات کی ترجمانی بخوبی کی ہے مثلاً 'افق پر گرفت'، 'ایک زندہ کہانی'، 'گڑھی میں اترتی شام'، 'شہرخموشاں کا نقیب'، 'دستک'، 'پچھلے پہر کی خوشبو'، 'کھڑکی سے آنے والا جھونکا'، 'دھوپ میں جلتا گاؤں'، 'ایک عذاب اور'، 'جنت کا پھول'، 'بھیڑ میں اکیلا شخص'، 'کلمہ گو'، 'ڈاکو پھر آگئے'، 'زہر'، 'کرچیاں'——— یہ تمام عنوانات ایسے ہیں جن سے زندگی کی صورت گری کے تمام پہلوؤں کا درعکس نمایاں ہوتا ہے۔

ایک وقت تھا جب کہانی چہرے پر صرف اور صرف روایتی گل بوٹوں کی سجاوٹ تھی رومانس، عیش وعشرت، عشق وعاشقی اور دیو پری جن کے قصے تھے۔ زندگی کی حقیقتیں منہ چھپائے سسک رہی تھیں۔ ایسے وقت میں نورالحسنین نے تجربات ومشاہدات کی ایک نئی دنیا آباد کی۔ کہانی چہرے کو نئی زمین اور نیا آسمان عطا کیا۔ اس کی مانگ ستاروں سے سجائی۔ نئی نئی علامتوں اور استعاروں سے کہانی محل میں معنویت کے نئے نئے در وا کیے۔ تو کہانی چہرہ اپنے خط وخال سمیت چمک اٹھا۔ اس کی سب سے اہم مثال 'ایک زندہ کہانی' میں بلو کے چہرے میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ کہانیاں آسماں میں نہیں ملتیں زمین پر ہوتی ہیں اور آفاقی بن جاتی ہیں۔ قلم کار جب تک اپنے خول اپنی 'میں' سے باہر نکل کر زندگی کو نہیں پڑھے گا تخلیق کار نہیں بنے گا۔ کہانیاں تو ہمیشہ کہانی کار کی منتظر ہوتی ہیں:

'بلو ٹیبل پر کاغذات اور قلم رکھ دو۔ میں آج اس کہانی کو لکھنا چاہتا ہوں جس کی خاطر یہ کائنات پیدا کی گئی ہے میں اسے دیوانوں کی طرح آفاق میں ڈھونڈتا رہا اور وہ زمین پر بکھری ہوئی تھی۔ میرے قدموں سے لپٹی ہوئی تھی۔ لیکن میں اسے پہچان نہ سکا۔ آج جب میں نے اپنے درد سے بلند ہوکر اور اپنے وجود کو سمیٹ کر تمہاری آنکھوں میں جھانکا تو وہ مجھے نظر آگئی۔' (ایک زندہ کہانی)

کہانی کار کا یہ مشاہدہ حالانکہ اس کا اپنا ہے لیکن درد اور رشتوں کے کرب کا احساس اسے آفاقی بنا دیتا ہے۔ اپنے دکھ درد کو بھول کر دوسرے کے اندر اتر کر جھانک کر اس کی محرومیوں اور تکلیفوں کو اپنا بنا کر ہی کہانی اپنے اصل وجود میں تخلیق پاتی ہے۔ اسے ایک نیا پیراہن میسر آتا ہے، ورنہ ہواؤں میں اڑ کر دور کہیں آسمان کی وسعتوں میں کھو جاتی ہے اور پھر آپ اس کا سرا بھی نہیں پاسکتے۔

زندگی کی ہر کہانی کو چہرے کی تلاش ہوتی ہے اور چہرے کو برتن بنانے والے کمہار کی طرح ہاتھوں کے لمس کی وہ چاہے کسی مصور کے رنگ اور برش کے ذریعہ ہو یا قلم کی سیاہی یا پھر مورتی کار کی مٹی کے ذریعہ۔ پھر اس کہانی چہرے کی آب کے لیے رنگوں اور لفظوں کی جادوگری کی——— لیکن شرط اول تخلیق کار کے اندرونی احساس کی ہے۔ اس کے بغیر کچھ بھی نہیں۔

نورالحسنین کو احساس کی اسی شدت سے منفرد تخلیق کار کی صف میں لا کھڑا کیا، جس کی بہترین مثال 'وصیت' ہے۔ دنیا میں پہلا قتل بھائی کے ہاتھوں بھائی کا ہوا۔ ازل سے ابد تک دنیا میں زر، زن، زمین کا بول بالا رہے گا۔ اقتدار طاقت اور پیسے کی ہوس میں ہمیشہ سے رشتے پامال ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ ہمارے تصور میں بساخوابوں کا ایک گھوڑا ہے جو ایک پل میں جست لگا کر ساری کی ساری بساط پلٹ کر فاتح ہونا چاہتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے گھر، خاندان اور حکومتوں کا شیرازہ بکھرتے دیر نہیں لگتی۔ اس کہانی کے معنی اور مفاہیم بہت تہہ داریت لیے ہوئے ہیں گھر کی چار دیواری میں پنپتی دولت اور اقتدار کی ہوس عالمی تناظر میں دیکھیں تو انتہائی خوف ناک حالات، مسائل اور نتائج دہائیوں سے ہمارے سامنے سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ افسانے کے کچھ جملے بے حد معنی خیز ہیں مثلاً:

'.....بابا.....سمراٹ اشوک نے راج گدی کی خاطر اپنے سارے بھائیوں کو کیوں قتل کر دیا تھا۔'

'بیٹا طرز حکومت اگر جمہوری نہ ہو تو یہی سب کچھ ہوتا ہے.....'

'اچھا.....تو پھر جمہوری ملک کی وزیر اعظم اندرا گاندھی کو کیوں قتل کر دیا گیا تھا؟'

اسی طرح کچھ اور جملے بھی ہماری تاریخ کے ورق دہرا رہے ہیں:

'بابا یہ جانتے ہوئے بھی کہ راج پاٹ کے اصل وارث پانڈو ہی تھے، کوروں نے ان سے جنگ کیوں کی.....؟'

'بیٹے اقتدار کی ہوس بہت بُری ہوتی ہے۔'

نئی نسل کا پھر ایک سوال:

'بابا.....آخر اتنی مستحکم مغلیہ سلطنت کا شیرازہ کیوں بکھر گیا؟'

'آپسی انتشار اور عدم اعتماد۔'

اسی طرح کے اور بھی کئی جملے سوال بن کر حساب مانگ رہے ہیں، جواب مانگ رہے ہیں، آنے والی نسلیں ان سوالوں کے جواب میں کیا نتائج اخذ کریں گے اور کیسی تاریخ رقم کریں گی وقت ہی بتائے گا۔

نورالحسنین اپنی کہانیوں میں علامتی استعاروں کے ذریعہ بہت سی پیش بندیاں کر جاتے ہیں۔ افسانے کی ابتدا سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

'پچھلے کئی برسوں سے میں ایک عجیب سا خواب مسلسل دیکھ رہا ہوں۔ جیسے گھوڑ سواروں کا ایک دستہ دکن کی سنگلاخ وادیوں سے نکل کر اور برہان پور کے راستے سے ہوتا ہوا دہلی کی طرف بڑھ رہا ہے اور میں ہر بار ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہوں اور سوچنے لگتا ہوں کہ آخر اس خواب کا مجھ سے کیا تعلق ہے.....؟ تب وہ سارے ہی گھوڑے مجھے اپنے اندر مچلتے ہوئے نظر آتے ہیں اور مجھے کوچ کا حکم دینے پر بضد ہو جاتے ہیں۔ میں مجبوراً پھر ایک بار آنکھیں موند لیتا ہوں اور گھوڑے منزل بہ منزل آگے بڑھنے لگتے ہیں۔'

بظاہر ایک سادہ سی دکھائی دینے والی کہانی اتنی سادہ نہیں کہ پڑھ کر آگے نکل جائیں، کیوں کہ پڑھنا تو وہ ہے جو لکھا نہیں گیا اور اس کے لیے ٹھہرنا ضروری ہے۔

نورالحسنین کے یہاں کہانی گودی میں پلتی ہے باہوں کے پالنے میں جھولتی ہے اور پھر زمین پر گھٹنوں گھٹنوں چل کر جوان ہوتی ہے اور پھر بڑے دالانوں سے ہوتی ہوئی اس کمرے میں داخل ہوتی ہے جو گوبر سے پتھا ہوتا ہے۔ یہاں وہ زمین پر چٹائی بچھا کر ماضی کی یادوں کے سہارے لیٹے لیٹے بوڑھی ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کی یادداشت بوڑھی نہیں ہوتی کیوں کہ یہ یادیں تو تسبیح کے دانوں کی طرح اس کی عبادت میں شامل ہوتی ہیں، جنھیں وہ پرانے چشمے کے دھاگوں کو کانوں پر درست کر کے اسی سچائی سے دیکھتی ہے جس سچائی سے اس نے یہ سفر طے کیا تھا اور انھیں وہ پھر سنجو کر رکھ لیتی ہے قیمتی سرمایہ کی طرح۔ 'روح میں لپٹی ہوئی آگ' کی اماں اپنے بیٹے جدو جو ضیاء الدین بن گیا تھا، اس کے لیے عذاب ماضی کی صورت بن گئی تھیں لیکن جب ضیاء الدین کی آنکھیں کھلتی ہیں تو ماضی کا یہی آئینہ اس کی پریشانیوں سے نجات کا سبب بن جاتا ہے تب وہ اس حقیقت کو تسلیم کر لیتا ہے اور پُرسکون ہو جاتا ہے:

'اب اماں کی آوازوں سے کسی کو پردہ کروانے کی ضرورت نہیں.....میرا بدنام ماضی آج مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا.....میں نے اس کڑوی سچائی کو قبول کر لیا ہے.....اور پرانی روایتوں کے سارے ہی آثار کو کچل کر حال کا فاتح ہو گیا ہوں.....فاتح.....اور فاتح ہی قابل تعظیم ہوتا ہے۔'

نورالحسنین کا یہ افسانہ تین نسلوں کا احاطہ کرتا ہے۔ ان کی ذہنی پریشانیوں کو تاروپود میں پروتا ہے اور وقت کا آئینہ بن کر زندگی کو دائمی سچائی عطا کرتا ہے:

'کھلی کھڑکی سے اس نے باہر جھانک کر دیکھا۔ وقت تیز دھوپ کو آہستہ آہستہ لپیٹ رہا تھا۔ پیڑوں کے چھوٹے چھوٹے سائے طویل ہوتے جا رہے تھے اور دور اسکول کی عمارت سے بچے باہر نکل رہے تھے۔ اس کے چہرے پر ایک ابدی مسکراہٹ پھیل گئی۔'

خوبصورت جزئیات نگاری پُراثر جذبات نگاری اور مکالموں کا حسن اس افسانے کے خط و خال کو معتبر بناتا ہے اور کہانی کی اماں کے نقوش اپنے تمام حسن کے ساتھ قاری کے ذہن میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

کوئی قلم کار اپنی تحریر یا تخلیق کے ذریعہ آنے والے خطرات سے آگاہ کر دے تو یقیناً اس نے اپنی منصبی کا حق ادا کر دیا۔ ہمارے یہاں یہ کام سعادت حسن منٹو نے بڑی بے باکی اور دلیری سے کیا تھا۔ سماجی سیاسی حالات کو جس طرح سے منٹو نے پیش کیا، اس کی نظیر نہیں ملتی۔ چچا سام کے نام منٹو کے خطوط اور سیاسی موضوعات پر لکھے گئے افسانے پڑھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے موجودہ سیاسی منظر نامے کی تاریخ تو منٹو نے بہت پہلے لکھ دی تھی۔

نورالحسنین کی کہانی 'آخری اسٹوری' کو پڑھتے ہوئے مجھے منٹو پھر یاد آیا۔ 'آخری اسٹوری' جتنی مرتبہ پڑھیں گے، نئے نئے در وا ہوں گے اور ایسے انکشافات ہوں گے کہ آپ ششدر نہیں تو حیران ضرور ہوں گے کہ دنیا کا سماجی سیاسی منظر نامہ اور اس کی تاریخ لکھی نہیں لکھوائی جا رہی ہے جبراً۔ طاقت اور پیسے کے زور سے کیا کچھ نہیں خریدا جا رہا۔ ایک ایسا اسٹوری رائٹر جو سچی کہانی کی تلاش میں اپنی

جان جوکھم میں ڈالتا ہے بستی پہنچتا ہے تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ اسے سچائی جاننے کے لیے کس قدر پابندیاں اور خوف ناک مسائل سے جوجھنا پڑتا ہے:

'میں یہاں صرف سردار سے ملنے نہیں آیا ہوں، بلکہ میں تو یہاں کے شہریوں سے اوران کے مسائل سے بھی ملنا چاہتا ہوں' تب تو تمھیں ناکامی ہوگی کیوں کہ شہریوں کے منہ میں زبان نہیں ہے اور مسائل صرف درخواستوں میں بند ہیں۔'

'اور سردار.....؟ میں نے فوراً سوال کیا۔ تو وہ بولا وہ رعایا کی زبان نہیں جانتا۔'

یہ چند جملے ایک جلتے بجھتے چیختے سلگتے شہر اور اس کے عوام کی بے چارگی، مظلومیت، زبان بندی اور ان پر مسلط سردار یعنی حاکم کے جبر وظلم کی کیسی خوف ناک تصویر پیش کر رہے ہیں۔ ایک ایسا شہر جہاں سچائی لکھنے پر پابندی ہے۔ اس کا قلم کاغذ بھی چھین لیا جاتا ہے وہ کہتا ہے:

'لیکن اگر مجھ سے قلم اور کاغذات چھین لیے گئے تو میں یہاں کی سچی اسٹوری کیسے لکھ سکوں گا.....'

رہبر کہتا ہے 'یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن آپ یہ نہیں جانتے کہ یہاں پر سوال کرنے کا حق صرف سردار کو ہے؟'

ایک ایسا شہر جہاں بھیانک چیخیں سنائی دیتی ہوں اور افق پر شعلے لپک رہے ہوں، راستے بند اور انجانے ہوں اور جسے یہ پتہ ہو کہ صحرا میں بھٹکا ہوا مسافر قیامت تک یوں ہی بے جسم چیختا رہے گا تو مجبوراً اسے خاموش رہنا پڑتا ہے اور سردار کا انتظار بھی کرنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ یہ بستی وہ تھی 'جہاں کل بھی ہاتھ کاٹے جاتے تھے اور آج بھی ہاتھ کاٹے جائیں گے اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا.....'

لیکن قلم کار اٹل اور پختہ ارادہ رکھتا ہے نڈر ہو کر کہتا ہے:

'میں ایک سچا اسٹوری رائٹر ہوں..... میں اس کی آنکھوں میں بے خوفی سے جھانکتے ہوئے بولا.....'اس کی خاطر میں اپنے ہاتھ تو کجا آنکھیں بھی قربان کردوں گا۔'

رہبر کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا 'سردار تمہارا منتظر ہے۔' اور وہ تیزی سے پلٹ گیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے قدم اٹھانے لگا۔'

کیا یہ واقعات، یہ بیان، یہ کردار، یہ رعایا اور عوام اور جبر وظلم کا لامتناہی سلسلہ اپنی بستی شہر ملک اور عالمی سطح پر ہونے والی جنگ اور اس کے نتائج کے نہیں لگ رہے ہیں۔ کیا وہ آدمی جو رعایا کی زبان نہیں جانتا آپ نہیں پہچان رہے، کیا آپ اس بستی شہر اور ملک کو نہیں پہچانتے جہاں ہاتھ کاٹ دیے جاتے ہیں۔ عوام گونگی اور بہری ہوگئی ہے۔ یہاں بات صرف ایک بستی اور ایک شہر یا کسی ایک ملک کی نہیں ہو رہی، یہ پوری ہی دنیا ایک بستی ہے۔ یہاں پر انسان تڑپ رہا ہے، خوف میں جینے پر مجبور ہے۔ لاشوں کے ڈھیر ہیں اور چیخوں کا کہرام ہے۔ کہانی تو ایک ہی ہے اور طاقت بھی ایک جیسی ہے۔ ایک سچا کہانی کار اور جو جان ہتھیلی پر رکھ کر بڑے عزم سے آیا تھا سردار کا حکم سنتا ہے:

'یہ قلم وہی اسٹوری لکھے گا جو میں کہوں گا۔'

'لیکن سردار میں وہ اسٹوری لکھتا ہوں جو میرے اندر سے پھوٹتی ہے.....'

سردار نے قہقہہ لگایا 'تمہارے اندر سے بھی وہی اسٹوری پھوٹے گی جو میں چاہوں گا۔'

'میرا ایڈیٹر سنی سنائی اسٹوری کو چھاپتا نہیں' شاید تمھیں پتہ نہیں ہے۔ نہ اب تمہارا کوئی ایڈیٹر ہے اور نہ ہی اخبار۔ میں سب کچھ خرید چکا ہوں۔ یہاں تک کہ تم بھی میرے ہی ایما پر یہاں تک پہنچے ہو.....'

یہ ہے وہ سچی کہانی جو قلم کار کی آخری کہانی بن گئی۔ کہانی تو وہی لکھی گئی جو بستی کا سردار چاہتا تھا لکھی بھی اس نے جس کے بظاہر دونوں ہاتھ کٹے ہوئے تھے اور جسے دیکھ کر قلم کار حیران تھا یعنی ہاتھ ہوتے ہوئے بھی وہ بے ہاتھ کا تھا۔

'اچانک میرے پیچھے سے وہی بوڑھا شخص پھر ایک بار نکل آیا۔ اس کے دونوں ہاتھ مجھے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ میں سے قلم چھین لیا اور پھر اسٹوری لکھنا شروع کر دیا۔ میں دنگ تھا۔ اس اسٹوری میں اس کا اپنا ایک بھی جملہ نہیں تھا جب اسٹوری مکمل ہوگئی تو اس نے اس پر میری دستخط بھی خود ہی کر دیا۔'

واہ.....کیا کہانی ہے.....صدیوں سے جھوٹی کہانی لکھنے والے سردار کی اب پہچان ہوگئی تھی اور الماریوں میں بند تاریخ کی تمام کتابیں اس سچے قلم کار کا منہ چڑا رہی تھیں۔ بھیانک چیخیں ایک بار پھر گونج رہی تھیں۔ سپر پاور سردار کی دادا گیری اور اس کے ماتحت کس طرح دنیا کی سچائی کو خرید رہے ہیں اور نقلی دستخط کر رہے ہیں سب پر واضح ہے۔

کہانی کو فکشن بنانا بہت بڑا فن ہے۔ تخیلات اور ماحول کی فضا بندی تجسس کی راہ اختیار کرتی چلی جاتی ہے۔ 'آخری اسٹوری' میں یہ فن اپنے عروج پر ہے۔ نورالحسنین نے بڑے کمال فن سے اس کہانی کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ ہمارے جن ناقدین کو یہ شکوہ ہے کہ کہانی لکھی ہی نہیں جارہی ان کو یہ 'آخری اسٹوری' ضرور پڑھ لینا چاہیے۔'

نورالحسنین نے خالص دیہاتی کہانیاں بھی لکھی ہیں، جس میں مٹی، زمین، کھیت کھلیان، بجوکا، پگڈنڈی، بیل، کنواں، تیتر اور بٹیر بازی، ندی نالے، پرندے، جانور، گنے کے کھیت اور گڑ کی مٹھاس اور خوشبو، املی کے پیڑ کیا کچھ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جو سب سے اہم ہے وہ اماں، فاطمہ خالہ، ماموں، بھائی بھتیجے، بہن، بابا، رشتے ناطوں کی یہ ایک ایسی کھیتی ہے جسے جتنا سینچو گے اتنی ہی پھلے پھولے گی۔

ہر شہر اور بستی کے محلوں میں ہمیشہ سے کہیں نہ کہیں کسی گھر میں ایک ایسی خالہ، بوا، تائی، اماں، چاچی، نانی، دادی یا آپا ضرور ہوتی ہے جو رشتے ناطے، دکھ درد، خوشیوں اور غموں کو ملنے اور بچھڑنے کو کبھی کسی پوٹلی میں کبھی کسی گٹھری میں کبھی کسی تسبیح کے دانوں میں سنجو کر سنبھال کر رکھے رہتی ہے جس میں بہادری کے قصے کہانیاں بھی ہوتے ہیں اور طبقاتی کشمکش کے دکھ بھرے واقعات بھی زمینداروں کی شان وشوکت بھی اور بے راہ رویاں بھی ٹوٹتے بکھرتے

خاندان بھی اور حویلیوں کے اندر کی داستانیں بھی۔ یہ وقت ضرورت وہ ان کو نئی نسل میں منتقل کرتی رہتی ہیں اور پھر راہِ ملک عدم ہو جاتی ہیں۔

'گڑھی میں اترتی شام' کی فاطمہ خالہ انھیں میں سے ایک تھیں۔ رحیمو جب جب ان کے پاس بیٹھتا فاطمہ خالہ کے قصے شروع ہو جاتے لیکن اب وہ اوب چکا تھا اس کا دل چاہتا تھا اس گٹھری کو خالہ سے چھین کر پھینک دے تا کہ ہر قصہ ختم ہو جائے۔ لیکن اسے معلوم نہیں تھا قصے کہانیاں کبھی ختم نہیں ہوتے اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ خالہ کی اس گٹھری میں کچھ ایسا بھی ہو سکتا ہے جو اس کی سمجھ بوجھ سے بالکل پرے ہے اور اس کے لیے کس قدر اہم ہے۔

'اس نے بڑھیا خالہ کی گٹھری کو چھیننا چاہا۔ دونوں میں چھینا جھپٹی شروع ہو گئی۔ بڑھیا اسے ڈانٹ بھی رہی تھی اور التجا بھی کر رہی تھی کہ اسے چھوڑ دے..... یہ کھل جائے گی تو سب کچھ بکھر جائے گا.....لیکن وہ اسی طرح ستاتا رہا۔ یہاں تک کہ اس میں سے ایک کارتوس نیچے گر پڑا۔ اس نے گٹھری کو چھوڑ دیا۔ کارتوس اٹھالیا اور پوچھا.....فاطمہ خالہ۔ یہ.....یہ کیا ہے.....؟'

'بندوق کی گولی تیرے ماموں کریم الدین کی۔'

اور بس یہیں سے ایک کہانی شروع.....رحیمو نے تو اپنے ماموں کو ہمیشہ تیتر بازی اور بٹیر بازی کرتے دیکھا تھا اور صرف ایک ہی آواز سنی تھی کا....کا کا....کڑک.....کا کا.....یہ بندوق کی گولی اور وہ بھی ماموں کی؟ بس وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا کہانی سننے کے لیے۔

'ہاں..... پہلے وہ اس طرح تیتر بٹیر کا دیوانہ نہ تھا۔

بڑا شکاری تھا۔ شیر کا شکاری....جب وہ کاندھے پر بندوق لٹکا کر گڑھی سے باہر نکلتا تھا تو کسی کی مجال نہ ہوتی تھی اسے آنکھ اٹھا کر دیکھے..... بڑا بانکا جوان تھا تیرا ماموں.....'

رحیمو حیران تھا اس نے تو ساری زندگی پیٹھ پر پھانچ لادے ماموں کے ساتھ تیتروں کے شکار پر وقت کاٹا تھا پھر یہ شیر کا شکار کب اور کیسے ہو گیا۔ رحیمو سخت تذبذب کا شکار ہو گیا تھا۔ فاطمہ خالہ بولیں کہ 'ارے ایک نہیں.....اس نے تو کئی شیر مارے تھے۔ وہ زمانہ تیرے نانا کا تھا۔'

فاطمہ خالہ کی زبانی گڑھی کے ایک زمیندار خاندان کی کہانی جس کی آخری نشانی اس کا ماموں کریم الدین اور خود رحیمو تھا۔ روپیہ پیسہ کھیتی کسانی عزت سب کچھ تھا۔ گاؤں کے سرپنچ سیٹھ وکیل اور بڑے بڑے لوگ اس گڑھی میں اس کے نانا کے گھر آتے تھے۔ خالہ نے بتایا کریم الدین ان دنوں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا تھا کہ شکار کا شوق ہو گیا اور بندوق کی ضد کر ڈالی۔ باپ نے بہت سمجھانے کی کوشش کری لیکن غصہ سے بپھر گیا۔ ضد پوری کر کے ہی چھوڑی۔ 'ارے چھوکرے کیسے کیسے خطرناک شیروں کا شکار کیا تھا اس نے' رحیمو کی حیرت کی انتہا نہ تھی کہ اس کا ماموں ضدی تھا، بندوق والا تھا اور شیروں کا شکاری بھی۔ رحیمو کے ماموں کریم الدین کا جو کردار خالہ کے اس بیان سے ابھر کر آتا ہے کہانی کار نورالحسنین کے فن کی بہترین مثال پیش کرتا ہے۔ خالہ کوسنے دیتی ہے اس وقت کو جب کریم الدین کا نصیب پلٹا اور آن کی آن میں اس گڑھی، رئیسوں کے خاندان اور ان کی ساکھ کا بھی شیرازہ بکھر گیا۔

'خداغارت کرے۔ ان تیتروں کو.....ان کا شوق تو اسے اس وقت ہوا جب پولیس ایکشن میں اس کی بندوق چھین لی گئی تھی اور بندوق کیا چھینی گئی گڑھی رئیسوں سے خالی ہو گئی اور ان کی جگہ پہنچے یہ حرام زادے گھسڑی، گونڈ، پھانس پاردی، کیکاڑی اور نہ جانے کون کون' اور پھر آہستہ آہستہ پوری گڑھی کا ماحول بدل گیا۔ ماموں کو اندازہ ہی نہیں ہوا۔ وہ تو اسی غرور میں جی رہے تھے کہ 'لوگ اب بھی انھیں بنا بندوق اور گولیوں کے بڑا شکاری سمجھتے ہیں اور ان کی بات کوئی ٹال نہیں سکتا لیکن رحیمو باہر پھرتا تھا اس پر یہ تلخ حقیقت آشکار ہو چکی تھی۔ وہ اپنے اور ماموں کے لیے لوگوں کے منہ سے تمام مغلظات سن چکا تھا۔ مگر اس کی ہمت نہیں تھی کہ ماموں کو بتائے کہ 'انسانوں کے چہروں پر ایسی آنکھیں آ گئی ہیں جو گڑھی کے باہر کھڑے رہ کر بھی اندر کا حال دیکھ لیتی ہیں۔' رحیمو یہی سوچتا رہا کہ 'ماموں کے اطمینان کے کمبل کو اسی طرح عزت سے ڈھکا رہنے دے' لہٰذا رحیمو سب کچھ اکیلے جھیلتا ہے اور ماموں کو اس تلخ حقیقت کی ذرہ برابر بھی سچائی واضح نہیں کرتا۔ رحیمو کو اس بات کا بھی ملال تھا کہ ماموں کے بیٹوں نے بھی ان کی خبر نہیں لی اور باہر جا کر بس گئے۔ جب اپنے ہی اپنے نہ ہوئے تو پھر.....اختتام تک پہنچتے پہنچتے کہانی اس قدر خوبصورت ہو جاتی ہے کہ کہنا پڑتا ہے 'محبت فاتح عالم' محبتوں کے رشتے کبھی ماند نہیں پڑتے۔ انسان تو انسان چرند پرند بھی محبت کے شیدائی ہوتے ہیں۔ محبت میں وہ طاقت ہے جو نہ کسی بندوق کی گولی میں نہ ذات میں نہ ہتھیار میں۔ کسی چیز میں نہیں۔ اس کے آگے سب کچھ ہیچ۔ واہ! آسمانوں میں اڑان بھرنے والا پنچھی بھی محبت میں گرفتار ہو کر پنجرے میں واپس آ کر خوشی اور اطمینان محسوس کرتا ہے۔ بہت خوبصورت افسانہ لاجواب۔

نورالحسنین ایک بھرے پورے مکمل خاندان کے فرد رہے ہیں انھوں نے ماشاءاللہ آگے پیچھے دائیں بائیں رشتوں کی محبتوں شفقتوں اور روٹھنے منانے کی تمام اداؤں سے بھرپور لطف حاصل کیا ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ پایا کم ہے کھویا زیادہ۔ مشترکہ خاندان دیکھتے ہی دیکھتے مختصر ہو کر فیملی بن گئے ہیں۔ حویلیاں فلیٹوں میں سمٹ آئیں۔

'ایک اداس شام' ایسے ہی جذبات سے بھری کہانی ہے جو آنکھیں نم کر دیتی ہے اور دل اداس۔ بے حد خوبصورت منظر کشی ان مشترکہ خاندانوں کی کہ جہاں رشتے ہوتے تھے محبتیں بستی تھیں، غصہ پیار اور شفقتیں ہر ایک کے حصہ میں آتی تھیں کیا لطف تھا زندگی کا۔ ہمیں احساس ہی نہیں ہم کتنی بڑی دولت سے محروم ہو گئے اپنے ہی ہاتھوں۔ مجھے اپنا ہی ایک شعر اس وقت یاد آ گیا نورالحسنین کے اس افسانے کی نذر کرتی ہوں:

عہدِ نو! اس کب آیا ہمیں بھی یارب
اس نئے وقت کو پہلے سا پرانا کر دے

نورالحسنین کے کہانی محل میں موضوعات کی کوئی کمی نہیں۔ ایک سے ایک منفرد موضوع ان کی کہانیوں میں شمار ہے۔ 'کلمہ گو' ایک ایسی کہانی ہے جو منٹو

کے بابو گوپی ناتھ کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ منٹو کی طرح نورالحسنین بھی بڑی محبت سے اپنے کرداروں کی تخلیق کرتے ہیں۔ 'کلمہ گو' کے 'ابودادا' کیا مجال جو کوئی ابودادا کے آگے بول جائے۔ ابودادا خود اپنا تعارف اس طرح دیتے ہیں:

'تیرے کو مالوم ہے.....؟ میں ایسا ہی دادا نہیں بنا.....بستی میں پوچھ لے.....جو میرے کو غچہ دینے کی کوشش کرتا اس کے دانتاں بھی اس کے ہاتھ نہیں گنتے.....کیا.....؟ دوسرے لوگاں اٹھا کر اس کی جیب میں ڈالتے.....سمجھا.....؟ اور تو میرے کو چٹی دینے کی سوچ را.....ہورے.....؟ دادا کا ہاتھ پوری طاقت کے ساتھ ہوا میں لہرایا اور پھر بھاسکر کی کھوپڑی پر اترنے کے بجائے کرسی کے ہتھے پر گرا، اللہ قسم.....میں جمعہ کو کوئی بُرا کام نہیں کرتا.....بچ گیا تو سالے.....چل نکال سود سمیت میرے سارے روپیہ.....؟'

دادا سود پر روپیہ دیتا عورت پر رال ٹپکاتا جھگڑا کرتا مگر اس بات کا خیال رکھتا کہ جمعہ کی کتنی فضیلت ہے اور کلمہ گو کے کیا معنی ہیں۔ جب بھاسکر بتاتا ہے 'کچھ بھی بولو ابو بھائی لونڈیا ہے پستہ ہاؤس کی حلیم.....بس چاٹتے رہو.....!' تو ابودادا مصنوعی غصے سے کہتا ہے 'ارے کیا بکواس لگائے میاں.....تم کو مالوم ہے نا میں جمعہ کے دن کوئی بُرا کام نہیں کرتا، ارے نماز نہیں پڑھتا تو کیا ہوا.....ہوں تو کلمہ گو.....چلو فون بند کرو، میرے کو آج کچھ اچھے کاماں کرنے' یہ ہے ابودادا جس کے پاس ایک طبیلہ تھا پچیس تیس بھینسیں اس میں پلی ہوتیں دودھ گھی کا کاروبار، طبیلے کے ادھر غریب لوگوں کی جھونپڑیاں دوسری طرف چھوٹے چھوٹے پکے مکانات جن میں کلرک، اساتذہ اور پیشہ ور افراد آباد تھے۔ دادا کو ہر ایک بات کی خبر رہتی کس جھونپڑے میں کون سی لڑکی رہتی ہے۔ کس کی شادی ہونا ہے۔ دادا کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ سب کو ڈانٹتا ڈپٹتا بھی اور فرمائشیں اور ضرورتیں بھی پوری کرتا۔ دودھ کے علاوہ دادا کا بیاض بٹے کا دھندہ بھی تھا جس کی وجہ سے ساری بستی دادا سے جڑی ہوئی تھی۔ ایک دن ایک ماریا برونٹ ابودادا کے پاس آئی اور بولی 'ام ماریا برونٹ.....! ادھر نواب کے ہوسٹل میں رہتا ہے.....!' پھر وہ مسکرائی، 'سنا ہے تم انٹریسٹ پر روپیہ دیتا ہے.....' 'دیتا ہے.....آپ اندر آؤنا.....' دادا کی باچھیں کھل اٹھیں۔ وہ اندر آ گئی اور ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی، 'ام کو دے گا.....؟'

'آپ کو.....؟ آپ کے لیے تو ہم اپنی جان بھی دے دے گا۔' لیکن یہ الفاظ دادا نے کہے نہیں دادا نے تو بس اتنا کہا 'دے گا ضرور دے گا میڈم۔'

ماریا بتاتی ہے کہ 'اما راڈیڈی لندن میں بیمار ہو گیا۔ وہ ام کو روپیہ نہیں بھیجا۔ وہ بھیجے گا تو ام واپس کر دے گا۔ دادا کی ہوس بھری نظریں اس کے منی اسکرٹ سے نکلی ہوئی خوبصورت ٹانگوں پر جمی ہوئی تھیں۔ 'خوبصورت.....بہت ہی خوبصورت وہ بڑبڑایا۔'

ماریا دادا کی نظریں سمجھ جاتی ہے لیکن اپنی ضرورت کے تحت مسکرا کر خاموش رہتی ہے۔ دادا بھی خود کو اچھا ثابت کرنے کی کوشش میں پانچ ہزار روپوں کا بنڈل تھما دیتا ہے۔ یہ بھی بتاتا ہے کہ 'میڈم جمعہ کو ہم کوئی بُرا کام نہیں کرتا.....مسلمان.....کلمہ گو.....'

'اوہ ریلی یو آر گریٹ۔ وہ پھر ایک بار دادا کو دیکھ کر مسکرائی۔

'ہم تم کو بتا دیتا میڈم.....ہمارا روپیہ واپس کر دینا۔ ہم وصولی کے معاملہ میں بہت بُرا آدمی ہے.....'

اوکے.....اوکے.....ہم تمہارے بارے میں سب کچھ جانتا ہے.....تھینک یو.....' وہ ابودادا کی طرف دیکھ کر پھر ایک بار مسکرائی اور خاص ادا سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔'

ماریا برونٹ کے حسن سے دادا کا پورا بدن نہال ہو گیا.....اس کی مسکراہٹ دادا کے دماغ میں فلیش ہونے لگی۔ دادا خوشی سے پاگل ہو گیا۔ دادا کا دل تو بس وہیں اٹک گیا۔ گوری ٹانگیں، کھلا گلا، جان لیوا مسکراہٹ، دادا تو نشے سے چور ہو گیا۔ حالانکہ دادا کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ عورتوں سے جنسی تعلقات کے جھوٹے سچے واقعات، غنڈہ گردی پارٹی شراب بس یہی سب دادا اور اس کے ساتھیوں کی زندگی کا ماحصل تھا۔ لیکن یہ لڑکی دادا کے لیے 'سر سے پیر تک اصلی ملائی تھی' دادا ساتھی دوستوں کو بتاتا ہے 'لڑکی کیا تھی پلا ریڈی کے دکان کی برفی' سارے دوست بھی حیران دادا کو کیا ہو گیا..... دادا کہتا ہے میں تو تڑپ کر رہ گیا..... کیا.....؟ بس باپ قسمت اچھی نہیں تھی.....وہ جمعہ کا دن تھا.....اور تم کو تو مالوم ہے میں ہے سوا اس دن کوئی بُرا کام نہیں کرتا.....' بس یہ جمعہ کا دن ابودادا کے کردار کی خصوصیت بن گیا.....ایک طرف جو ابودادا ایک ایک پیسے کی وصولی پر جان دیتا، دوسری طرف دکھ بیماری، علاج، تعلیم اور ضرورت پر بستی والوں کی مدد بھی کرتا۔ عورت اس کی کمزوری تھی لیکن کبھی بھی اس نے کسی کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ وہ ماریا برونٹ جس کو حاصل کرنے کے لیے دادا سپنے دیکھتا تھا ایک دن خود ہی آ گئی۔

'مین ہم جانتا ہے۔ آج جمعہ کا دن نہیں ہے۔ اما را روپیہ نہیں آیا، اور اب آئے گا بھی نہیں.....!' اس کی آواز بھرا گئی، کیوں کہ اما را ڈیڈی مر گیا اور ہم کو لندن واپس جانا مانگتا.....'

منی اسکرٹ کے باہر اس کی لمبی خوبصورت ٹانگیں مسلسل پہلو بدل رہی تھیں اور ابودادا کا خون کسی سیلاب کی مانند بدن کی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا۔

'مین.....ہم انگریز کمیونٹی کبھی کسی کا احسان نہیں رکھتی اما رے پاس جو کچھ تھا اس سے ام سب کا پیمنٹ کر دیا۔ ابھی تمہارے پیمنٹ کرنے اما رے پاس روپیہ نہیں ہے۔ ام جانتا.....تم روپیہ کے بدلے ام سے کیا چیز لے گا۔ ام وہ تم کو انٹریسٹ کے ساتھ دینے کو آیا ہے.....کم آن.....وصول کر لو.....'

ابودادا کے سامنے حسن بے پردہ ہو رہا تھا اور ابودادا کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ لیکن کہتے ہیں نہ ہر بُرے انسان کے اندر بھی ایک اچھا انسان ہوتا ہے اور وہ کب باہر نکل آئے کچھ نہیں پتہ۔ ابودادا نے بھی ماریا برونٹ کے ساتھ ایسا کچھ نہیں کیا۔ اس کے ٹاپ کے کھلے بٹنوں کو ایک ایک کر کے بند کیا اور بولا 'ماریا ہم بھی مسلمان ہیں.....کلمہ گو.....کس چیز کی کیا قیمت ہوتی ہے وہ ہم بھی جانتا ہے.....' پھر ابودادا نے آہستہ سے ماریا برونٹ کا ہاتھ پکڑا اور بڑے خلوص سے

دروازے سے باہر کر دیا۔ ماریا برونٹ مسکرا پڑی۔ یہ مسکراہٹ پچھلی مسکراہٹ سے بالکل مختلف تھی۔ ابو دادا نے بھی اس مسکراہٹ کو ہمیشہ کے لیے آنکھوں میں قید کر لیا۔

ابتدا سے اختتام تک جس فضا بندی سے دادا کا کردار تخلیق کیا، جس مہارت سے جملوں کی ادائیگی نے بستی کے دادا کی رگ رگ اور نس نس کا بیان کیا قابل تعریف ہے۔ دادا کی شخصیت میں روم روم میں بسا ایک کلمہ گو مسلمان بھلا انگریز کمیونٹی سے کیسے پیچھے رہ سکتا تھا۔ دادا کے اندر کا کلمہ گو انسان جاگ جاتا ہے اور دادا کی فتح ہو جاتی ہے۔

کس کس کہانی پر بات کی جائے، کس کس کا ذکر کیا جائے نورالحسنین کی ہر کہانی خود میں سیکڑوں سوال لیے ہوتی ہے۔ دکھ درد احساس اور جذبات کا سمندر ہر کہانی میں ٹھاٹھیں مارتا ہے۔ درد کی چبھن ٹیس دیتی ہے اور بے حسی جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ ہمارا سماج ہمارا ملک اور یہ دنیا اور اس کے افراد اسی طرح سفر طے کرتے رہیں گے اور نورالحسنین کا قلم اپنی وادی میں اپنوں کے اردگرد کبھی بستی میں کبھی شہر میں تو کبھی نانی دادی، خالہ، ابو اور دادا کے جھولے سے کہانیاں نکالتا رہے گا اور اپنی پٹاری میں جمع کرتا رہے گا ان کی کہانیوں کی پٹاری کبھی خالی نہیں ہوگی۔

''اداس ترین کہانی''

سنہ 1910ء میں امریکہ کے ایک چھوٹے سے مقامی اخبار میں ایک اشتہار شائع ہوا:

''ہاتھ سے بنے ہوئے چھوٹے بچے کے کپڑے اور ایک جھولا برائے فروخت۔ دونوں استعمال نہیں ہوئے''

شاید اسی اشتہار کو پڑھنے والے کسی نامعلوم شخص نے برسوں بعد وہ کہانی تخلیق کی جو آج بھی دنیا کی اداس ترین کہانی سمجھی جاتی ہے۔ عام طور پر ہیمنگوے سے موسوم اس مختصر کہانی میں صرف چھ لفظ ہیں۔

ForSale:babyshoes,neverworn

(برائے فروخت: بچے کے جوتے، جو کبھی پہنے نہیں گئے)

چھ لفظوں میں ماں کی محبت، باپ کی امنگ، بہنوں اور بھائیوں کے ارمان سب ایک لمحے میں فنا ہوتے دیکھنے ہوں تو یہ کہانی ایک دفعہ دل سے پڑھ لیجیے۔ مجھے لگتا تھا کہ دنیا کی سب سے اداس کہانی لکھ دی گئی ہے۔ اب اس سے آگے کیا ممکن ہے۔ پھر کابل یونیورسٹی میں ایک دن امید مہریار کو ایک پیغام ملا۔ کابل یونیورسٹی کا قتل عام تو یاد ہوگا۔ نوجوان طالب علموں کی لاشوں کے ساتھ ان کے سامان کو اکٹھا کرتے ہوئے موبائل فونز پر لگاتار آنے والی کالز کا کوئی کیا جواب دیتا اور اور بھی اس وقت جب کالر سکرین پر ماما یا بابا لکھا نظر آ رہا ہو۔ امید مہریار میں بھی یہ ہمت نہ تھی اس لیے گھنٹیاں بجتی رہیں اور وہ بس دیکھتے رہے۔ ایک مقتول طالبہ کے فون پر ایک سو بیالیس دفعہ کال آئی پر کون اٹھاتا، کون جواب دیتا۔ پھر شکستہ فون کی سکرین پر وہ پیغام آیا جو اب بھی مجھے سونے نہیں دیتا:

''کجا ہستی، جان پدر'' (کدھر ہو، بابا کی جان)

دنیا کی سب سے اداس کہانی اب انگریزی میں نہیں، فارسی میں تھی۔ میں کبھی کبھی اپنی بیٹی کی تصویر دیکھتا ہوں اور اس باپ کا تصور کرنے کی کوشش کرتا ہوں جو اپنی جان سے عزیز متاع کے بارے میں بس یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔ لیکن یہ تصور بھی نہیں کیا جاتا۔ خیال کی دنیا میں ابھی اتنی وسعت نہیں ہے کہ اس میں اتنا غم سما سکے۔ ایک دفعہ پھر یہی سوچا کہ اس سے زیادہ دلخراشی اور کیا ممکن تھی پر مجھ کے قاتل میری سادگی پر کہیں دور سفا کی سے ہنستے تھے۔ اشفاق صاحب نے فیض احمد فیض کے بارے میں لکھا تھا کہ اگر فیض صاحب حضور کے زمانے میں ہوتے تو ان کے چہیتے غلاموں میں سے ہوتے۔ جب بھی کسی بدزبان، تندخو، بداندیش یہودی دکاندار کی دراز دستی کی خبر پہنچتی تو حضور کبھی کبھی ضرور فرماتے: آج فیض کو بھیجو، یہ دھیما ہے، صابر ہے، بردبار ہے، احتجاج نہیں کرتا، پتھر بھی کھا لیتا ہے۔ ہمارے مسلک پر عمل کرتا ہے۔ ہزارہ بھی حضور کے اسی مسلک کی مثال ہیں جس کی تصویر کبھی فیض صاحب کی شکل میں اشفاق احمد کو نظر آئی تھی۔ وہ خوبصورت ہیں، دلجو ہیں، دلکش ہیں، دھیمے لہجے میں بات کرتے ہیں۔ شکایت بھی کرتے ہیں تو ایک خوشبو سی مہک جاتی ہے پر خوشبو کے ہاتھ کو تھامنے والے مہربان بادل ہماری زمینوں سے روٹھ گئے ہیں اور بدزبان، تندخو اور بداندیش صرصر خوشبو کو مٹانے پر ہر وقت بضد رہتی ہے۔ گیارہ نوجوانوں کو ذبح کر دیا گیا کہ وہ حضور کے مسلک پر عمل کرتے تھے۔ ان میں وہ بھائی بھی تھا جو کوئلے کی کان میں اس لیے کوئلہ ہوتا تھا کہ اس کی چھ بہنیں پڑھ سکیں۔ ایک بہن کا نام معصومہ ہے۔ معصومہ کے پاس بولنے کو، شکایت کرنے کو، ریاست کو، حکام کو برا بھلا کہنے کو بہت کچھ تھا۔ پر ٹوٹی آواز میں جب وہ بولی تو صرف یہی کہہ پائی:

''بھائی کا جنازہ اب ہم بہنوں کو اٹھانا ہے کیونکہ گھر کے سب مرد ختم ہو گئے ہیں''

دیکھیے، یوں ایک فقرے میں دنیا کی اداس ترین کہانی اب انگریزی میں نہیں، فارسی میں نہیں، اردو میں ہے، ہزارہ میں ہے۔ اب اس پر فخر کرنا ہے یا شرم سے سر کو جھکانا ہے، یہ میں آپ پر چھوڑ دیتا ہوں۔

حاشر ابن ارشاد (کراچی)

''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ''

پروفیسر علی احمد فاطمی
(الٰہ آباد)

ایک خیال ہے کہ ناول کی تمام قسموں میں سب سے مشکل قسم تاریخی ناول کی ہوتی ہے۔ اس مزاج کے ناول تاریخ اور ناول کے مفکّرانہ و فنکارانہ امتزاج و انجذاب سے وجود میں آتے ہیں۔ امتزاج کی کوئی نہ کوئی صورت اور کیفیت تو ہر قسم کے ناولوں میں ہوتی ہے، لیکن تاریخی ناول میں دو متضاد عناصر کو یکجا کر کے اسے اولاً اور آخراً فکشن یا ناول کی ہیئت اختیار کرنی پڑتی ہے۔ متضاد ان معنوں میں کہ تاریخ کا انحصار حقائق پر ہوتا ہے اور فکشن کا بڑا حصّہ تصور و تخیل سے وابستہ ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں تاریخی ناول میں حقیقت اور رومانیت کا خوبصورت و معنی خیز تال میل بنانا پڑتا ہے اور ناول نگار کو ہمہ وقت یہ خیال بھی پریشان کرتا رہتا ہے کہ وہ تاریخ نہیں بلکہ ناول لکھ رہا ہے، اس لئے ترجیح تو ناول نویسی کو ملتی ہے۔ ناول کے فن کی بالادستی رہتی ہے۔

اس فنّی و تخلیقی عمل میں درمیانِ تخلیق کبھی کبھی تاریخی حقائق مبہم ہوتے ہیں اور کبھی مسخ بھی جس کی اجازت تاریخ داں نہیں دیتے۔ اکثر تاریخی شعور رکھنے والے قاری بھی۔ لیکن اب اس کا کیا کیا جائے کہ فنّی تقاضوں کے تحت ناول نگار کو اپنے ناول کے لئے کبھی کبھی ایک فرضی پلاٹ کی تشکیل کرنی پڑتی ہے اور کچھ خیالی کردار بھی گھڑنے پڑتے ہیں۔ واقعات میں لچک، کبھی کبھی توڑ مروڑ بھی کرنی پڑتی ہے جس سے تاریخی ناول اکثر ناول تو بن جاتے ہیں لیکن کبھی کبھی حقائق مشتبہ اور مشکوک بھی ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے اکثر تاریخی ناول نگار ان تمام نزاکتوں اور خطروں سے بچنے کے لئے ماضی بعید کا سہارا لیتے ہیں، جہاں حقائق اکثر تاریک یا دُھندلے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ناول نگار کے تخیّل کو آزادرہنے کی سہولت مل جاتی ہے۔ جہاں حقیقت رومانیت کی شکل اختیار کر کے تخلیقیت میں ڈھل جاتی ہے۔ اسی لیے تاریخی ناول اکثر رومانی ناول ہو جاتے ہیں، جن میں تاریخی بصیرت، ثقافت اور اس عہد کی عوامی زندگی اور جدوجہد کا فُقدان نظر آتا ہے۔ اردو میں جس کی مثال عبدالحلیم شرر کے ناول ہیں، جو تاریخی ناول کہلائے ضرور گئے لیکن اصلاً وہ نیم تاریخی اور نیم رومانی ہیں اور بعض تو پورے کے پورے رومانی ہیں۔

ہندوستانی ادب میں تاریخی ناول ایک خاص عہد میں اور ایک خاص ضرورت کے تحت لکھے گئے۔ جب حال کمزور ہوتا ہے تو ماضی کی صحت و عظمت اور شان و شوکت بالقصد یاد کی جاتی ہے۔ عظمتِ رفتہ کو دہرایا جانا ضرورتِ وقت کے عین مطابق ہوتا ہے۔ اسی لیے اردو میں ۱۸۵۷ء کے بعد تاریخی ناول زیادہ لکھے گئے جب ہندوستانی سماج اور مسلم معاشرہ کئی طرح کے بحران سے گذر رہا تھا۔ بیسویں صدی اور اب اکیسویں صدی میں ان کی تعداد نہ کے برابر ہے اور جو لکھے بھی گئے ہیں ان میں قاضی عبدالستار کے دو ایک ناولوں کو چھوڑ کر زیادہ تر ناکام ہی رہے۔ برسوں بعد بیسویں صدی کے آخر میں دو ایک ناول ''دل مُن اور ''عزازیل'' از یعقوب یاور ''ویرگاتھا'' از سلیم شہزاد قابلِ ذکر ہیں اور اب نورالحسنین کا نیا ناول ''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' ہے جو گذشتہ دنوں منظرِ عام پر آیا ہے۔ ایسی صورت میں نورالحسنین کا یہ کہنا ''میرے ہم عصروں میں تاریخی موضوعات پر کوئی ناول نہیں لکھا۔ البتہ دیگر سماجی، سیاسی، معاشرتی موضوعات پر انھوں نے اچھے ناول لکھے ہیں'' غلط ہوگا۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ پر اہم ہے کہ عہدِ حاضر میں تاریخی ناول اور وہ بھی ماضی قریب سے متعلق یہ پہلا تاریخی ناول ضرور ہو سکتا ہے۔

اب میں براہِ راست نورالحسنین کے ناول کے متن و مواد پر گفتگو کروں گا۔

ناول کا آغاز ایک قبرستان کے ویران اور سرد منظر سے ہوتا ہے، جہاں چند مجاہدینِ آزادی انگریز حکومت کے خلاف جیسے گفتگو کر رہے ہیں اور صبح ہونے کا انتظار بھی۔ ۱۸۵۷ء کے قبل کا ماحول، انگریزوں کے خلاف بغاوت کے آثار، اس بغاوت میں ہندو مسلم، مرد عورت سبھی شریک ہونے کو تیار۔ چنانچہ جو کردار قبرستان میں نظر آتے ہیں ان میں حیدر خاں، پنڈت، تارا بائی، دینا ناتھ وغیرہ سب کہ سب وطن پرست اور انگریز مخالف ہیں۔ چاروں طرف بقول مصنف ''فرنگیوں کے خلاف نفرت کی آندھیاں اُٹھ رہی ہیں۔ بس چنگاری کی دیر ہے۔ دیکھنا برٹش سامراج کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔''

دوسرے باب میں سید اختر علی ہیں۔ دہلی کا بازار، مسجد بھی ہے اور گلابو بھٹیارن بھی۔ مرزا حکمت یار جو مرغ کے علاج کے لئے فکرمند ہیں۔ نیلوفر اور ان کے عاشق سلیم بھی ہیں۔ غدر کے آثار اور حالات اپنی جگہ اور روزمرّہ کی زندگی اپنی جگہ اور عشق و محبت اپنی جگہ پر کہ انسان بڑے سے بڑے حالات میں بھی اپنی فطرت سے الگ نہیں رہ پاتا۔ اس کے بعد پھر وہی قبرستان، رات اور سردی۔ وہی لوگ اور وہی آگ جو الاؤ میں ہے وہی باغیوں کے سینے میں بھی ہے اور یہ جملہ:

''اے چاند تو گواہ رہنا ہم لوگ بنا کسی گناہ کے بے گھر ہوئے ہیں۔''

''اے چاند تو شاہد ہے ہماری راتوں کا، ہماری بے بسی کا۔''

اس کے بعد ایک کہانی کا آغاز جو تارا سے متعلق ہے۔ کسی کا انتظار بھی ہے جو اودھ سے آ رہا ہے۔ اودھ یعنی واجد علی شاہ، جن کو انگریزوں نے گدّی سے اودھ کی تاجداری سے دستبردار کر دیا۔ حیدر خاں کا یہ جملہ غور طلب ہے:

''رنگ منچ کا نٹ اگر دربار میں بھی لیلیٰ مجنوں کا ناٹک کھیلے گا تو وقت اس کے ساتھ یہی سلوک کرے گا۔''

اور ایک نئی گفتگو یا بحث سامنے آتی ہے کہ کیا بادشاہ، راجہ مہاراجہ کو شاعری یا فنونِ لطیفہ سے دلچسپی نہیں رکھنی چاہئے۔ ان کے لئے صرف تلوار کی مہارت کافی ہوا کرتی ہے۔ مغل بادشاہوں میں کئی ایسے تھے جو فنِ شاعری، مصوری یا تعمیر کا بہترین ذوق و شوق رکھتے تھے۔ ایک سوال کے جواب میں حیدر خاں کا جواب یہ ہے:

''وہ جانتے تھے کہ کب لکھنا چاہئے اور ملکی انتظام کس طرح کرنا چاہئے۔ان میں تلوار اٹھانے کی طاقت تھی۔اپنے حق کے لئے وہ بغاوت بھی کر سکتے تھے۔''

اور پھر یہ بھی:

''آپ کے واجد علی شاہ تو دن رات راس لیلا میں ڈوبے رہتے۔ طوائفیں دربار کا حصّہ ہوگئیں اور نواب عورت رنگیا ہوگیا۔اس کا اثر رعایا پر بھی پڑا۔ گھروں سے سپاہیوں کے بجائے شہدے بھانڈ اور بے فکرے باہر نکلنے لگے۔''

یہ ایک باغی کا تبصرہ ہے، ماہر کا نہیں تاہم یہ باتیں غور طلب ہیں اور شاید بحث طلب بھی۔لیکن اس جملہ سے وطن پرستی کی بو آتی ہے۔

''اب بھی وقت ہے سنبھلنے کا ورنہ سارا ہندوستان ایک دن بڑا قبرستان بن کر رہ جائے گا۔''

غالباً اسی لئے اس ناول کا آغاز قبرستان سے ہوتا ہے کہ اس وقت تک ملک ایک چھوٹا قبرستان تو بن ہی چکا تھا۔لیکن یہی قبرستان ان باغیوں کی پناہ گاہ تھا۔غم وغصّہ کی آماجگاہ بھی۔اسی لئے دھندلے الاؤ کی چنگاری میں تڑپ ہے اور تلملاہٹ بھی، جسے مصنف نے بڑے علامتی ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ نیز باتوں اور مکالموں کے ذریعہ اس عہد کی سماجی اور معاشرتی زندگی کا ہلکا سا عکس بھی سامنے آتا ہے جو تاریخی ناول کا وصفِ خاص ہوا کرتا ہے کہ کس طرح لوگ ان حالات میں بھی عیش وعشرت اور مختلف قسم کی بازیوں میں مصروف تھے۔ یہ عشرت ایک طرح کی فراریت بھی تھی۔ دہلی میں بالکل ایسا نہ تھا یہ کہہ پانا مشکل ہے۔ ناول میں دہلی اور لکھنؤ کی معاشرت، تہذیب وثقافت کی کچھ ایسی امتزاجی تصویر ابھرتی ہے کہ انفرادی ثقافت کی شناخت کی رو سے سوال قائم ہو سکتے ہیں، لیکن ناول کی تخلیقیت کی رو سے شاید یہ مسئلہ زیادہ اہم نہیں۔ناول نگار نے اکثر مقام پر بے تکلف مکالموں، محاوروں اور کہیں کہیں دمادم مست قلندر پر رقص وغیرہ کے ذریعہ جو تخلیقی فضا قائم کرنے کی پُرکشش وپُرتاثیر کوشش کی گئی ہے اس سے بہرحال ناول نگار تخلیقی فضا بنانے میں کامیاب نظر آتا ہے اور کسی بھی تاریخی ناول کی اس نوع کی ترتیب وتخلیق اکثر اس کی کامیابی کی ضمانت دار ہوتی ہے۔

قبرستان میں دمادم مست قلندر کا جوش بیحد معنی خیز ہے۔اس کے بعد اودھ کے حالات بارود کا ڈھیر اور حیدر خاں کا یہ جملہ:

''دوستو! میں ایک بڑے انقلاب کی آہٹ محسوس کر رہا ہوں۔''

اودھ بندیل کھنڈ کے ذریعہ پورے ملک میں انقلاب کی لہر پھیلنا اور پھر دکن تک پھیل جانا۔

خاموش قبرستان میں کسی شخص کی آمد دراصل انقلاب کی آمد ہے۔ انتظار ہے انقلاب کا لیکن پھر یہ جملہ:

''اور انتظار قبرستان کی پھاٹک پر لٹک گیا۔''

اس طرح کے جملوں سے مصنف نے قدم قدم پر یہ خیال رکھا ہے کہ ناول کی فضا قصّہ پر ہی رہے اور اسی تکنیک میں اس کا ارتقا بھی ہو۔ درمیان میں محبت کی آمد یعنی چنبیلی کی آمد۔اتحاد اور قوّت کی آمد کا استعارہ بنتی ہے کہ اس دائرۂ عمل میں مرہٹہ سردار سبھی آجاتے ہیں، لیکن دلّی کبوتر بازی اور شعروشاعری میں مصروف اور مغل بادشاہِ قلعہ میں محصور۔لیکن آزادی کے یہ دیوانے قبرستان میں ایک نئی صبح کی یعنی آزادی کے انتظار میں دیوانے ہو رہے ہیں۔مصنف نے اس دیوانگی اور آمدِ صبح کی ملی جُلی کیفیت کو اس انداز میں پیش کیا ہے:

''سپیدی آسمان سے اُتر رہی تھی۔صبح اپنی آمد کا انتظار کر رہی تھی اور یہ قافلہ قبرستان کی پھاٹک سے نکل رہا تھا۔''

اچھی بات یہی ہے کہ مصنف نے تاریخ کو مس کرتے ہوئے اور اس کی صداقتوں کو مسخ کئے بغیر اس ناول میں ناولیت کی فضا قائم رکھی ہے جس سے مکالموں میں، منظروں میں جوش وخروش میں حقیقت اور صداقت میں ایک ربط و معنویت پیدا ہوگئی ہے۔

ایک اچھا ناول تضادات سے ابھرتا ہے۔اسی سے کشاکش اور کشمکش کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ورجینا وولف نے کہا تھا کہ زندگی میں تضاد ہے تو ناول میں بھی ہوگا اور ایک اچھے ناول کی یہی خصوصیت ہے کہ وہ زندگی کی طرح باہم متصادم ہو۔ یہ تصادم خیر وشر کا ہوسکتا ہے اور تضاد کا بھی۔اس ناول میں بھی تضاد ہے کہ ایک طرف حیدر خاں اور اس کے ساتھی ہیں جو وطن کو آزاد کرانے کے لئے بغاوت پر آمادہ ہیں اور بے گھری اور آزاری کے عمل سے گذر رہے ہیں، تو دوسری طرف ایسا طبقہ بھی ہے جو ان تمام آزاد وآثار سے بے پروا اپنے کوزے میں بند ہے۔اختر علی سلیم کو شعرو شاعری کا سبق سکھا رہے ہیں اور حسن کا سطحی روایتی تصور سمجھا رہے ہیں:

''تم حسن کے ناز وانداز کیا جانو۔تمھیں حسن وعشق کی لذّتوں کا کیا خاک اندازہ ہوگا؟ اور یہ کہ تمھیں کیا پتہ کہ محبوب کی حیرت زدہ آنکھیں کیا ہوتی ہیں۔اس کے انداز کیا ہوتے ہیں۔''

دیکھئے تضاد زندگی کا، حالات کا، کہیں آزادی ہے تو کہیں فراری، کہیں آزاری ہے تو کہیں شعروشاعری۔ یہ زندگی کے متضاد دھارے ہیں جو ساتھ ساتھ بہتے رہتے ہیں۔ادب کی تخلیق انھیں دھاروں سے آبشار کی طرح اپنا ایک الگ روپ پیش کرتی ہے جہاں کرب آمیز نشاط یا نشاط آمیز کرب ہے۔ایک طرف ملک کی حقیقت اور سیاسی بدحالی ہے تو دوسری طرف سلیم اور نیلوفر کا رومان۔ یہ رومان سرسری اور جلد بازی کا ہے، ورنہ اصل کہانی تو حیدر خاں اور ان کے باغی ساتھیوں کی ہے۔ بغاوت کی، آزادی اور کہیں کہیں حیدر خاں کے ماضی کی بھی۔اس لئے ۵۷ء کی بغاوت چند روزہ قصّہ نہیں بلکہ دہائیوں کی داستان ہے۔مغل بادشاہوں کے اندرون کا بیان بھی اور درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء کے عقیدت مندان بھی ہیں۔ یہ منظر دیکھئے:

''درگاہ کی طرف لوگوں کے قافلے کے قافلے رواں تھے۔کوئی پاپیادہ تھا، کوئی سوار تھا۔کوئی چادر اوڑھے ہوئے تھا، کسی کے ماتھے پر تِلک چمک رہا تھا اور کوئی گھونگھٹ کاڑھے چلا جا رہا تھا۔''

درگاہ، قوّالی، فقیر اور مجمعِ عام جس میں حیدر خاں بھی شامل۔لیکن

اس کی دعاء صرف اتنی:

''میں بس آپ کی سرزمین کو ان فرنگیوں سے پاک دیکھنا چاہتا ہوں۔''

اور وہاں قوّالی ہو رہی تھی۔

بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی

ڈگر پنگھٹ کی

حیدر اور ان کے باغی ساتھی ملک کی سلامتی اور آزادی کی دُعائیں مانگ رہے تھے اور کچھ لوگ:

''ہندوستانی پکتے رہے۔ دین و ایمان کے سودے ہوتے رہے۔ غدّار اور مکّار قوم کو دھوکہ دیتے رہے۔''

یہ بھی صرف ناول کا نہیں زندگی کا، انسان کا تضاد ہے جو ازل سے ابد تک رہے گا۔ اسی لئے تو شاعر نے کہا ہے ''بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی۔''

یہ مناظر ناول کو نہ صرف دلچسپ بلکہ معنی خیز بناتے ہیں۔ قوّالی، درگاہ، دُعا، آزادی، غدّاری یہ سب ایسی متضاد حقیقتیں ہیں جو لاشعوری طور پر زندگی اور ناول کا حصّہ بنتے جاتے ہیں۔

آگے ناول کچھ ڈرامائی شکل اختیار کرتے ہوئے ایک نئے کردار طالب احمد کے ذریعہ اس منزل پر پہنچتا ہے جب میرٹھ میں فوجی کارتوس پر سخت اعتراض کر رہے تھے اور قبرستان میں چھپے باغی اس اعتراض کو بغاوت میں تبدیل دیکھنے کے لئے بیتاب تھے اور بار بار کہہ رہے تھے ''نجام الدین اولیا جگ اجیارو۔''

اور پھر ایک دن بیچ ناتھ، چاند خاں اور ان کے دوسرے ساتھیوں نے کھلے عام کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا کہ ہندوستان، تہذیب اور کلچر کے معاملات میں تو بڑی حد تک سمجھوتہ کر سکتا ہے لیکن مذہب کے معاملہ میں نہیں۔ اسی لئے چاند خاں کہتا ہے:

''مذہب ہمارے لیے اوّل ہے اور ہم سب اپنے مذہب پر جان دے دینا معمولی بات سمجھتا ہے۔''

ٹھیک اسی مقام پر قلعے کے اندر کا ماحول بھی دکھایا گیا ہے جو زبان و بیان کے اعتبار سے دلچسپ ہے۔ ناول نگار نے اس فرق کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے کہ قبرستان میں بیٹھے باغی کی زبان، لہجہ اور تیور انگریز فوجیوں کی ٹوٹی پھوٹی زبان اور قلعے معلّیٰ کی زبان کی شگفتگی جہاں خواب، نیند اور منزل تو ہے لیکن منزلِ مقصود تک پہنچنے کی ہمت اور طاقت نہیں۔ اس لئے شعر و شاعری ہے اور غزل گوئی ہے اور یہ شعر۔

وقت پیری شباب کی باتیں

ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

لیکن شاعر ملک کے حالات سے بے خبر اب بھی محبوب کے قدموں میں جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کرنے کو بیقرار ہے۔ لیکن بوڑھے بادشاہ کا جوان ملکہ کا پوری طاقت کے ساتھ بھینچ لینا اور مرتبان سے کشتے کا چاٹنا عجیب سا ضرور لگتا ہے، عین ممکن ہے کہ اس میں فرار و پناہ کی کیفیت شامل ہو۔ ہر چند کہ یہ بے خبری معصومانہ نہ تھی اور محض شاعرانہ تھی اور ان سب پر اس عہد کی سماجی اور سیاسی حالت کا ایک غُبار بہر حال چھایا ہوا تھا جسے مصنف نے منظر بدلنے یا قاری کا ذائقہ بدلنے کے لئے پیش تو کیا لیکن اب کیا کیا جائے کہ عوامی زندگی سے الگ تھلگ یہ مناظر بے جان اور بے کیف سے لگتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ایسے مناظر ناول نگار کے مشاہدے اور تجربے سے غیر متعلق تھے۔ کتابی مطالعہ کی بنیاد پر اور تصور کے ذریعہ پیش کئے گئے ان مناظر میں حقیقت اور فطرت کا گذر ممکن نہیں۔ لیکن یہ بھی ہے کہ مصنف کی کم، اور تاریخی ناول کی اپنی فنّی مشکل ہوا کرتی ہے کہ بادشاہ کے کردار کی زبان ہی نہیں عمل میں بھی وہ خُوک و احتشام ضروری ہے اور وہ تمام لوازمات بھی جو مغل تہذیب و احترام کے داعی ہوا کرتے تھے اور ایک مخصوص تہذیبی جمالیات کا اشاریہ بھی۔ دوسری طرف ناول میں کشاکش اور تضاد بھی ضروری ہوا کرتا ہے اور اس ناول کا جو موضوع اور مُدّت ہے وہ بحرانی اور عبوری ہے، جہاں خیالات و نظریات باہم متصادم تھے۔ غم و غصّہ تھا، جوش و ولولہ تھا، بغاوت تھی اور فراریت بھی۔ لیکن یہ فراریت کب تک۔ وہ نوبت آ ہی جاتی ہے جب اختر علی کی محفلوں کی ادبی بحث حالاتِ حاضرہ کی طرف مُڑ جاتی ہے۔ مشرف عالم ذوقی نے اچھی بات کہی ہے:

''۱۸۵۷ء جہاں آزادی کے احساس کے ساتھ ایک بڑی نظریاتی تبدیلی غلام ملک کے سماجی اور سیاسی ڈسکورس کا حصّہ بن رہی تھی۔ ماضی اور حال کی کشمکش کے یہ ناول حقیقت اور اظہار کا راست بیان ہے۔''

حالانکہ تاریخی ناول میں راست بیانی اکثر بے کیف ہوا کرتی ہے نیز وہ ناول کے تاریخی ماحول کو بھی متاثر کرتی ہے لیکن اس ناول کی تخصیص یہ ہے کہ حالات و حادثات کو عوامی کرداروں کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے اور صرف حادثات ہی نہیں بدلتے ہوئے نظریات بھی تہذیبی بساط کی اُلٹ پھیر اعلیٰ طبقہ کو متاثر کر رہی تھی جسے کچھ امراء و نوابین بچانے میں مصروف اور کچھ لُٹانے میں اور کچھ جیالے ظلم و ستم سے نبرد آزما ہونے اور ملک کو غلامی سے نجات دلانے میں مصروف کہ سماج کا کوئی بھی خونریز واقعہ ہر طبقہ کے دل و دماغ کو مرتعش کر جاتا ہے۔ جمی جمائی بساط اُلٹ جاتی ہے۔ اس ناول میں تہذیبی سطح پر یہ تقلیب کم کم ہی دکھائی دیتی ہے کہ اصل زور تو بغاوت پر ہے۔ تاہم بعض اشارے، ناول کے بعض اقتباسات ناول کی جہت و پرت میں اضافہ کرتے ہیں اور اسے عمدہ ناول بنانے میں مدد کرتے ہیں۔ چاندنی چوک کا یہ منظر دیکھئے:

''وہ دلّی یوں ہی تو ہندوستان کا دل نہیں تھی۔ دن کیا نکلتا تھا گویا عید کا چاند دیکھ کر ہی نکلتا تھا۔ چاندنی چوک کی سڑک فردوسِ بریں کا روپ دھارن کر لیتی۔ حُسن لازوال کی پریاں ماہتابوں کی صورت سیاہ نقابوں میں جھانکتی ہوئیں اس طرح اٹھلاتیں گویا آسمان سے کہکشاں زمین پر اُتر آئی ہے۔ جسے دیکھو چندے ماہتاب و آفتاب گویا دلّی کا چاندنی چوک نہیں کوہِ قاف کا کوئی بازار ہے اور پریاں اٹھلاتی پھر رہی ہیں۔۔۔ رنگ برنگے دوپٹّے لہرا رہے ہیں۔ کامدانی کاموں سے مزیّن سُرخ، نیلے پیلے سبز بنفشی اطلسی گہرے دار لہنگے، زمین پر

خوبصورت جوتیاں چٹخ رہی ہیں۔''

اورایک مختلف منظر یہ بھی:

''مہادیو جی کی سنگی مورت کے پائین پنڈت جی بیٹھے ہیں۔ایک پتّھر پر صندل گھِس رہے ہیں۔مہادیو جی کی مورت درشن دے رہی ہے۔ عقیدت مند ہاتھ جوڑے سر کو جھکا رہے ہیں اور پنڈت جی صندل میں اُنگلیاں ڈبو رہے ہیں اور ماتھے پر خوشبو بکھیر رہے ہیں۔''

ایک منظر شاہانہ بھی دیکھئے:

''سواری منتظر تھی۔بخت رواں کا سنہری ہودا تھا اس میں زربفت کی مسند اور گاؤ تکیہ لگا ہوا تھا۔سواری پر مخملی پردے جھول رہے تھے۔صحن میں خواجہ سرا اور خواصِ شاہی باادب کھڑے تھے۔''

ان رنگارنگ تحریروں سے نہ صرف اس عہد کی دلّی کے حالات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے بلکہ تاریخ وتہذیب کے دلکش مرقعے نظروں کے سامنے گھوم جاتے ہیں۔تاریخی ناول کا ایک بڑا وصف یہی ہے کہ وہ قاری کو اس عہد میں پہنچا دے۔اس عہد کی تہذیبی، ثقافتی اور سماجی زندگی کے دھڑکتے ہوئے مناظر قاری اوراس کی قرأت کے ذوقِ جمال کو کچھ اس انداز سے تسکین پہنچائیں کہ ناول کا فن اور مواد کی فکر دونوں کچھ اس انداز سے تخلیقی وجدان میں رچ بس جائیں کہ تھوڑی دیر کے لئے قاری کی رسائی نہ صرف اس عہد تک ہو جائے بلکہ وہ اسی ثقافت و معاشرت میں سانس بھی لینے لگے اور تمام نقل وحرکت، عمل وارتقا اس کے رگ و ریشہ میں سما جائے۔نورالحسنین نے جابجا اس کی کامیاب کوشش کی ہے۔خاصی محنت کی ہے، مطالعہ کیا ہے اور کرداروں کے حوالے سے یہ بھی کہلوایا ہے:

''بندہ آج بھی دربار سے وابستہ ہے اور گواہی دیتا ہوں کہ آج بھی کوئی کمی نہیں آئی۔آپ کو بتادوں کہ کارخانے جات خاصہ کلاں، خاصہ خورد، آب دارخانہ، دواخانہ، توشے خانہ، جواہر خانہ، اسلحہ خانہ، اصطبل بگھّی خانہ، توپ خانہ، شتر خانہ، رتھ خانہ، پالکی خانہ، داروغہ کہاراں، داروغہ خاص، خواجہ سرایاں، فوج مختلف پلٹن موجود ہیں اور سرکار عالیہ سے تنخواہ پاتے ہیں۔''

بادی النظر میں لگتا ہے کہ محض شمار وقطار اور لسانی شان وشوکت کے لئے یہ اقتباس آ گیا، لیکن اختر علی کا تبسّم اور تشکیک کا لطیف انداز اسے سنبھال لیتا ہے لیکن اختر علی کی بیٹی نیلوفر اور سلیم کے رومانی تعلقات مصنوعی سے لگتے ہیں۔کبھی کبھی یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ ناول نگار غیر ضروری طور پر رومان کا تڑکا لگاتا چل رہا ہے تاکہ رومان کی چاشنی تاریخ کی خشکی کو سنبھالے رکھے اور توازن قائم رہے۔

یہ سارے مناظر ثقافتی سطح پر ناول میں ایک فضا ضرور بناتے ہیں لیکن ناول کی اصل اٹھان اور ارتقا تو حیدر علی کے ساتھیوں کے ذریعہ ہوتا ہے جن میں ہندو بھی ہیں اور خواتین بھی اور صوفیوں سنتوں کے تذکرے بھی کہ ابتداً انھوں نے ہی مجاہدانہ عمل کے سبق سکھائے۔شیر اور بکری کی کہانی، منگل پانڈے کی قربانی۔نتیجتاً میرٹھ کی فوجی بغاوت، قتل وخون ''مارو، کاٹو، آگ لگادو۔'' اور ساتھ ہی نعرۂ تکبیر اور ہر ہر مہادیو کے نعرے، شاید اس لئے کہ کارتوس استعمال نہ کرنے کے پیچھے مذہبی جذبہ کام کر رہا تھا۔میرٹھ کی آگ دلّی تک پہنچی، لیکن قلعۂ معلّیٰ میں رقص وسرود کی محفل آراستہ تھی۔ادھر طبلے کی تھاپ ادھر گھوڑوں کی ٹاپ۔کچھ محبت، کچھ نفرت۔غرضکہ یہاں بھی قتل وخون کا بازار گرم ہو گیا۔

دہلی کی اس گرم بازاری کا اثر قلعے کے اندرون میں پڑنے لگتا ہے۔ اختر علی کے گھر میں بھی اثر دکھائی دیتا ہے لیکن سلیم کی محبت اس نازک اور گرم موقعے پر چھلکی پڑتی ہے جو بظاہر عجیب سی لگتی ہے اور نہ ہی دہلی کی سماجی اور عوامی زندگی کا نقش ابھرتا ہے، البتہ حیدر کی منھ بولی، بہن تارا نے میرٹھ کا حال بیان کیا:

''حیدر بھائی زندگی کو اس طرح بلکتے ہوئے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔انقلاب کے نام پر انسان، انسان کو ایسے کاٹ رہا تھا جیسے رسوئی کے لئے سبزی ترکاریاں کاٹی جاتی ہیں۔خون پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔چیخ وپکار ایسی کہ کلیجہ منھ کو آ رہا تھا اور کسی کے دل میں نام کو رحم نہیں۔'' اور یہ سوال بھی:

''حیدر بھائی کیا ہم ایسے ہی خونخوار انقلاب کی راہ دیکھ رہے تھے۔؟''

تو حیدر کا جواب تھا:

''ہمیں ایسے انقلاب کا انتظار نہیں تھا، لیکن ایسا ہمیشہ ہی ہوتا ہے۔ ہر فاتح مفتوح کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتا ہے۔۔۔ہر انسان سوچتا ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہئے لیکن ہر بار ایسا ہی سب کچھ ہوتا ہے۔''

کیا معرکے کے جملے ہیں۔اگر محبت ایک جذبہ ہے اور آگے بڑھ کر ایک فلسفہ بھی تو اس کے برعکس نفرت وعداوت بھی ایک جذبہ ہے۔اندھا جذبہ کہ اس کی لپیٹ میں آدرش اور اصول اکثر قتل ہو جاتے ہیں۔آگے چل کر مہاتما گاندھی نے عدم تشدّد کا سہارا لے کر تحریکِ آزادی چلائی۔آزادی ملی، لیکن تشدّد سے پُر۔قتل وخون سے لبریز۔ایسے میں تجربہ کار، جہاں دیدہ حیدر خاں کا یہ کہنا ''ہر بار یہی سب کچھ ہوتا ہے۔'' اس ہر بار میں صدیوں کی انسانی تاریخ کا ایک ایسا کڑوا سچ اور کرب پوشیدہ ہے جس کی صداقت نے نہ جانے کتنے نظریوں اور فلسفوں کو جنم دیا لیکن ہر بار ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔بس شکلیں بدلتی رہی ہیں۔

حیدر خاں کے ان مکالموں میں مصنف نے اپنی غیر معمولی ذکاوت اور بلاغت کا ثبوت پیش کیا ہے اور یہ ضروری بھی ہے کہ ناول صرف رواں دواں قصّہ نہیں ہوتا، اس میں حادثہ ہوتا ہے۔تجربہ اور نظریہ بھی جو آگے بڑھ کر فلسفہ کا روپ لے لیتا ہے۔شاید اسی لئے لارنس نے کہا تھا کہ فکشن جب تک فلسفہ نہ بن جائے بڑا فکشن نہیں بن پاتا۔

میرٹھ کے باغی فوجیوں کی بہادر شاہ ظفر سے ملاقات، مکمل بادشاہت کا اعلان، بادشاہ کی فقیری وبیچارگی، یہ سب کچھ جلدی جلدی ہو جاتا ہے اور جلد ہی صبح کاذب نمودار ہونے لگی۔ایک دُھندلی صبح، ایک کمزور سا سچ جس نے آگے چل کر ایک مضبوط تحریک کو جنم دیا۔بہرحال پہلے کی طرح بادشاہ گدّی پر بٹھائے گئے۔ اسی طرح کا جلوس، اسی طرح کی آن بان اور شان اور اسی طرح کی زبان کہ تاریخی ناول میں زبان کا بہت بڑا رول ہوا کرتا ہے، خواہ وہ خواص کی ہو یا عوام کی۔خواص بالخصوص بادشاہ، نواب اور ان کے ادب وآداب، ملبوسات۔یہ جملے دیکھئے:

''دربارشاہی کو زینت بخشنے کی خاطر حضور بادشاہ سلامت کا جلوس روانہ ہوا۔ سب سے آگے نقار خانہ تھا، پھر روشن چوکی تھی۔ ان کے پیچھے پیادہ سپاہی تھے۔ ان کی کمروں میں تلوایں لٹک رہی تھیں۔ ہاتھوں میں نیزے تھے۔ زعفرانی پٹیوں کے کمر بند اور سروں پر کھڑکی دار پگڑیاں تھے۔ پھر گھوڑا سوار دستہ تھا، جن کے گلوں میں سونے چاندی کی ہیکلیں لٹک رہی تھیں۔ ماتھوں پر مرصّع کلغیاں تھیں۔ سلمٰی ستارہ کے کام کی چادریں کاٹھیوں پر جھول رہی تھیں۔''

یہ سب کچھ تو تھا لیکن بادشاہ کے چہرے پر حسرت کے ساتھ ساتھ مایوسی و بے بسی تھی۔ جیسے جیسے بغاوت زور پکڑ رہی تھی۔ چہرے کا جلال اور بھی منوّر ہو رہا تھا اور توپیں داغی جا رہی تھیں۔ لیکن حیدر اور ان کے ساتھی یہ سمجھ رہے تھے کہ فرنگیوں سے مکمل نجات ایک اور بڑی قربانی مانگتی ہے اور آگ اور خون کی گنگا پار کرنی پڑے گی اور یہ عمدہ جملہ ''فتح کرنا آسان ہے لیکن فتح کو قائم رکھنا بیحد مشکل ہوتا ہے۔'' لیکن اس وقت تو سب کہ سب انتقام کے جوش میں تھے اور اس میں پیش پیش تھے حیدر خاں۔ کچھ دیر قتل وخون کا ماحول اس کے بعد پھر وہی سلیم و نیلوفر کا رومان جو اس ماحول میں غیر فطری لگتا ہے۔

ایک مختصر سی کہانی دلبر داد خاں اور جنیفر کی ہے۔ جینی انگریز لڑکی جس سے دلبر داد خاں پیار کرتا ہے، دینا ناتھ تارا سے، حیدر خاں چنبیلی سے اور سلیم نیلوفر سے کہ جنگ وجدل کا ماحول کیسا ہی ہو انسانی فطرت اپنا کام کرتی ہے اور یہ فطرت ذات پات، اونچ نیچ بھی نہیں دیکھتی۔ ایک ایسے ماحول میں جب انگریز مرد وعورت ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کئے جا رہے ہوں دلبر داد خاں جیسا سخت پٹھان ایک انگریز لڑکی کی حفاظت کرتا ہے۔ یہ الگ الگ مسئلہ ہے اور محبت ایک الگ فلسفہ کہ وہ تو بدترین دشمن کی لڑکی ولڑکے سے بھی ہو جاتا ہے۔ اگر حیدر خاں انگریزوں کا قتل کر رہا ہے تو دلبر داد خاں انگریز محبوبہ کو بچا رہا ہے اور کہہ رہا ہے ''ہم تم کو مرنے کے واسطے نہیں بچائی۔ ہم پر بھروسہ رکھو۔ فرنگی بلبل ہم تمھارا حفاظت کرے گی۔'' محبت کا یہ جذبہ، زندگی کا یہ متضاد رویّہ ناول کی کشمکش میں دھار لگاتا ہے اور محبت وعداوت کا یہ سفر ناول میں متوازی طور پر طے ہوتا رہتا ہے۔ یہی زندگی ہے۔ یہی ادب ہے اور یہی ناول۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ ناول کی شعریات زندگی کی شعریات ہے۔ پتہ نہیں زندگی کی کوئی شعریات ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اگر ہو سکتی ہے تو ناول کی بھی ہو سکتی ہے۔ اگر نہیں تو ناول کی بھی نہیں۔ مگر ناول پھر بھی ناول ہے۔ جیسے زندگی زندگی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ناول جیسی بڑی صنف میں زندگی جیسے بڑے تضاد موجود ہوں لیکن یہ فنّی اعتبار سے باہم مربوط ومضبوط ہوں۔ اور فکری وفطری اعتبار سے رواں دواں۔ اس اعتبار سے یہ ناول کہیں کہیں غیر فطری سا ضرور ہو جاتا ہے کہ وہ کئی کرداروں اور کئی ٹکڑوں میں متوازی طور پر چلتا ہے۔ لیکن اچھی بات ہے کہ وہ اپنی مرکزی فکر سے زیادہ علیٰحدہ نہیں ہوتا۔ کہیں کہیں یہ فکر فطرت کا ایسا مظاہرہ کرتی ہے جس کا عام آدمی تو کیا شہزادہ اور بادشاہ تک شکار ہو جاتے ہیں۔ مرزا الٰہی بخش کی خوشامدانہ وسفّاکانہ باتیں وحرکتیں اور یہ جملے:

''شہزادے اب مجھے اس تعظیم سے نہ روکیں۔ میں کسی نوعمر شہزادے کے آگے اپنا سرِ تسلیم خم نہیں کر رہا ہوں، بلکہ کسی غیور مستقبل کے شہنشاہ کی تائید کا اعلان کر رہا ہوں۔''

اس کے بعد مصنف کے یہ جملے:

''باہر تیز دھوپ جھلس رہی تھی اور نقارچی نے بدلتے وقت کی کروٹ کا اشارہ سمجھا اور اس کے نقارے کی آوازیں پورے قلعۂ معلّیٰ میں گونج اُٹھیں۔''

ایسے تفکیری وتخلیقی جملوں سے ہی ناول زندگی سے اوپر اُٹھ کر ادب کا بڑا حصّہ بن جاتا ہے اور فلسفہ کا روپ لے لیتا ہے۔ اسی ماحول میں زندگی کا ایک اور روپ دینا ناتھ اور تارا کی شادی، ڈھولک کی تھاپ اور سجان میاں کا وجد اور پھر لوک گیت اور پنڈت کا یہ جملہ:

''ہم ادھر جنگ میں اپنی جان دے رہے ہیں اور یہ ادھر سگائی کے لڈّو توڑ رہی ہیں۔''

اور یہ جملہ بھی:

''وہ جو بیچتے تھے دردِ دل کی دوا، وہ تلوار اٹھا کر میدانِ جنگ میں چل دیئے۔''

اور شادی میں قہقہے پڑ رہے تھے۔ ادھر کانپور کے حالات بدل رہے تھے۔ موت وغم، محبت اور عداوت، زندگی اور موت، غلامی اور آزادی، شادی کی ڈھولک اور جنگ کے نقارے کتنے اور کیسے تضادات اور ایک زندگی اور ایک ناول۔ لیکن ناول تو یہیں سے بنتا ہے اور بگڑتا بھی ہے۔ یہ ناول نگار کے تصوّراتِ فکر وفن پر منحصر ہے اور اس کی علمی وتخلیقی صلاحیت پر۔ نورالحسنین اکثر منزلوں پر کامیابی سے گذرے ہیں اور کہیں کہیں تو منظر کشی سے ہی تمام تر کیفیت کو بیان کر دیا ہے۔ مثلاً:

''آسمان میں سیاہ بادل سفید بادلوں کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے، ہوائیں چل رہی تھیں اور ایسا لگتا تھا کہ کسی بھی وقت آسمان کا ایک ہی رنگ ہو جائے گا۔''

اور لکھنؤ، دہلی، کانپور، الہ آباد، فیض آباد سب ایک رنگ میں رنگ گئے۔ جھانسی کی رانی، نانا صاحب، تاتیا ٹوپے، زینت محل، عظیم اللہ خاں، احمد اللہ شاہ ایک جذبے میں سرشار تھے۔ لیکن پھر بھی سیاہ اور سفید بادلوں میں ٹکرار ہوتی رہی اور تاریخ کے لیے بہت سارے سوال چھوڑ گئی کہ نفرت کی آگ اور اجتماعی انتقام کی نفسیات تو تاریخ بھی نہیں سمجھ سکتی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ محبت بھی ناقابلِ فہم جو خان اور جنیفر کے درمیان ہوئی اور پتھر پر پھول کھلا۔ ادھر میدانِ جنگ میں مشعلیں روشن ہوئیں اور ادھر دلِ نازک میں قندیلیں۔ ایک ساتھ، ایک ماحول میں دل اور دلّی دونوں کام کرتے رہے۔ یہی زندگی ہے۔ اسی زندگی کا عکس ہے ناول جو کم از کم تاریخی ناول میں کم کم دکھائی دیتا ہے کہ اس پر مجملی پردے پڑ جاتے ہیں۔ لیکن نورالحسنین نے سیاست اور آدمیت، محبت اور نفرت دونوں کو متوازی طور پر پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور اسی میں ایک باب اور جُڑتا ہے غدّاری اور بے وفائی کا۔ یہ بھی انسان کی ایک فطرت ہے جس سے اس طرح کے سوالات جنم لیتے ہیں:

''جانِ بہار سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ فرنگیوں کو رات گئے یہ اطلاع

پہنچانے والا کون تھا کہ شاہی لشکر بے خبر سو رہا تھا۔''

یا

''خدا جانے اودھ کی اگلی صبح کیا پیغام لے کر آئے گی۔''

میرٹھ اور دلّی کے بعد لکھنؤ اور بنارس کے واقعات کا ذکر ناول کو آگے بڑھاتا ہے اور ۱۸۵۷ء کے غدر کی وسعت کے ساتھ ساتھ ناول کے دائرۂ عمل کو بھی بڑھاتا ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ لکھنؤ کو جس زبان و تہذیب کے ساتھ پیش کیا ہے، بنارس کو بھی اپنی پہچان کے ساتھ۔ جہاں ایک طرف لکھنؤ کی یہ زبان ہے:

''کمال ہے نہ ذوقِ زبان، نہ شوقِ فصاحت۔ تنگیٔ داماں تو دیکھئے صبر کا یارا تک نہیں۔ وصل کی تڑپ میں جو لذّتِ ہجر نہ جانے وہ دردِ عزیزی پر کیا دم مارے۔''

تو بنارس کی یہ زبان:

''بچّہ یہ جیون ایک دھوکہ ہووے۔ گیان دھیان، لاگ لپیٹ کی اس کرم بھومی پر کون گیانی کون اگیانی؟ جو ہووے وہ نہ ہووے؟ جو نہ ہووے وہ ہووے۔ سنسار کا رچن کرئیا کرے چمتکار۔ کہاں کا ساون کہاں کا بھادوں۔ من تو ٹھہرا مایا، موہ کا ڈیرا سب دھوکا ہے دھوکا۔''

لکھنؤ میں رقص و سرود ہے تو بنارس میں بنی چدریا۔ یہ سب الگ الگ رنگ میں ہوتے ہوئے بھی وطن کے جہاد میں سب ایک تھے۔

تاریخ میں شکست و فتح کی جتنی کہانیاں ہیں کم و بیش اتنی ہی بے وفائی اور غدّاری کی بھی ہے۔ اس پہلو کو بھی اشاراتی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور خوبصورت و بامعنی جملوں سے تاریخ کے ان کمزور اور داغدار لمحوں کو تخلیقی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کنیز، غلام، افسران سبھی اس میں شامل ہیں یہاں تک کہ کہیں کہیں وزیر اور شہزادگان بھی کہ حیرت ہوتی ہے کہ زندگی قدم قدم پر انھیں حیرتوں کو پیش کرتی ہے۔ ناول میں اگر یہ سب کچھ تخلیقی انداز میں جذب و پیوست ہے تو وہ صرف خارجی سیاست اور سماجیت کے ذریعہ نہیں بلکہ انسانی فطرت کے ساتھ آگے بڑھتا ہے تو یقیناً کامیاب ہوتا ہے۔ ناول نگار نے اسے پورے طور پر برتنے کی کوشش کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کہیں کہیں مصنوعی انداز کی ہے کہ بات دور دراز کی ہے اور اقتدار کی بھی اس کو اسی انداز سے لینا چاہئے۔ کوئی نکتہ چیں یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اس کے بعض کردار فرضی ہیں اور واقعات بھی کہیں کہیں تصور و تخیل، تصنّع سے زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔ بعض اعتراضات صحیح ہو سکتے ہیں لیکن یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ناول نگار پیشہ ور مورّخ نہیں ہوتا اور وہ سچّے و پکّے تاریخی واقعات کو ترتیب دینے کا کام نہیں کر رہا ہے بلکہ ناول لکھ رہا ہے۔ وہ اپنی تخلیقی و وجدانی قوتوں کے ذریعہ حقائق کو بھی اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ فکشن لگنے لگے۔ کچھ اس انداز سے کہ فکشن فیکٹس (Facts) کے قریب رہے۔ وہ ان واقعات کے زیادہ قریب جاتا ہے جن میں انسانی خیالات، تجربات نیز تضادات ابھرتے ہوں۔ وہ انھیں سے مواد فراہم کرتا ہے اور ترتیب و تخلیق کرتا ہے۔ ناول کے فطری تقاضوں میں تحیّر و تجسّس اہم عناصر ہوتے ہیں۔ ناول کے ڈھانچے کو تیار کرتے وقت ناول نگار کو اس کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے کہ وہ تاریخ کے ذریعہ محض اطلاعات اور مواد نہیں جمع کر رہا ہے بلکہ احساسات اور جذبات کی کہانی بھی لکھ رہا ہے۔ یہی فرق ہے تاریخ اور تخلیق میں جس کا پورا خیال ناول نگار کو رکھنا پڑتا ہے۔ نیز یہ بھی کہ ناول صرف گذرے ہوئے تاریخی کرداروں سے آگے نہیں بڑھتا بلکہ بعض خیالی کرداروں کے ذریعہ مستقبل کا حوالہ بھی بنتا ہے۔ اسی ناول میں اگر حیدر خاں اگر ماضی کا اشاریہ ہے تو سلیم مستقبل کا اعلامیہ۔ ناول کتنا ہی تاریخی کیوں نہ ہو انسانی سرگذشت کا المیہ و طربیہ ہوتا ہے۔ تاریخ تو حقائق و واقعات کا حساب کتاب رکھتی ہے لیکن قصہ، کہانی، ناول انھیں واقعات و حادثات کے تخیّل کی اُڑان بھرتا ہے اور پرانی حقیقتوں سے ایک نئی حقیقت کو جنم دیتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ قصّہ میں صرف تاریخ کی گونج سُنائی دیتی ہے، تاریخ نہیں۔ کچھ اس طرح سے کہ ماضی حال بن کر سامنے آئے اور مستقبل کو روشن کرنے میں معاون ہو، تبھی تو عاشق سلیم میدانِ جنگ میں اُتر آتا ہے اور آخر میں بزرگ حیدر خاں سے کہتا ہے:

''یہ فرنگی خواہ چٹان بن کر سامنے آجائیں، خواہ وقت دیواریں کھڑی کردے۔ ہندوستانیوں کی آزادی کی چاہ میں بہنے والا یہ دھارا ہرگز نہیں رُکے گا۔ ایک نہ ایک دن انگریزوں کو یہاں سے جانا ہی پڑے گا۔''

اور سلیم کے چہرے کا اعتماد اور تبسّم کو دیکھ کر مایوس اور بزرگ حیدر خاں کو کہنا ہی پڑا:

''میں نے اپنے پیچھے آنے والی نسل کو تو دیکھا ہی نہیں تھا اور ہمت ہار بیٹھا۔ سچ کہتے ہو تم جب تک اس ملک میں تمھارے جیسے نوجوان پیدا ہوتے رہیں گے ایک فرنگی تو کیا ہر سامراجی طاقت کو یہاں سے جانا پڑے گا۔ سلیم تم نے مجھے دوبارہ زندگی سے جوڑ دیا۔ اب ہم بے سمتی کا سفر نہیں کریں گے۔''

عزم، امید، نشاط پر ناول کا خاتمہ ہوتا ہے، لیکن ایک نئے باب کی شروعات ہوتی ہے۔ تاریخ مستقبل سے وابستہ ہوگئی۔ ایک پودا لگا جس نے پھل دیئے نوّے (۹۰) برس بعد۔ ایک اچھا ناول جہاں پر ختم ہوتا ہے وہیں خیالات کی ایک نئی دنیا کی شروعات ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ ناول بامقصد اور بامعنی ہوگیا اور اگر کسی تکنیکی وجہ سے عمدہ تاریخی ناول نہ بھی ہوا ہو، لیکن ایک اچھا ناول ضرور بن گیا کہ اس ناول میں ''زندگی، زندگی سے نبرد آزما تھی۔'' اور بہت سارے سوالات تھے۔

ناول اگر زندگی کا آئینہ ہے تو اس کا رزمیہ بھی اور کہیں کہیں اس کا المیہ بھی اور المیہ کے کوکھ سے فلسفۂ حیات جنم لیتا ہے۔ اقتدار، طاقت، جنگ و جدل ہی اکثر انسانی حیات کا مقصدِ حیات ہوا کرتا ہے اور اسی سے نظریۂ حیات جنم لیتا ہے اور پھر نظریہ فلسفہ بن جاتا ہے۔

نورالحسنین کا یہ ناول ان حوالوں سے خاصا کامیاب ناول ہے جو تاریخ کا ہی نہیں زندگی کے پیچ و خم اور کیف و کم کا مفکّرانہ و فنکارانہ آئینہ دار ہے۔ اس عہد میں جب عام سماجی معاشرتی ناولوں کا ہی فقدان ہے، نورالحسنین نے تاریخی بلکہ اور آگے بڑھ کر فلسفیانہ نوعیت کا ناول لکھ کر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ جس کے لئے انھیں جتنی بھی مبارکباد دی جائے کم ہے۔

''تلک الایام''

خان حسنین عاقب
(پونہ)

حدیثِ زلفِ تو از دل بہ لب چو می آید
بہ سانِ خامہ سیہ می کند زبانِ مرا

(تمہاری زلف کی حدیث جب دل سے لب پر آتی ہے تو وہ قلم کی مانند میری زبان کو سیہ کر دیتی ہے۔)

اورنگ آباد، خجستہ بنیاد، مہاراشٹر کا ایسا تاریخی شہر ہے جسے میں بجا طور پر مہاراشٹر کا دہلی کہہ سکتا ہوں۔ اسی اورنگ آباد شہر سے تعلق ہے نورالحسنین کا۔۔ نورالحسنین معاصر ناول نگاروں کی فہرست میں برصغیر میں مہاراشٹر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بلکہ میں یہ کہوں تو اس میں غلط ہی کیا ہوگا کہ نورالحسنین مہاراشٹر کے معدودے چند فُل ٹائم ناول نگاروں میں سرفہرست ہیں؟

مجھ میں اور نورالحسنین میں کچھ چیزیں مشترک ہیں۔ ایک تو ہے ہمارا نام۔۔۔ بس، فرق اتنا ہے کہ ان کے نام میں 'حسنین' بعد میں آتا ہے اور میرے نام میں پہلے۔ پھر یہ کہ ہم دونوں قبیلۂ قلمکاراں سے تعلق رکھتے ہیں، یعنی اظہارِ ذات کے لیے انہوں نے بھی قلم سنبھالا اور میں نے بھی۔ ہم دونوں کے درمیان ایک نسل کا تفاوت ہے اس کے باوجود وہ جب بھی مجھ سے ملتے ہیں یا فون پر بات ہوتی ہے، اس بے تکلفی سے ملتے ہیں کہ اجنبیت کا احساس ہوا ہو جاتا ہے۔

اسی شہر اورنگ آباد سے تقریباً پچاس کلومیٹر دور شہر خلد آباد میں اس بادشاہ کا مزار ہے جس کے نام پر یہ شہر بسایا گیا ہے یعنی شہنشاہ اورنگ زیبؒ۔ اسی بادشاہ اورنگ زیب کی لائق و فائق بیٹی زیب النساء مخفی کا شعر ہے۔

عشق ہر جا شمعِ اسرارِ محبت بر فروخت
قصۂ لیلیٰ و مجنوں پیشِ آں افسانہ بود

(عشق نے جس جگہ بھی محبت کی شمع جلائی، لیلیٰ مجنوں کا قصہ اس کے سامنے ایک افسانہ بن کر رہ گیا۔)

اسی افسانہ گری سے نورالحسنین کو عشق ہے۔ جب وہ لیلیٰ مجنوں ہی نہیں بلکہ زمانے بھر کے کرداروں کے بارے میں قصہ سناتے ہوئے الفاظ کی تحدید کا پاس رکھتے ہیں تو اسے افسانہ بنا دیتے ہیں اور جب اسی قصے کو وسعتِ بیان عطا کرتے ہیں تو ناول بنا دیتے ہیں۔ نورالحسنین افسانہ اور ناول، دونوں لکھتے ہیں۔ یعنی وہ فکشن کے آدمی ہیں۔ فکشن کے بارے میں خالد حسینی کا ماننا ہے کہ ''فکشن تخلیق کرنا دراصل کسی عظیم سچائی تک پہنچنے کے لیے اس کے گرد جھوٹ کے کئی سلسلوں کے تانے بانے بُننے کا کام ہے۔''

تو پھر کسی سچائی تک پہنچنے کے لیے جھوٹ کے ایسے تانے بانے صرف نورالحسنین ہی نہیں بلکہ ہر فکشن رائٹر بنتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر افسانہ نگار اور ناول نگار کا کسی سچائی کے اردگرد جھوٹ کے تانے بانے بُننے کا فن الگ اسلوب و نوع کا حامل ہوتا ہے۔ مثلاً جین آسٹین کو ہی لے لیجیے۔

Jane Austen نے کہا تھا۔

It is only a novel.... or, in short, only some work in which the greatest powers of the mind are displayed, in which the most thorough knowledge of human nature, tha happiest delineation of its varieties, the liveliest effusions of wit and humour, are conveyed to the world in the best chosen language.

میں نے جین آسٹین کی یہ رائے اس لیے نقل کی کہ نورالحسنین کے ناولوں میں وہ سارے عوامل ہمیں ملتے ہیں جن کی نشاندہی جین آسٹین نے اپنی مذکورہ رائے میں کی ہے اور جو ایک اچھے ناول کی صفاتِ حمیدہ تصور کیے جاتے ہیں۔ خالد حسینی کے مطابق ناول سچائی کے گرد بُنے ہوئے جھوٹ کے جال کو کہتے ہیں لیکن جی۔ کے۔ چیسٹرٹن کے مطابق، ناول خود اپنے آپ میں سائنسی یا مابعد الطبیعاتی موضوع پر لکھی گئی کتابوں سے زیادہ سچا ہوتا ہے۔ آپ بھی سن لیجیے کہ چیسٹرٹن کیا کہہ رہا ہے۔

G.K.Chesterton ناول کے بارے میں کہتا ہے۔

People wonder why the novel is the most popular form of literature; people wonder why it is read more than books of science or books of metaphysics. The reason is very simple; it is merely that the novel is more true than they are

فی الوقت ہم جس کتاب پر بات کر رہے ہیں وہ نورالحسنین کا ناول 'تلک الایام' ہے جو ان کا چوتھا ناول ہے۔ اس سے پہلے ان کے تین ناول شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا سب سے پہلا ناول 'اہنکار' ہے جس نے ان کی شناخت ناول نگار کی حیثیت سے مستحکم کر دی۔ دوسرا ناول 'ایوانوں کے خوابیدہ چراغ' ہے۔ یہ ناول روایت شکن تھا جس کا موضوع نہایت اچھوتا اور 'ہٹ کر' تھا۔ 'چاند ہم سے باتیں کرتا ہے' ان کا تیسرا ناول تھا۔ ان کی زندگی آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت میں گزری اس لیے ریڈیائی فیچرس اور ریڈیائی ڈراموں کی ایک کتاب 'انسان امر ہے' تحریر کی۔ خاکہ نگاری پر مبنی کتاب 'خوش بیانیاں' ہے۔ ان کی دو کتابیں علمِ تنقید پر بھی ہیں۔

نورالحسنین نے آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کا سارا حصہ ادب اور ادیبوں کے بیچ رہ کر گزارا۔ جلد ہی ادب ان کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ فی الوقت ہم ان کے تازہ ترین ناول 'تلک الایام' کی بات کر رہے ہیں۔

2018 میں شائع ہونے والے اس 300 صفحات پر مشتمل ناول نے مہاراشٹر میں ناول نگاری کے تھمے ہوئے پانی میں ایک کنکر ڈال کر ہلچل مچا دی

تھی۔ ورنہ ناول بزبانِ غالبؔ شکوہ سنج تھا کہ

نہ رقصِ پری پیکراں بر بساط
نہ غوغائے رامش گراں در رباط

اس ناول کا تھیم male protagonist 'حسین' کا schizophrenia جیسا نفسیاتی مرض ہے جس میں وہ خوابیدہ کیفیت میں اپنے اسلاف کی روحوں سے ملاقات کرتا ہے۔ یہ ناول ایک ایسے کردار کی داستان بھی ہے جو اپنے ملک کے سیاسی نظام کی بدنیتی، بدعملی اور بدفکری کو اپنی برہنہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی اس سے فرار حاصل کرنے کے لیے اپنے ماضی اور اپنی تاریخ میں پناہ لیتا ہے جہاں اس کے اسلاف اس کی رہنمائی کرتے ہیں اور اسے optimism یعنی 'لاتقنطو من رحمۃ اللہ' کا درس دیتے ہوئے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور اسے مایوس نہ ہونے کا سبق سکھاتے ہیں۔

'تلک الایام' کہیں کہیں ہمیں قرۃ العین حیدر کے شہرہ آفاق ناول 'آگ کا دریا' کی یاد دلاتا ہے جس کی کہانی ڈھائی ہزار سال پہلے شروع ہوکر بیسویں صدی کے نصف پر آکر ٹھہر جاتی ہے۔ یہ بیسویں صدی کا نصف وہ وقت تھا جب واقعاتی طور پر یہ ناول اپنے کرداروں کو یہاں لاکر روک دیتا ہے۔ اسی طرح نورالحسنین نے اپنے اس ناول میں بھی اسی ساخت کا تجربہ کیا ہے۔ لیکن 'آگ کے دریا' کی طرح اس میں زمانی تسلسل نہیں پایا جاتا بلکہ ناول کے مرکزی کردار کے 'موجود' سے 'لاموجود' کے درمیان آمد و رفت کے تخیلاتی سلسلے کا بیان ہے۔ ناول کا protagonist 'حسین' اور اس کی اہلیہ 'یاسمین' ہیں۔

ناول نگار صرف قلمکار ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ تخلیق کار بھی ہوتا ہے جسے فطرت کی جانب سے تخلیقی صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں اس لیے اس کا سروکار محض اس کا ذاتی سروکار نہیں ہے بلکہ وہ انفرادیت کے بجائے اجتماعیت کا نقیب ہے۔ تخلیق کار اگر اپنی تخلیق میں سماجی سروکاروں سے واسطہ نہیں رکھتا تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ 'ادب برائے ادب' کے نظریہ پر کاربند ہے، اسے 'ادب برائے زندگی' سے کوئی لینا نہیں اور یہ کہ وہ ادب محض تفننِ طبع کے لیے تخلیق کرتا ہے۔ لیکن 'تلک الایام' کا ناول نگار نہ صرف ایک تخلیق کار ہے بلکہ نہایت حساس تخلیق کار ہے جو اپنے اردگرد ہونے والے ہر واقعہ کا ادراک و شعور رکھتا ہے اور اپنے اندرون میں ہر اچھے وقوعے کی طرح یہ لہروں کی ترنگوں کو محسوس کرتا ہے اور خلافِ انسانیت، خلافِ فطرت اور خلافِ طبع وقوعے پر اس کے دل میں رنج والم کی شدید ٹیسیں بھی اٹھتی ہیں۔ ناول میں سیاسی نظریات، شخصی تحفظات، ذاتی رائے، اظہارِ ذات، آگہیٔ نفس اور شعور وادراک جیسی عوامل کثرت سے مطالعے میں آتے ہیں۔ اس لیے ناول کا عنوان تو قرآنِ کریم کے تیسویں پارے سے ماخوذ ہے اور ناول کی عبارتوں میں اس کی وسعتِ فکری کے جلوے جابجا بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ مختلف آفاقی قدروں کی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

پہلے باب کے آخری پیرا کی عبارت دیکھئے: (سیکولرازم)

'گراؤنڈ پر شائقین پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے ریحان کو کندھوں پر اٹھالیا تھا۔ میچ کی جیت پر مبارک سلامت کا شور تھا۔ اس سارے ہنگامے کے بعد جب ریحان اپنا کِٹ اٹھائے گراؤنڈ سے باہر آیا تو شوبھا، اس کے پتاجی نیل کنٹھ کوٹھیکر اور ان کی اہلیہ اس کے انتظار میں تھے۔ ریحان نے انہیں ادب سے سلام کیا تو کوٹھیکر صاحب نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے محبت سے ڈانٹا، 'تم جانتے تھے کہ مقابل میں تیز باؤلر ہے تو پھر ہیلمیٹ اتارنے کی کیا ضرورت تھی؟'

ریحان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی، 'انکل، مقابل پر دباؤ ڈالنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔'

'اور تم کو اگر کچھ ہوجاتا تو۔۔۔؟' شوبھا نے محبت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

'مجھے تمہاری دعاؤں پر پورا بھروسہ تھا۔'

سیکولرزم کے واقعات کئی جگہ مل جاتے ہیں جنہیں میں اس مقالے میں کسی اور جگہ بھی درج کروں گا۔

اس ناول میں ناول نگار کی اسپورٹس کے تئیں دلچسپی اور شوق بھی دیدنی (قابلِ مطالعہ) ہے۔ کرکٹ کی باریکیاں بھی اتنی تفصیل سے بیان کرتے ہیں جتنی تفصیل سے فٹ بال کی۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ناول نگار بذاتِ خود ایک زندہ دل اور خوش طبع وخوش فکر انسان ہیں۔ ایک مثال فٹ بال کی دیکھ لیجئے۔ فٹ بال کی کھیل کی تفصیلات:

صفحہ 30: پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ وہ گول پول میں کس طرف سے گیند پھینکے گا، بچاؤ کھلاڑی گول کیپر کے ادھر اُدھر پہنچ جاتے تو وہ چوٹی ڈی سے ایسی نپی تلی شاٹ گیند پر لگاتا کہ وہ گول کیپر کے سر کے اوپر سے پول کے اندر داخل ہوجاتی۔'

سماج فی الوقت ایک نہایت شدید بحران سے گزر رہا ہے جس کا شکار عام آدمی بھی ہورہا ہے۔ یہ مسئلہ ہے آسانی سے، بغیر محنت کئے حاصل ہونے والا پیسہ۔ اس کی ترغیب اور لالچ ویسے تو 'کون بنے گا کروڑپتی' جیسے کئی پروگراموں سے ملتی ہے لیکن آن لائن چکر اور 'موتی گولڈ' جیسے بہت سی 'پونزی' اسکیمیں بڑی محنت سے کمائی ہوئی عوام کی دولت لوٹ کر انہیں کنگال بنادیتی ہے۔ ناول نگار اس سے متعلق بھی گہری چوٹ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

'ایزی منی' Easy Money

صفحہ 31: اس نے بچپن ہی سے یہ بات سوچ لی تھی کہ وہ باپ کی طرح کہیں ملازمت نہیں کرتے گا بلکہ کوئی ایسا کام کرے گا جو اسے راتوں رات آسودہ حال بنادے۔'

خوابوں پر 'حسین' کا ایقان دراصل ناول نگار کا ایقان معلوم ہوتا ہے۔ وہ اس سے متعلق اپنی بیوی سے کہتے ہیں۔

صفحہ 78: 'یاسمین، تمہارے جواب کے لیے میں نے کتاب 'مقدمہ ابن خلدون' کا مطالعہ کیا ہے جو خواب کی حقیقت کو تسلیم کرتا ہے اور اسے نبوت کا 46واں حصہ قرار دیتا ہے۔'

پھر وہ خواب کی حقیقت کی وضاحت یوں کرتے ہیں۔

'خواب کی حقیقت یہ ہے کہ نفسِ ناطقہ اپنی روحانی ذات میں کسی کسی وقت کسی واقعہ کی تصویر کا مطالعہ کر لیتا ہے۔ کیونکہ جب وہ روحانی حالت میں ہوتا ہے تو اس میں بھی واقعات بالفعل موجود ہوتے ہیں اور دیگر روحانی ذاتوں کی طرح چھپ جاتے ہیں۔'

یہ وضاحت دراصل ناول نگار کے اپنے ایقان کے مطابق خواب کی حقیقت کا دستاویزی ثبوت اور منطقی دلیل ہے۔

ناول میں جا بجا نوجوانی کی شرارت آگیں چھیڑ چھاڑ کے قصے ملتے ہیں جو ناول میں humor کی کمی نہیں ہونے دیتے جس کی وجہ سے قاری کی دلچسپی بنی رہتی ہے۔

صفحہ 81: 'اس کے علاوہ بھی کچھ یاد آیا ہوگا؟'

انہوں نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں کھلکھلا کر ہنس پڑی، 'اور میں آپ کی پیٹھ پر سوار تھی؟'

حسین ہنسنے لگے تھے، 'پیٹھ پر تو تم اب سوار ہو۔'

صفحہ 83: 'یاسمین، حضرتِ دانا فرماتے ہیں جب تمہارے ساتھ تمہاری محبوبہ ہو تو غور و فکر کی ساری کھڑکیاں بند کر لیا کرو۔' ان کے چہرے پر شرارت مچلنے لگی تھی۔'

جس ناول کی بنیاد ہی بزرگانِ دین اور علمِ حقیقت اور معرفت کے رموز کی بازیافت پر رکھی ہو، اس میں ناول کے مرکزی کردار male protagonist کا اپنی محبوبہ کے ساتھ حضرت زرزری بخشؒ کی درگاہ پر رہنا اور ساری رات وہیں رکے رہنا، محبوبہ کے بھائی کا وہاں آجانا اور پھر حسین کی 'حکمتِ عملی' کہ محبوبہ کے بھائی کو ریکارڈنگ میں مشغول کر دیا، نوجوانی کی شرارت تو ہو سکتی ہے لیکن اسے کسی طور legitimate نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے درگاہوں پر اس طرح کے غیر اخلاقی واقعات کے تسلسل سے ہوتے رہنے کے گواہی تو ملتی ہے لیکن اس نوعیت کے ناول میں اس کا بیان شاید بہت سے لوگوں کو irrelevant محسوس ہوگا۔ اس سے اگلے صفحے پر 87 پر وہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کا قول نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں، 'صوفی بننا ایک ایسا راہِ عمل ہے جس میں نفسِ امارہ کی شکست اور پاکیزگیٔ نفس کی فتح ہے جس سے دین، روح میں بس جاتا ہے اور عبد کا معبود سے تعلق برقرار ہو جاتا ہے۔'

اس طرح کے فلسفوں کی گل فشانیاں جا بجا نظر آتی ہیں۔ مثلاً 89 پر 'میرے بھائی، جسم کو چھوڑتے ہی روح کا تشنہ اپنے متعلقین سے کیسے ختم ہو جاتا ہوگا؟ میرا خیال ہے کہ روح ہمارے آس پاس ہی کہیں ہوتی ہوگی، جس طرح قوت نظر نہیں آتی اسی طرح روح بھی نظر نہیں آتی۔'

'حسین' اپنے بزرگوں سے خواب میں بارہا ملاقاتیں کرتا ہے اور یہ ملاقاتیں، یہ کیفیت اختیاری ہوتی ہے یعنی وہ جب چاہے، اس کیفیت میں داخل ہو جاتا ہے۔ 'حسین' کو یا پھر یوں کہیں کہ ناول نگار کو اپنے بزرگوں سے جتنی محبت ہے اس سے زیادہ وہ ان سے عقیدت رکھتا ہے۔ وہ اپنے نسب اور شجرے کے بارے میں بھی بہت زیادہ سنجیدہ اور حساس واقع ہوا ہے۔ یہ عبارت پڑھیے جہاں ناول نگار اپنے جدامجد سے محوِ کلام ہے، حضرت فرماتے ہیں:

'تیرا دادا سید نور المقتدیٰ تھا فرد فرید، پکا دھن کا، تھا کامل تحقیق و جستجو کا، سخی و غنی دل کا، پایا تھا جلال مزاج کا ورثے میں حضرت شہید شاہ علاؤالدین کا، جانتا ہوں کام کو اس کے بہت کچھ میں بھی، بتاؤں گا بہت کچھ بارے میں اس کے تجھ کو بھی، کہ پالیا تو نے خزانہ اس کا، تو پڑھ لگا کر دل، کتاب اُس کی 'سیرتِ پاک' جس کی نہ ہو سکی طباعت'۔

اس عبارت کے متکلم ہیں 'محبِ صادق' جو خواب میں 'حسین' کو اپنے بزرگوں سے ملانے والے رابطے یا وسیلے کا کام کرتے ہیں۔ ان کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہو رہے ہیں۔ اس عبارت کی زبان اردو کی ابتدائی شکل ہے جو مرصع تو تھی لیکن اس کا ڈھانچہ موجودہ زمانے کی قواعدی ساخت پر نہیں تھا۔ جملوں میں الفاظ کی ترتیب کلاسیکی نثر کا بہترین نمونہ معلوم ہوتی ہے۔

'حسین' (یہاں اگر ہم ناول نگار نور الحسنین بھی پڑھیں تو شاید عبارت کی حقانیت، معنویت اور اہمیت میں کوئی تفاوت رونما نہیں ہوگا) کے بزرگ ایک جگہ اسے تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں، 'اے واجب الشفقت عزیز! دکن دیس بہت بڑی بڑی جنگیں جھیلیا، کچھ تو اپس کی خصومات، کچھ شمالی ہند کے پادشاہوں کی لالچ دولت، مگر یاد رکھیو، ان جنگوں کا خمیازہ عام آدمی کا نصیب ہی رہیا، واسطے پادشاہی کے جب دارا شکوہ ہور عالمگیر آمنے سامنے پہنچے، آفت آن پڑی تھی عام آدمی پر، ادھر سے بولیا تو ہووے اُدھر کا باغی، ہور اُدھر سے بولیا تو بنا اِدھر کا باغی۔ ائے خانوادۂ علی کے چراغ، سیاست نہ شیرِ خدا کو سوجھی نہ تجھے سوجھے گی۔ بہتر یہی ہووے گا کہ تو اس سے دور ہی رہیو۔ تیرے واسطے دکن دیس میں ورثہ ہووے ہے سنتوں ہور صوفیوں کا، انسانیت ہور بھائی چارے کا، لیجو درس اُن کے بھی سندیس کا، ہور پڑھیو کارنامے انھوں کے بھی، کہ تو ہووے ہے دینِ حق کا پیرو، تیرے پشتارے میں بندھا ہے اِس سے بھی سوا بہت کچھ، نہ چھوڑیو دامن حق کا، اور رکھیو عمل صبر کا۔'

ناول کی یہ عبارت کئی اقدار کی بازیافت کرتی ہے۔ ایک تو یہ کہ روحانی اعتبار سے 'حسین' کا تعلق اپنے اسلاف سے بہت گہرا ہے۔ وہ اب بھی عمقِ قلب سے اپنے اسلاف سے خود کو وابستہ محسوس کرتا ہے۔ خصوصی طور پر ایسے وقت میں جب مادیت چہار جانب سر چڑھ کر بول رہی ہو۔۔ وہ اپنے تئیں جب اپنے جدِ اعلیٰ سے یہ کہلواتا ہے کہ 'ائے خانوادۂ علی کے چراغ۔۔' تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ 'حسین' شعوری طور پر اعلیٰ نسبی کو تسلیم کرتا ہے اور یہ بھی مانتا ہے کہ اسے خاندانِ اہلِ بیت سے متعلق ہونے کا اعزاز اور شرف حاصل ہے۔

دوسرے یہ کہ وہ عالمِ کیف میں بھی اپنے بزرگوں کی اپنے تئیں شفقت کو محسوس کرتا ہے اور اس کا یہ احساس راسخ ایقان کی شکل اختیار کر گیا ہے کہ اسے اس کے بزرگوں سے روحانی رہنمائی حاصل ہو رہی ہے جو اس کے موجودہ

معاملات میں اس کی مدافعت کررہی ہے۔تیسری اہم بات یہ بھی ہے کہ اس عبار ت میں ہی ناول نگار نے اپنے لیے بھی یہ گنجائش نکال لی ہے کہ اسے سیاست کے میدان میں نہیں جانا ہے۔حالانکہ یہ اس کی طبیعت کا حصہ ہے لیکن وہ اسے بھی اپنے بزرگوں کی رہنمائی پر محمول کرتا ہے اور یہ تسلیم کرتا ہے کہ اس کے اسلاف نے ہی اسے سیاست کے خارزار میں قدم رکھنے سے منع فرمایا ہے۔اگلی ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ ناول میں کئی مقامات پر 'حسین' سیکولرزم اور گنگا جمنی تہذیب پر اپنے پختہ یقین کا اعادہ کرتا ہے۔وہ اپنے اس یقین کو بھی اپنے اسلاف سے منسوب کرتا ہے۔اس کا سیکولرزم صرف اس کا ذاتی اور شخصی معاملہ نہیں ہے بلکہ یہ اس کے بزرگوں کا ورثہ ہے جو اس نے وراثت میں پایا ہے۔اس گنگا جمنی تہذیب کے جلوے ناول میں کئی جگہ دکھائی دیتے ہیں۔

کوٹھیکر صاحب، شوبھا وغیرہ کا ذکر بھی مثبت اور محبت بھرے انداز میں ملتا ہے جس سے ناول نگار کے سیکولرازم پر یقین کا ثبوت فراہم ہوجاتا ہے۔وہ گنگا جمنی تہذیب کا پروردہ ہی نہیں بلکہ قائل بھی ہے۔ایک جگہ ناول نگار اور اس کے دوست نیل کنٹھ کوٹھیکر کے درمیان یہ مکالمہ سنیے:

کوٹھیکر صاحب نے سگریٹ سلگائی، ایک کش لیا اور دھویں کو اگلتے ہوئے کہنا شروع کیا، 'سولہویں صدی عیسوی میں ایک مشہور سنت، ایکناتھ مہاراج ہوا کرتے تھے۔ان کے گرو سوامی جناردھن تھے اور ان کے گرو تھے ایک مسلمان صوفی بابا بودھلے شاہ۔'

'یار کوٹھیکر، پہلے کس قدر اتحاد اور یگانگت تھی ہندو اور مسلمانوں میں!'

'پہلے کیوں؟ کیا آج ہم دونوں میں خلوص و محبت نہیں تے؟'

'یار تم تو میرے گھر کے ایک فرد ہو۔'

'اور تم بھی تو ہمارے گھر میں اتنے ہی چہیتے ہو۔'

موجودہ سیاسی نظریات:

نورالحسنین کے اس ناول میں اگر کوئی نظریہ undercurrent کی طرح دوڑتا ہے تو وہ ہے سیاسی نظریہ۔اس ناول کا بیشتر حصہ سیاسی نظریات اور سیاسی حقائق کے اردگرد گھومتا ہے۔اگر ناول نگار کو شکایتیں ہیں تو سیاست سے ہیں، اگر شکوے ہیں تو سیاست دانوں کی سیاسی بازیگری سے۔۔۔ایسی بہت سی مثالیں پورے ناول میں بکھری پڑی ہیں جہاں دو کرداروں کے درمیان سیاسی گفتگو ہوتی ہے۔ایسی گفتگو کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ حسین (protagonist) کی سیاسی رائے فوقیت کے ساتھ رکھی گئی ہے۔کچھ مثالیں یہیں دیکھ لیجئے۔

'یاسمین، یہی دو دن جمہوریت کے حق میں سب سے خطرناک ہوتے ہیں۔ان ہی دو ایام میں کسی غریب کا قیمتی ووٹ بکے گا، صرف پانچ کلو اناج کے عوض، کوئی مجبور بیچے گا صرف ایک سوتی ساڑی کے بدلے، کسی کا ووٹ شراب کی ایک بوتل میں ڈوبا ہوا ملے گا اور کوئی سو روپلی میں اس کا سودا کرے گا۔'

اسی صفحہ پر دوسری جگہ لکھتے ہیں، 'اس الیکشن میں چار نیشنل پارٹیوں کے ہندو امیدوار لڑ رہے ہیں۔پھر چار پانچ آزاد امیدوار ہیں جن میں تین مسلمان ہیں۔چار نیشنل پارٹیوں میں تین کے ووٹر طے شدہ ہیں۔اب بچی ایک نیشنل پارٹی جو کانگریس کی ہے، مسلمان اس سے نالاں ہیں کہ اس نے ساٹھ برسوں میں مسلمانوں کے لیے کچھ نہیں کیا۔'ایک جگہ یہ عبارت پڑھنے کو ملتی ہے:

'الیکشن کے نتائج قطعی توقعات سے الگ ثابت ہوئے تھے۔بی جی پی نے جس بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی تھی اس سے اندازہ ہوگیا تھا کہ جس تمدن کی ہم آہنگی نے گنگا جمنی تہذیب کا نام پایا تھا، موجودہ دور کی سیاست نے طے کرلیا تھا کہ اسے گنگا جمنا میں ڈبو ہی دیں گے۔'

موجودہ تعلیمی نظام سے بیزاری اور اس سے شکوہ بھی دیکھ لیجئے:

صفحہ 115: 'قوم کو آج پھر ایک سرسید کی ضرورت ہے۔'

دوسرے صاحب نے فوری کہا، 'ایک سرسید؟'

ان کی آنکھوں میں شرارت مچلنے لگی تھی، ک'اجی جناب، اب تو جس گلی میں بھی داخل ہوں، وہاں ایک سرسید دکھائی دیتا ہے۔'

سب نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا، 'یہ جو موجودہ سرسید ہیں انہوں نے قوم کے نونہالوں کے لیے اسکول اور کالج قائم نہیں کئے ہیں۔وہ تو ان کے پیٹ بھرنے کی دکانیں ہیں۔'تیسرے صاحب نے اطلاع دی۔

'اتنے سارے اسکول کالج ہونے کے باوجود مسلمان تعلیمی میدان میں سب سے پیچھے ہیں۔ہے نا حیرت کی بات؟'

پہلے صاحب منہ سے دھواں اگلتے ہوئے بولے۔

یہ مکالمہ معاشرے میں، بلکہ معاشرے کے نہایت اہم شعبے یعنی شعبۂ تعلیم میں در آنے والے تعفن خیز بگاڑ پر گہری چوٹ ہے۔

تکنیکی اعتبار سے جہاں فلیش بیک کی تکنیک کا استعمال اس ناول کی خاصیت ہے وہیں اور فلیش بیک میں بھی zig-zag یا dribbling ملتی ہے۔

میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ ناول میں زیادہ تر فلیش بیک کی تکنیک استعمال کی گئی ہے لیکن ایک sub-technique کے طور پر dribbling کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔یہ اصطلاح کوئی فنی اصطلاح نہیں ہے لیکن میرے ذہن میں اس ناول کا تجزیہ کرتے ہوئے اس نئی اصطلاح کے ورود ہوا۔اور پھر شاید یہ اصطلاح کچھ ایسی غلط بھی نہیں ہے کہ اسے یکسر مسترد کیا جائے۔وضاحت کے لیے کہوں تو ناول میں یہ 'ڈربلنگ' دو معاملات میں ملتی ہے۔ایک تو dribbling of characters ہے یعنی کرداروں کے بیچ ڈربلنگ۔میری نظر میں یہ ڈربلنگ ان معنوں میں ہے کہ ناول میں دو متکلم ہیں۔

۱۔حسین ۲۔یاسمین

زیادہ تر حصے میں تو حسین ہی متکلم ہے لیکن کہیں کہیں حسین کی ذہنی کیفیت کو بیان کرنے کے لیے یاسمین بھی متکلم بن جاتی ہے۔ناول نگار کو شاید یہ زیادہ آسان convenient لگا کہ حسین کی ذہنی کیفیت کو خود یاسمین اپنے الفاظ میں بیان کرے۔ایک تکنیک کے طور پر اسے شاید کسی دوسرے ناول میں استعمال نہ کیا گیا ہو۔لیکن ناول نگار کو جب بھی یہ محسوس ہوا کہ اسے حسین کے اندرون میں

درآنے والی بے چینی اوراس کی شخصیت میں منعکس ہونے والی پیچیدگی کونشانزد کرنا ہے تو اس نے فوراً 'اسٹیج' یاسمین کے حوالے کردیا۔ شروعات میں تو مجھے یہ بات تھوڑی عجیب لگی لیکن جوں جوں ناول کو پڑھتا گیا، یہ 'ڈربلنگ' نارمل لگنے لگی۔

'ڈربلنگ' کا دوسرا معاملہ زمانوں کے بیچ بھی ہے۔ ناول نگار فوراً ماضی میں چلا جاتا ہے اور پھر جتنی سرعت سے وہ ماضی میں جاتا ہے، اسی تیزی سے زمانۂ موجود میں واپس بھی چلا آتا ہے۔ ناول تین زمانوں میں ہے۔: ماضی، حال اور مستقبل۔ 'حسین' اپنی زندگی زمانۂ موجود میں جی رہا ہے، وہ خواب میں کہیے یا ایک خواب آگیں کیفیت میں ماضی میں چلا جاتا ہے اور کبھی وہ مستقبل کو اپنے ذہن کے پردے پر متصور کر لیتا ہے۔

پورا ناول پڑھ لینے کے بعد بھی اس کی ابتداء، اس کے درمیان اور اس کے اختتام، تینوں حصے یکساں طور پر ایک ہی tempo میں رواں محسوس ہوتے ہیں۔

ناول کا اختتام جیسے جیسے قریب آتا ہے، حسین کا کردار اپنے ماضی اور مستقبل کی امیدوں کے درمیان ایک مضبوط کڑی ڈھونڈ نکالتا ہے۔ یہ کڑی ہے اپنے نظریات پر اس کا ایقان۔ یہ ایقان ہی اسے سراب دکھاتا ہے کہ اس نے ملک بھر کے ادیبوں کو ساتھ لے کر ایک 'یونائی ٹیڈ لٹریری مومنٹ' قائم کر لی ہے۔ یہ لٹریری مومنٹ دراصل 'حسین' کا نہیں بلکہ 'نورالحسین' اور ان جیسے تمام ادیبوں کا ایک خواب ہے جو انھوں نے اپنے سماجی سروکاروں کی تکمیل کے مقصد کے لیے دیکھ رکھا ہے۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جس کے تانے بانے بھارت کے موجودہ سماجی ڈھانچے کو سنبھالے رکھنے کے لیے بہت ضروری ہیں۔

یہ ناول اگرچہ تاریخی ناول نہیں ہے لیکن اس کے اکثر کردار حقیقی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ خود حسین کا کردار، ناول نگار کا اپنا کردار معلوم ہوتا ہے، اس کے علاوہ دوسرے کردار مثلاً کوٹھیکر جو ناول نگار کے دوست ہیں شاید لیکن یہ کردار پورے ناول میں بکھرا پڑا ہے، نہ صرف یہ کردار بلکہ اس کی بیٹی شوبھا بھی۔ عارف خورشید اورنگ آباد سے تعلق رکھنے والے مشہور افسانہ نگار تھے، عظیم راہی معروف افسانہ نگار ہیں۔ اقبال نیازی اور مجیب خان بھارت میں اردو تھیٹر کی اہم شخصیات ہیں۔ اویناش رستوگی ہندی کے ادیب ہیں۔ یہ سارے کردار حقیقی زندگی سے مستعار ہیں۔ 'حسین' کے وہ سارے بزرگ جن سے اس کی ملاقات ایک مخصوص ذہنی کیفیت کے تحت ہوتی ہے، وہ سارے کردار بھی حقیقی زندگی کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ ناول میں نہ صرف کردار بلکہ جگہیں بھی حقیقی ہیں۔ ان حقیقی جگہوں میں اورنگ آباد، دولت آباد، کنڑ، بمبئی، کلکتہ وغیرہ شامل ہیں۔ واقعات بھی حقیقی ہیں مثلاً تقسیم ہند کا سانحہ، حیدرآباد ایکشن، آصف جاہی سلطنت کا خاتمہ وغیرہ۔ اتنی ساری حقیقی چیزوں کے باوجود 'تلک الایام' ایک خالص تاریخی ناول نہیں لگتا اور اتنے سارے حقیقی کرداروں کے باوجود ناول آپ بیتی بھی نہیں معلوم ہوتا۔ اسے ناول نگار کی خوبی ہی مانا جانا چاہیے۔

ناول کا اختتام 'حسین' کے اس جملے پر ہوتا ہے کہ 'یاسمین، تم سچ کہتی تھیں، میں واقعی شیزوفرینیا کا مریض ہوں۔ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔' یہ جملہ ناول نگار کی مایوسی کا مظہر ہے جو اسے ملک کے موجودہ ماحول کو دیکھ کر اور اپنے تصوراتی حل کی ناکامی کے بعد اس کی شخصیت میں در آتا ہے۔ کلائمکس کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی ابتداء 'حسین' کے اپنے 'شزوفرینیا' کے 'انکار بالسان' سے ہوئی تھی اور اس کا منتہیٰ 'اقرار بالقلب' ہے۔ یہ محض ایک طویل ذہنی اور نفسیاتی سفر کی داستان نہیں ہے بلکہ اس کے بیچ میں بہت کچھ ہے۔

ناول کی ابتداء سے لے کر آخری جملے کے پہلے تک وہ اس بات کا انکار کرتا ہے کہ اسے کسی قسم کا نفسیاتی عارضہ ہے لیکن آخرکار جب وہ اپنی ذہنی کیفیت سے باہر آتا ہے اور حقیقت کا سامنا کرتا ہے تو وہ تسلیم کر لیتا ہے کہ دراصل اس کا optimism محض ایک سراب تھا اور وہ واقعتاً شزوفرینیا کا مریض ہے۔

ناول یہاں آکر ختم تو ہو جاتا ہے لیکن ہمارے لیے امید کا ایک دروازہ روشن چھوڑ جاتا ہے۔ یہ ناول 2018 میں شائع ہوا تھا۔ اس کے آخری حصے میں (باب 19 صفحہ 285) پر درج یہ عبارت پڑھیے۔

'شتابدی ایکسپریس میں سوار وہ اپنے دوست وشاعر دوستوں کے ساتھ ممبئی جا رہا تھا جہاں آزاد میدان پر United Literary Movement کے تحت ہونے والے نکڑ ناٹکوں کے پروگرام میں حصہ لے سکے۔'

'تین دنوں تک شہر کے مختلف مقامات پر نہایت کامیابی کے ساتھ اس کا لکھا ہوا نکڑ ناٹک 'انسان امر ہے' کئی کئی بار کھیلا گیا۔ اس فیسٹول کے ختم ہونے سے قبل ہی اس کے نتائج لوگوں کے اتحاد اور ایک دوسروں کی قربتوں سے واضح ہو رہے تھے۔'

'اسی ذمہ داری کا احساس لے کر یونائی ٹیڈ لٹریری مومنٹ آپ کے سامنے آئی ہے۔ ہمیں اس سے جڑنا بے حد ضروری ہے۔'

'سیاسی امیدواروں کے جلوس نکلتے اور اس کے فوری بعد مومنٹ کے نمائندوں کا گروپ نکلتا اور عوام تک اپنا پیغام پہنچاتا کہ خبردار! ایک گندی مچھلی بھی پورے تالاب کو گندہ کر سکتی ہے۔'

حسین یہ تصور کیے رہتا ہے کہ یونائی ٹیڈ لٹریری مومنٹ کی کوششوں سے ملک بھر میں سیکولر پارٹیاں حکومت بنانے میں کامیاب ہوگئی ہیں۔ لیکن جیسے ہی وہ اس کیفیت سے بیدار ہوتا ہے اور دیکھتا ہے کہ ٹی۔ وی پر خبروں میں مذہبی جنون پیدا کرنے والی پارٹی اکثریت سے جیت گئی ہے تو وہ خود کو شزوفرینیا کا مریض تسلیم کر لیتا ہے۔ اس کا یہ تسلیم کر لینا دراصل ہار مان لینا ہے۔ لیکن یہ 'یونائی ٹیڈ لٹریری مومنٹ' صرف 'تلک الایام' کے 'حسین' کا ہی خواب نہیں تھا یا ہے، بلکہ اس کے ناول نگار 'نورالحسین' کا بھی خواب ہے جسے وہ حقیقت میں بدلتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کا ثبوت نورالحسنین کی فیس بک facebook پر 20 اگست 2020 کو کی گئی پوسٹ ہے جس میں انہوں نے لکھا،

'ایک مشورہ! ساتھیو! آج کے حالات آپ کے سامنے ہیں۔ سیاسی بازیگری، عدم اعتماد کی فضا، مذہبی منافرت، دہشت گردی اور نہ جانے کتنے مسائل سے ہم دوچار ہیں۔ کیا اب وہ وقت نہیں آگیا کہ ہم بھی ترقی پسند تحریک کی

باقی صفحہ ۴۹ پر ملاحظہ کیجیے

''خالق کا کرشمہ''

پروفیسر انتخاب حمید
(اورنگ آباد)

نورالحسنین 1970ء سے مسلسل فکشن لکھ رہے ہیں ۔ ہندوستان کے مختلف گوشوں سے اُن کے فن کی پذیرائی ہوئی ہے اور یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ اس کے ساتھ ہی علاقائی ترجیحات کا کفر بھی ٹوٹا۔ اورنگ آباد دکن میں تخلیق کاروں کی قابل قدر تعداد موجود ہے، جن کی نگارشات ایسے بیشتر محاسن پر محیط ہیں جو تخلیق کو قابلِ تحسین قرار دیتے ہیں ۔ اِن تخلیقات میں ارضِ دکن کی سوندھی سوندھی مہک بھی ہے اور آفاقیت کے مضمرات بھی ۔ اہلِ نظر کی انتقادی تجاویز ان کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوسکتی ہیں، تخلیق کے پیچیدہ مراحل میں معاون ثابت ہو سکتی ہیں اور اُردو زبان وادب میں اضافہ کا سبب بن سکتی ہیں ۔ سنجیدہ اہم قلم کی صلاحیتوں کو جلا بخشنا بھی تو ہمارے دانشوروں اور مشاق ناقدین کا ایک اہم فریضہ ہے۔ بے التفاتی اُردو زبان وادب کے لیے بہرصورت مضر ثابت ہوگی ۔

ادب کے تئیں نورالحسنین کا معاملہ جز وقتی نہیں ہے۔ فکشن سے اُن کی گہری وابستگی، تخلیقی تنوع کے تئیں اُن کا تجسس، تحقیق اور تواتر اُنہیں فنکاروں کے اُس زمرہ میں شمولیت فراہم کرتے ہیں جو ستائش و صلے سے بے نیاز حسبِ مقدور تخلیقی کاوشوں میں مصروف ہیں ۔ اس ناول کے موضوع کا انتخاب اُن کے تلاشِ نوع کی ایسی ہی ایک مثال ہے ۔ اس دور میں جب کہ فکشن کے سروکار انقلابی طور پر تغیر پذیر ہیں ۔ عشق جیسے پیش پا اُفتادہ موضوع پر ایک طویل ناول لکھنا از خود ایک بڑے جوکھم کا کام ہے اور ناول بھی ایسا جس کا Episodic structure ہو، پانچ سو سال قبل مسیح سے تا حال منتخبہ عشقیہ داستانوں کو ایک ناول کے دھاگے میں پرو دیا گیا ہو، جبکہ رومانوی ناول کی اپنی تحدید ہوتی ہے ۔ یہ ناول تصورِ عشق پر اپنی بنائے وجود رکھتا ہے اور پلاٹ کے متعین خطوط پر اپنے تفاعلی مراحل طئے کرتا ہے۔ مثلاً جذبۂ عشق کا یک لخت بیدار ہونا یا یک طرفہ ہونا، موانع کا شدومد کے ساتھ روبہ عمل ہونا، پھر مدافعت، بغاوت اور قربانیاں، جاں کا زیاں یا پھر ہجر یا وصل وغیرہ ۔ اِس طرح رومانوی ناول یک رخی ہوتا جاتا ہے ۔ کوئی براقِ تخلیقیت ہی اُسے نئی معنوی اشکال عطا کرسکتی ہے ۔ ''چاند ہم سے باتیں کرتا ہے'' کوئی دعویٰ نہیں کرتا ۔ اس کے برعکس مصنف انکسار کے ساتھ یہ اعتراف کرتا ہے کہ ''یہ وادی (عشق) عزیز احمد، قرۃ العین حیدر اور قاضی عبدالستار کی ہے، اس وادی میں قدم رکھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی دلِ حسرت پرست بضد ادھر آنکلا ہو، پھر بھی میں نے ہمت باندھی ۔۔۔''

موضوع کی بندشوں کے باوجود یہ جرأت مندانہ قدم نورالحسنین نے یونہی نہیں اُٹھایا ۔ وہ ایک کہنہ مشق فکشن نگار ہیں، کہانی بننے اور اُسے ناول کے فریم میں چست و پیوست کرنے کا فن جانتے ہیں، کردار تراشی کی نزاکتوں سے واقف ہیں، فضاء سازی اور منظر کشی سے اُنھیں شغف ہے اور مکالمہ نویسی پر اُنھیں پیشہ ورانہ ملکہ حاصل رہا ہے ۔ وہ فکشن کے حساس قاری اور نقاد بھی ہیں اور رومانوی ناول جیسی متداولہ صنف کے پیچ وخم سے واقف ہیں ۔ اس لیے ''چاند ہم سے باتیں کرتا ہے'' سب سے پہلے اس صنف کی روائتی پیش کش پر خطِ تنسیخ کھینچتا ہے ۔ اس ناول کی ابتداء میں نہ تو کرداروں کے درمیان کوئی مکالمے ہیں، نہ کوئی سچویشن ہے نہ کوئی حادثہ یا واقعہ ہے نہ کوئی فضاء سازی ہے ۔ یہ ناول اپنی انفرادیت ایک اعلان کے ذریعہ قائم کرتا ہے جو عشق کی ماہیئت، اُس کے بنیادی اُصول وضوابط، اُس کے ناگزیر لوازمات، اُس کے ارضی وسماوی تلازمات اور تقاضوں پر ایک مخاطبہ قائم کرتا ہے ۔ اور یہ واضح کرتا ہے کہ عشق محض دو افراد کے درمیان مہین ومخملی احساسات ہی کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا ملکوتی حُسن اور افلاکی کردار بھی ہے ۔ اپنے وسیع تر مفہوم میں عشق ہی وجہ تخلیق کائنات بھی ہے:

میں عشق ہوں، میں اپنے خالق کا کرشمہ ہوں، جنون میرا مزاج، وفا اگر میری سلطنت ہے تو سرکشی اور بغاوت میری صفت، میں ازل سے ہوں اور ابد تک باقی رہوں گا ۔ میرا پہلا جلوہ کائنات کی تخلیق کا بہانہ ہے ۔ اُس کی حمد وثنا میں غرق ملائکہ میری ہی ڈور میں بندھے ہوئے ہیں ۔ وہ آسمان سے زمین پر مجھے بھیجنا چاہتا تھا ، اُسی نے مجھے آدم اور حوّا کی آنکھوں میں روشن کیا اور پھر اُن کے ساتھ ہی مجھے بھی زمین پر اُتار دیا ۔۔۔ تب سے آج تک میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا ہوں ۔

صدیوں نے میرے پیروں سے اُٹھنے والی آواز سلاسل سنی، مذاہب نے میرے خلاف اونچی اونچی دیواریں بلند کیں، مجھے مٹانے کے لیے کبھی لشکر میدانِ جنگ میں اُترے، کبھی مجھے آگ کے دریا کو پار کرنا پڑا، کبھی مجھ سے قربانیاں طلب کی گئیں، کبھی مجھے دیواروں میں زندہ چنوا دیا گیا، لیکن میں نے کبھی شکست تسلیم نہیں کیا، بلکہ کبھی تختہ دار پر، کبھی شہنائیوں کی گونج میں، کبھی دن کے اُجالوں اور کبھی رات کے اندھیروں میں اپنی فتح کا اعلان کیا ۔

میں عشق ہوں، میں جنون ہوں، میں بے اختیار ہوں، میں لازوال ہوں، میں ہر پابندی کے خلاف ہوں، میں ذات پات، جماعت سے بہت بلند ہوں، میں ہر جگہ موجود ہوں، زمانہ میری گذرگاہ ہے، میں ہر عہد میں سانس لیتا ہوں، میرے بے شمار چہرے ہیں اور میرے ہر چہرے کا راز دار چاند ہے ۔

اس طرح چاند بیانیہ میں داخل ہوتا ہے اور سہ اقتباسی اعلان کے فوراً بعد ہی ڈرامائی انداز میں ناول کی پہلی داستانِ عشق کا آغاز ہوتا ہے ۔ اختصار قابلِ تعریف ہے، کہیں کوئی غیر ضروری تفصیل نہ کوئی تاویل:

''وقت کا چاک اُلٹا گھومنے لگا
فضائیں معطر ہونے لگیں
صدیاں ماضی کی طرف لوٹنے لگیں

اور آخر دکن کی سہیادری کے کوہستان پر پانچ سو قبل مسیح کی ایک صبح پر ٹھہر گئیں۔

صدیاں چند الفاظ میں سمٹ گئیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہم اسکرین پر سب کچھ ہوتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔دکھانے کا یہ عمل ناول میں بار بار اپنے جلوے دکھاتا ہے کبھی جلوتوں خلوتوں میں، کبھی ہجر و وصل میں، کبھی میدانِ کارزار میں، اور کبھی منظر کشی میں۔ بر سبیلِ تذکرہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس ناول نے سنیما کے طریقہ ہائے کار سے دکھانے اور بیانیہ و مکالموں کی تعمیر میں حسب ضرورت استفادہ کیا ہے۔تخلیقی مراحل میں یہ عمل معیوب بھی نہیں ہے کیونکہ بین المتونیت دنیا کی بہترین افسانو تخلیقات کا خاصہ رہا ہے۔

''چاند ہم سے باتیں کرتا ہے'' عشقیہ واردات کا مرکب ہی نہیں ہے بلکہ چاند پر ایک مکالمہ بھی ہے۔رومانوی ناول میں چاند کے کئی پہلو، کئی رنگ، کئی افعال ہوتے ہیں، کہیں علامت، کہیں پیکر، کہیں استعارہ تو کہیں حقیقت۔چاند کا مدو جزر عاشقوں کو عجیب سرشاری کی کیفیت سے دوچار کرتا ہے۔عجیب سی شیفتگی اور سر مستی کی کیفیت ہوتی ہے۔اسی لیے تو عشاق کو جنونی بھی کہا جاتا ہے۔اس ناول کے حصہ اول میں ایک نہیں بلکہ دو مرکزی کردار ہیں، عشق اور چاند اور بیانیہ کی سطح پر دونوں متوازی ہیں اور ایک دوسرے کے لیے تحرک، تحسین اور تصدیق کے جواز فراہم کرتے ہیں۔چاند کی دودھیا روشنی اور اس کی سرور آگیں خنکی کبھی وصل کے لمحات کو دہکاتی ہے، کبھی خودسری تو کبھی خود سپردگی اور کبھی اتصال و اختلاط کی قباحتیں ڈھاتی تو کبھی فراق کے کرب و اضطراب کی شدتوں کو شدید تر کرتی ہے۔کہیں ریگستان کے ذروں کو ضوفشاں کر کے جنوں کی راہیں روشن کرتی ہے تو کہیں سرّیت کی دھند کو گہراتی چلی جاتی ہے اور کہیں وہ کالی داس کے ''میگھ دوت'' کی طرح سندیش واہک یا قاصد بھی ہے۔چاند آسمان کی اونچائیوں سے زمین کی پنہائیوں پر نظر ہی نہیں رکھتا بلکہ اس ناول میں اُسے کچھ غیر معمولی یا مافوق الفطرت قوتوں سے سرفراز بھی کیا گیا ہے۔وہ کرداروں کے دلوں کی کیفیات ہی نہیں اُن کے آئندہ اقدام بھی جانتا ہے یا پھر آئندہ اقدام کے لیے تحرک بھی بہم پہنچاتا ہے۔جس طرح سنجے اندھے دھرت راشٹر کو میدانِ جنگ کے حالات سے واقف کراتا ہے کم و بیش یہی عمل چاند فراق کے مارے ہوئے عاشق کے لیے انجام دیتا ہے۔پرتھوی راج اور سنجکتا کی عشقیہ داستان میں فنطاسیہ کچھ اس طرح جڑا گیا ہے کہ وہ سنجکتا کے تذبذب کو رفع بھی کرتا ہے اور بیانیہ کی روانی اور اس کے تاثر کو قائم بھی کرتا ہے۔چاند کے توسط سے فنطاسیہ کی یہی کارکردگی لیلیٰ مجنوں کی داستان میں بھی فعال نظر آتی ہے۔مجنوں کی آواز کو محسوس کرنا، چاند کی کرنوں کا لیلیٰ کے قدموں تک پہنچنا، دروازے کے قفل کا اپنے آپ ٹوٹ جانا غیر فطری ہونے کے باوجود قابلِ یقین لگتے ہیں۔کوئی اور ناول نگار ہوتا تو جوشِ جنوں میں لیلیٰ سے قفل تڑوا کر سچویشن کو مضحکہ خیز کر دیتا۔اور یہی چاند بیانیہ کے لئے مہمیز بھی ہے۔معاصر اُردو فکشن میں چاند پر یہ مکالمہ اس ناول ہی کا حصہ ہے۔

اس ناول کا اسٹرکچر چار بنیادی عناصر یا چوکور (Square) کی طرح چار زاویوں پر تعمیر کیا گیا ہے، عشق، چاند، وقت اور زبان، جو ناول کی دونوں شقوں میں مختلف طریقوں سے بیانیہ کے تعمل اور تاثر کو قائم کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔حصہ اول میں چاند سوتر دھار کی طرح ہے جو سنسکرت اور مراٹھی تھیٹر میں پلاٹ یا کہانی کے مضمرات کبھی اشارتاً اور کبھی واضح طور پر بیان کرتا ہے۔ماضی، حال اور مستقبل اُس کی گرفت میں ہوتے ہیں جنھیں وہ بقدرِ ضرورت ایک دوسرے میں ضم بھی کرتا ہے اور ایک دوسرے کے اختلاف و افتراق پر رائے زنی بھی کرتا ہے۔چاند بھی یہاں ایک شارح ہے۔اسی کے توسط سے عشقیہ داستان بیانیہ کے مدارج طئے کرتی ہے۔وہ عشق کی سرّیت کی گرہ کشائی کرتا ہے اور اسے گرہ بند بھی کرتا ہے تاکہ عشاق کا تجسس اور اُن کا اضطراب آتش زیر پا رہے، اُن کی روحانی تاب و توانائی موجزن رہے، منفی قوتوں سے نبرد آزما ہونے کے حوصلے جنوں خیز ہوتے رہیں۔وہ عشق کے فرطِ طرب اور فرطِ قلق کا شاہد واحد ہی نہیں ان کے لیے باعثِ تحریک بھی ہے۔چاند سوتر دھار کی معروضیت سے بالاتر ہے، وہ پُرخلوص اور سچا ہمدرد ہے، نشاط کے لمحوں میں عاشقوں کے ساتھ فرطِ نشاط سے جھوم اُٹھتا ہے تو اُن کی اذیت ناک گھڑیوں میں مغموم بھی ہوتا ہے۔وہ اپنی پوزیشن بدل بدل کر محبت کرنے والوں سے اپنی قربتیں، اپنی شرکتیں واضح کرتا ہے، کہیں وہ تیسری ڈال پر ہوتا ہے تو کبھی سرگوشی کرنے کے لیے ایک ڈالی اور نیچے اُتر آتا ہے۔اُس کی یہی شرکتیں بیانیہ میں ایک راست پن اور زبان میں شیرینی گھولتی ہے۔زبان و بیان کی حلاوت حصہ اول کی عشقیہ داستانوں کا وصفِ خاص ہے جو موضوعیاتی یکسانیت کے باوصف قاری کی دلچسپی کو بنائے رکھتا ہے۔چاند عشق میں مبتلا کرداروں کا ہمدرد ہی نہیں ہم احساس اور ہم گداز بھی ہے۔اُس کا دلِ گداختہ سارے عشاق کا درد سمیٹے ہوئے ہے۔یہاں عاشقوں کے تئیں انسانوں کی تنگ دلی اور سنگ دلی کی سمت ایک طنز آمیز اشارہ تہہ نشین ہے۔یشودھرا اور دیسو کی کہانی کا چندرم لہولہان چٹان پر اوندھا پڑا ہوا ہے۔بے پناہ محبت کرنے والوں کی موت پر چاند بہت غمگین ہے۔عشق کا Remark چاند کے مزاج کی گداختگی کا اعلامیہ ہے یہی گداختگی حصہ اول کے تمام بیانیہ پر چھائی ہوئی ہے۔عشق کہتا ہے، ''اے چاند تم تو رنجیدہ ہو گئے ہو۔۔کاش تمہارے جیسا دل انسانوں کے پاس بھی ہوتا۔۔۔''

سماج (قبیلہ) کے کٹھہرے میں کھڑا اگاشم تیکھے سوالات کے جواب دیتے ہوئے کہتا ہے:

سردار میں رین اور پربھات کا بھیدی ہوں، میں ندی کا ویاکل پانی ہوں، میں اگنی میں پانی کا جیون ہوں، میں اپرادھ اور ڈنڈ کی پری بھاشا میں کیول مانو ہوں، تمہارے سنسکار کا لوبھی بھی نہیں، میں تمہاری دیا کا بھکاری بھی نہیں، میں کیا ہوں اور کیا ہو گیا ہوں یہ تم نہیں سمجھ سکتے، کیونکہ تم تو کیول نیم کے دھارک ہو، مجھے کشل منگل دیکھنا چاہتے ہو تو انو راگ کو سمجھو اور قبیلوں کے نیم میں پری ورتن کرو، پھر میں تمہارے جیسا بن جاؤں گا۔

اگاشم کی قلب ماہیئت کو سمجھنا سردار اور اُس کے قبیلے کے سخت دل انسانوں، اور روزمرہ کے غلاموں، قدامت پسندوں اور من الحیثیت مجموعی مقتدرانہ

نظام کے لیے بعید از امکان ہے۔سماج کے اُصولوں میں تبدیلی ان کی آمریت کے عین منافی ہے۔المناک موت ہی ان محبت کے مارو کا مقدر ہوسکتی ہے جو عہد رواں کے Honour killing سے کسی طرح بھی مختلف نہیں ہے۔

چاند کی پلکوں میں عشق کی ہزار ہا داستانیں چھپی بیٹھی ہیں۔کہیں کسی داستان کے اختتام کا وہ چشم دید گواہ ہے تو کہیں عالم وجود میں آتی ہوئی کسی دوسری کہانی کا نقیب ہے:

(عشق) میرا سفر اسی طرح جاری رہے گا۔دل اسی طرح دھڑکیں گے لیکن ان دھڑکنوں کے ساتھ کیا سلوک ہوگا اس کے گواہ تم ہی رہو گے۔چاند نے عشق کی جانب دیکھا اور اُس کی نظریں مگدھ اور ویشالی پر ٹھہر گئیں۔

اور یہیں سے اجات شترو اور امرپالی کی کہانی شروع ہوتی ہے۔اس ناول کے پہلے حصے میں سبھی داستانیں اپنے المناک انجام کو پہنچتی ہیں بجز پرتھوی راج چوہان اور سلیم کی کہانیوں کے، دراصل یہ دونوں کہانیوں کی بافت باقی کہانیوں سے مختلف ہے۔بنیادی طور پر ان کہانیوں میں طربیہ Comic رنگ و آہنگ غالب ہے۔

رومانس (عشق) اور فطرت میں اس قدر یگانگت بلکہ یکتائی ہوتی ہے گویا یہ دونوں ایک دوسرے کی تشکیل و تکمیل ہی کے لیے عالم وجود میں آئے ہوں اور یہ بھی اتفاق ہی ہے کہ نسوانی حُسن کی دلفریبیوں، نزاکتوں اور نفاستوں کی بدیع کاری کے لیے خزائنہ فطرت ہی سے علائم و استعاروں، پیکر و تشبیہات کے بیش بہا لعل و گوہر مستعار لیے جاتے ہیں۔یہی عناصر فطرت اور مناظر فطرت ہیں جو نسوانی حُسن کو نکھارتے ہیں بلکہ اسے ابدیت سے ہمکنار بھی کرتے ہیں۔اس ناول میں بیانیہ اور فطرت ایک جان ہیں اور یہ کہنے میں مجھے کوئی عار نہیں ہے کہ فطرت بیانیہ میں کچھ اس طرح سے جاگزیں ہے کہ اس کے بغیر ناول کی انفرادیت کا معقول جواز قائم نہیں کیا جاسکتا۔فطرت اگر منہا ہو تو بیانیہ کا اسٹرکچر متزلزل ہونے لگے گا اور ناول ایک مبتذلیہ سپاٹ رومانی ناول ہو کر رہ جائے گا۔اور دوسرے اس لیے بھی کہ'' چاند ہم سے باتیں کرتا ہے'' یک موضوعی ناول ہے جس کا دورانیہ عہدِ عتیق سے لے کر عہدِ جدید و مابعد جدید تک پھیلا ہوا ہے۔یہ فطرت ہی کی کارفرمائی ہے جو ایک سطح پر اس ناول کی جاذبیت قائم رکھتی ہے تو دوسری طرف معنوی گنجائشیں بھی برقرار رکھتی ہے۔ہر داستان میں فطرت کی تصویر کشی مختلف طریقے سے کی گئی ہے جس کی وجہ سے یکسانیت جیسا نقص در نہیں آتا اور موضوعیت کی حد بندی کے باوجود قاری کی دلچسپی بنی رہتی ہے۔یہاں فطرت کو کچھ اس انداز میں بیان کیا گیا ہے گویا لفظوں میں مصوری کی جارہی ہو۔لفظیات کے جن رنگوں سے مصوری کی گئی ہے وہ کرداروں کے ذہنی و جذباتی کیفیات سے واضح مطابقت رکھتے ہیں۔جنسی کیفیات کے بیانات بھی فطرت ہی کے توسط سے خلق کیے گئے ہیں:

چاندنی دودھ کی طرح چھٹکی ہوئی تھی، اور وہ پروراندی کی وادی سے دور بھنڈار درے کی نہایت اونچی گھاٹی پر بیٹھے ہوئے تھے اور اُس کے بہت نیچے مولا ندی شانت بہہ رہی تھی۔اگاشم چمپا اور گیندے کے پھولوں سے اُس کا سنگھار کر رہا تھا۔۔۔پیشانی پر پھولوں کی لڑی باندھنے کے بعد اُس نے گیندے کے پھولوں کی مالا اُس کے گلے میں پہنایا اور کمر میں پھولوں کی لڑی باندھنے کے لیے جیسے ہی وہ جھکا وہ اُس کے سینے سے لگ گئی۔۔۔اگاشم اُسے لیے زمین پر لیٹ گیا۔آسمان سے چاند نے دونوں کی طرف دیکھا، ہواؤں نے سیٹیاں بجائیں، اور پیپل کے درختوں کے پتوں نے خوش ہو کر تالیاں بجانا شروع کیا، گھاٹی سے بہت نیچے بہنے والی ندی نے نہایت سُریلا راگ چھیڑا۔۔۔

''نہیں۔۔۔میں یہ جان چکا تھا کہ آکاش میں بادل چھانے لگے ہیں اور دھرتی تڑخنے لگی ہے۔''

یشودھرا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''بادل برس گئے اور میری دھرتی ہریالی سے بھر گئی۔''

یشودھرا کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

''مجھے پورا وشواس ہے، سورہ چاہے کیسی ہی اگن اُگلے دھرتی سے ہریالی کا سمبندھ ٹوٹے گا نہیں۔''

اُس نے پھول کی پنکھڑیوں سے شبنم کا ایک ایک قطرہ چوس لیا۔

فطرت کی طرح رومانوی ناول میں عشق، تصور عشق کا ارتباط تاریخی سیاق و سباق کے ساتھ بھی بہت گہرا ہوتا ہے کیونکہ ہر دور عشق کی تعریف خود متعین کرتا ہے۔تاریخی تغیرات کے تحت تصور عشق بھی تغیر پذیر ہوتا ہے، لیکن تاریخ اور تاریخیت کے فکشن میں شمولیت کے تقاضے پیچیدہ نوعیت کے برتاؤ کے متقاضی ہوتے ہیں۔اس نہج پر ناول نگار بڑی احتیاط سے دامن بچا کر گذر جاتا ہے۔وہ تاریخ کے انہی ابواب پر توجہ مرکوز رکھتا ہے جو ناول کے موضوعاتی سیاق اور تاثراتی فضاء خلق کرنے میں معاون و موثر ثابت ہوتے ہیں۔اس ناول میں مصنف کے تاریخ سے معاملات سنجیدہ تحقیقی جستجو کے اشارے بہم پہنچاتے ہیں۔کرداروں کے طریقہ ہائے بود باش، رفتار و گفتار، رسوم و رواج اپنے زمانے کے مطابق ہیں۔موسیقار اور آلاتِ موسیقی، رقص اور رقاصاؤں کے ہار سنگھار، مہارانیوں کی وضع قطع اپنی تاریخ سے منسوب ہیں۔درباری آداب، فوج، ہاتھی گھوڑوں کی تعداد، صف آرائی کی تراکیب، میدان جنگ کے اہم کرداروں کے نام اور اُن کے مقام اور بیشتر جزوی تفصیلات تاریخ سے استنباط کی گئی ہیں۔کچھ حصوں میں تخیل کی کارگذاریاں بھی ہیں جو حقیقت سے بعید نظر نہیں آتیں۔جغرافیائی ریسرچ بھی توجہ طلب ہے۔ندیوں، دریاؤں، جنگلوں اور مقامات کے نام سیاقی حقائق کا قابل یقین، حقیقی منظر نامہ تعمیر کرتے ہیں۔

عشق کی ایک اور طرز ادا بھی قابل توجہ ہے جو یکسر مختلف ہے۔درج ذیل اقتباس رانی روپ متی اور باز بہادر کی داستان کے اختتامیہ سے ماخوذ ہے جہاں آدم خان جو جبر و قوت اور مقتدارانہ نظام کی علامت ہے، رانی روپ متی کو غصب کرنے کے درپے ہے، نتیجتاً رانی روپ متی خودکشی کر لیتی ہے اور باز بہادر

بھی، کیونکہ روپ متی کے بغیر اُس کے یہاں زندگی کا کوئی تصور ہی نہیں۔آدم خان کے شدید احساسِ ندامت اوراور فطرت کی غضبنا کیوں کے مابین متناسبیت بیانیہ کے مقصود کو ایک موثر پیرائیہ اظہار عطا کرتی ہے۔اسی کا دوسرا دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ بیانیہ فوراً ہی عشق کے المناک وقوعوں کے باوصف نومیدی اور عشق کے تسلسل کی راہیں بھی اِنہیں عناصرِ فطرت کے توسط سے وا کرتا ہے۔نادم اور شرم سار آدم خان اپنے لشکر کے ساتھ جائے واردات سے دارالخلافہ کی سمت نکل پڑتا ہے۔لشکر برق رفتاری سے محوسفر ہے:

اُس نے نظریں اُٹھائیں اور آسمان کی طرف دیکھا، اُسے محسوس ہوا عشق فریاد بہ لب ہے۔آہیں بادلوں میں بدل رہی ہیں۔آسمان غصے سے کانپ رہا ہے، وحشتیں زمین پر اُتر رہی ہیں اور پھر ہواؤں نے سیٹیاں بجانا شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے بادلوں نے آپس میں ٹکرانا شروع کردیا اور موسلہ دھار بارش ہونے لگی۔۔۔۔زمین نئی کونپلوں سے آباد ہونے لگی اور پھران کونپلو میں عشق کسی پودے کی صورت لہلہا رہا تھا۔۔۔

اسی جغرافیائی اور تاریخی تناظر میں "چاند ہم سے باتیں کرتا ہے" عشقیہ ڈسکورس قائم کرتا ہے۔ازمنۂ قدیم کے عشاق کے درمیان ایک اہم ترین قدر مشترک ہے اور وہ ہے فنافی العشق۔دیسو، فرہاد، مجنوں، مہ جبین و دیگر معشوق عشق میں اپنے آپ کو فنا کرنے ہی میں اپنی معراج سمجھتے ہیں۔دنیا و مافیہا سے بے نیاز عشقِ بے پناہ ہی اُن کا مسلکِ حیات ہے۔ریاکاری، خودغرضی یا مصلحت کوشی ان کے عشق کی سرشست میں شامل نہیں کیونکہ عشقِ صادق فی نفسہ اِن میں سے کسی بھی عمل کا متحمل نہیں ہوسکتا۔رومانوی ناول (بحیثیتِ صنف) تجزیاتی سوچ کا متقاضی بھی ہوتا ہے جو روائتی رومانوی ناول کا Missing dimension ہے، اکثر و بیشتر نظر نہیں آتا۔وہ عشق کی جنوں خیز داستان کو بیان کرتا چلا جاتا ہے لیکن صرف جنون یا بے لوث محبت کا راست بیانیہ عشق کے تعمق کا محاکمہ اس طرح نہیں کرسکتا جس کا وہ متقاضی ہوتا ہے۔عشق کے تعمل میں استثنا بھی ہوسکتا ہے جو استبصار کا مطالبہ کرتا ہے، جہاں ترجیحات کا روبہ عمل ہونا بھی اتنا ہی ناگزیر ہوتا ہے جتنا کہ عشق و وصل کا کامیاب ہونا۔یہاں عشق کی شدتوں یا اُس کی صداقتوں میں کلام نہیں ہے لیکن نظامِ حیات کے ترفع کے لیے کچھ اعلیٰ اقدار کا تحفظ بھی از حد ضروری ہوتا ہے جو عشق سے قربانی طلب کرتا ہے۔فرائض منصبی کی ترجیحات سے عشق کے جمال و کمال میں کمی واقع نہیں ہوتی بلکہ اس طرح کی ترجیحات سے تصورِ عشق اور نکھر آتا ہے۔"
چاند ہم سے باتیں کرتا ہے" اس سمت میں اپنی سوچ کے واضح اشارے فراہم کرتا ہے۔ناول کے ہر دو حصوں میں استثنائی عشقیہ کہانی شامل کی گئی ہے۔ایک تو سکندر اعظم اور دوسری رخسانہ کی کہانیاں بر بنائے ترجیح عشقیہ تعمل کی مثالیں ہیں جہاں فرائض اور اخلاقی ذمہ داریوں کی عشق پر فوقیت عشق کے معنوی رنگوں کو اور گہرا کرتی ہے۔فوقیت یا ترجیح اس کے برعکس ہو تو عشق کے جلال کے لیے سمِ قاتل ثابت ہوسکتی ہے۔عشق بہر صورت قربان جانے ہی سے متصف ہے۔

ناول ان نتائج کو بھی افسانوی شکل عطا کرتا ہے جہاں ترجیحات چوک جاتی ہیں، جس کا خمیازہ صرف عاشقوں کو ہی نہیں بلکہ دیگر لوگوں اور عوام کو بھی بھگتنا پڑتا ہے۔اجات شترو اور امرپالی کی داستان اس کی تصدیق کرتی ہے کہ اگر فرائضِ منصبی کا غلبہ اس قدر شدید ہو کہ اخلاقی حدود سے تجاوز کیا جائے، عشق کی نزاکتوں، اس کے تقاضوں کو یکسر نظر انداز کیا جائے تو انجام کار وہی ہوتا ہے جو ہم ویشالی میں دیکھتے ہیں یا پھر شیر افگن کے انجام میں۔اس طرح کے ناول میں ذات و ترجیحات کے تصادمات سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔ارسطو اور سکندر اعظم کے اس موضوع پر مکالمات اس کی واضح مثال ہیں۔سکندر جانتا ہے کہ ارسطو اُسے "فطرت کے خلاف درس دے رہا ہے" تاہم وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ اپنے فرائض سے روگردانی نہیں کرسکتا۔اس گومگو کیفیت کا اختتام بالآخر اس کے اعترافی بیان پر ہوتا ہے کہ "مقدونیہ کا یہ بادشاہ آپ کا احسان مند ہے، آپ نے اُسے بروقت بچالیا۔۔۔وہ جلد ہی جنگی مہم پر روانہ ہوجائے گا۔" پرتھوی راج اور سنجگتا کی کہانی میں چاند بردری عرض کرتا ہے:

مہاراج پریم اور کرتویہ کی بھاشا کے نیّم الگ الگ ہیں۔پریم ایک ویکتی کا اپنا سنسار ہے تو کرتویہ جیون کا شنگھار۔پریم کی ہار ایک ویکتی کی ہار ہے کنتو کرتویہ کی ہار ایک سنسار کی ہار ہے۔

عہدِ رواں تک پہنچتے پہنچتے عشق کا ملکوتی کردار، اُس کا وقار نئی ثقافت کی بھینٹ چڑھ چکا ہے۔عشق اپنے زوال و ابتذال کی وہ منزلیں طئے کرچکا ہے جس کے بعد شاید کوئی منزل ہی نہیں ہے۔حرص و ہوس، خودغرضی و خودارتکازی، جنسیت و فوقیت، سفاکی و سفلہ پروری جیسے خصائل کے جارحانہ غلبے نے عشق کے حسن، اس کے جاہ و جلال اور تقدس و عظمت کو نہ صرف پارہ پارہ بلکہ پائمال کر دیا ہے۔مصنف بھی رومانوی طرزِ تحریر کے امکانات گویا exhaust بروئے کار لاچکا ہے۔ویسے بھی ناول کے اس حصے میں رومانیت اور متعلقہ اسلوب کی چنداں ضرورت نہیں۔Matter- of- fact طرزِ بیان ہی اس نوعیت کی "محبتوں" سے دوچار ہوسکتا ہے۔موسیقی آمیز طرزِ بیان ٹاٹ پر زردوزی کاری گری جیسا محسوس ہوتا۔اس لئے یہاں رومانی طرزِ بیان کی بجائے افسانوی تکنیک سے کام لیا گیا ہے۔یہی تکنیک عشق کے تقابلی جائزہ کا فریضہ بھی انجام دیتی ہے۔بیشتر کرداروں کے نام وہی رکھے گئے ہیں جو حصہ اول میں تھے۔جو عشق کی استقامت و صداقت اور ایثار و قربانی کے نمائندہ کردار تھے۔تاہم ان کی سوچ، عمل اور ردعمل کو یہاں مخالف سمت میں موڑ دیا گیا ہے۔اب یہ کردار عشق کے نام پر فلرٹ کرتے ہیں، عشق کے پسِ پردہ استحصال کرتے ہیں۔کذب و ریا ان کا شعار ہے۔عشق ان کے لئے مطلب براری کا ایک وسیلہ ہے۔شاپنگ مالس، کافی کارنر، لانز اور ہائیڈ آؤٹ ان کی عبادت گاہیں ہیں۔انٹرنیٹ، موبائل اور تکنالوجی ان کے لئے صحیفۂ حیات ہے جن کی طرف یہ خشوع و خضوع کے ساتھ مسلسل رجوع ہوتے رہتے ہیں۔لغویات، ویڈیو چیٹنگ، جذبات کو برانگیخت

کرنے والے ویڈیوز ان کے معمولات ہیں۔اس لئے''عشق کی گردن جھکی ہوئی ہے،اور'چاند آسمان کی بلندیوں میں واپس چلا گیا ہے۔'مضحکہ خیز عشقیہ کرداروں کی اس گیلری میں صرف رخسانہ ہی ایسا کردار ہے جو خود شناس ہے۔عشق کی شدتوں،اخلاقی تقاضوں اور ذمہ داریوں سے واقف ہے۔

عشق کی اس ناگفتہ بہ صورت حال کے برعکس اس ناول میں ایسے مکالمات اور اقتباسات بھی ہیں جو دانشورانہ تفاعل کے حامل ہیں۔یشودھرا اور اس کی دادی کے بیچ مکالمات اس نقطۂ نظر سے دلچسپ ہیں۔دادی کے عشق مخالف دانشورانہ مشورے اپنی دلیل اپنا استناد رکھتے ہیں۔کہیں کہیں ما بعد الطبعیاتی جھلک بھی نظر آتی ہے:

یہ مورکھ منشیہ بھول جاتا ہے کہ وہ ماٹی کا پتلا ہے۔وہ،وہ کاریہ کرنا چاہتا ہے جو سنسار کا رچیا نہیں چاہتا،اسی لئے مہارشیوں نے کہا کہ منوشیہ کا جیون بھی ایک مایہ موہ کا جال ہے۔وہ دیالو ہونے کا دکھاوا کرتا ہے،کٹھو ہوتا نہیں،کائر ہوتا ہے کٹھو شور کہلانے کی اچھا کرتا ہے۔من میں کرودھ،کپٹ،لالسا رکھتا ہے،کٹھو چاہتا ہے کہ دونوں لوک میں نسوار تھی کہلائے۔اپنے کرتو یہ کے پالن سے دور بھاگتا ہے اور چاہتا ہے کرتو یہ وان کہلائے۔

یہ دنیا کبھی نہ ختم ہونے والی اچھاؤں کا گھڑا ہے،موہ مایا اور ولاستا کا جال ہے،جو بھی ان میں ایک بار پرویش کرتا ہے،پھر اسے کوئی مارگ نہیں ملتا، یہاں پگ پگ گھات ہی گھات ہے،یہ سندرتا،یہ راج پاٹ،یہ مان سمان، ابھیمان اور یہ جیون سب کچھ نشٹ ہونے والا ہے۔ان کا تیاگ ہی ستیہ کا مارگ ہے اور ستیہ ہی نروان ہے۔۔۔۔

مزید برآں اس ناول میں کچھ ایسے بیانات،کچھ ایسے مکالمے بھی ہیں جن میں متصوفیانہ رنگوں کی آمیزش انھیں ماروائیت کے قریب لے آتی ہے لیکن دلچسپ یہ ہے کہ عشق کی ارضیت متاثر نہیں ہوتی نہ ہی رومانوی ناول کے معمولات متاثر ہوتے ہیں۔عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں ہی میں من وتو کے فاصلے حصولِ مقصد کے منافی ہیں۔اس بُعد کا تحلیل ہونا بلکہ مٹ جانا عشق کی منتہیٰ کے لئے بے انتہا ضروری ہے۔یہاں بیانیہ کے جمالیاتی،لسانی اور موضوعاتی دائرہ کار میں ایک منفرد رنگ وآہنگ شامل ہے۔تصوف اور رومان کا ہم رنگ امتزاج معمولہ کو ماورا سے ہم آہنگ کرتا ہے:

اپنے من میں ڈوب جاؤ بھول جاؤ اپنی ہستی۔۔۔۔۔دوئی کا در چھوڑ دو،اور ایک ہو جاؤ،پھر دیکھو وصل کی گھڑیاں کیسے تمہارا مقدر بنتی ہیں۔قیس نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنے وجود کے ایک ایک حصے کو فراموش کرنے لگا۔۔۔اب اس کی آنکھوں میں طرح طرح کے رنگ گڈمڈ ہونے لگے،اسے لگا ساری کائنات ایک نقطہ پر جمع ہونے لگی ہے اور سارے رنگ ایک ہو گئے ہیں۔ اب جو بھی ہے بس نور ہی نور ہے۔وہ سمٹتا گیا،سمٹتا گیا یہاں تک اس کا سارا وجود سمٹ کر صرف دل بن گیا۔۔۔۔۔

عشق کی شدتیں زماں و مکاں کے فاصلوں کو خاطر میں نہیں؛ لاتیں۔یہی وہ شدتیں ہیں جو تحدید کے باوصف معشوق کے دل پر دستک دیتی ہیں۔یہ شدتیں نارسائی سے ماورا ہوتی ہیں،معشوق تک پہنچ ہی جاتی ہیں:''لیلیٰ نے آنکھیں کھولیں۔۔۔یہ مجھے کون آوازیں دے رہا ہے۔''

مذکورہ بالا اور درج ذیل اظہارات اس ناول میں لسانی عمل اور اس کے جمالیاتی لوازمات کی سمت بھی توجہ مبذول کرتے ہیں:

(سکندر بستر مرگ پر ہے)رخسانہ نے اپنے آنسوں پوچھ لئے اور اس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے مرجھائے ہوئے پھول کی شبنم سے کوئی کرن خواہ مخواہ منور ہونے کی کوشش کر رہی ہو۔۔۔

اپنے آنسوؤں کو سنبھال کے رکھ ہیر،ان کو تو آگے چناب ہونا ہے۔۔۔۔

آواز خواب کے در کھول کر بے نقاب ہو رہی تھی۔تڑپ آہ بنی،آہ خواب میں ڈھلی اور خواب حقیقت بن گیا،تمہاری آمد سے صحرا گلستان بن گیا۔

کہیں کہیں زبان یا Composition کی غلطیاں نظر آتی ہیں اور کسی ایک جگہ بیانیہ میں نقطۂ نظر کی وجہ سے زبان کے تناظر میں فرق بھی پڑتا ہے تاہم زبان اس ناول کا قابلِ توجہ پہلو ہے۔ہر کہانی کی اپنی زبان ہے جو اپنے تاریخی پس منظر سے مربوط ہی نہیں ہے،اپنے عصر کی وضاحتیں بھی فراہم کرتی ہیں۔دراصل زبان ہی کے توسط سے عشقیہ کہانیوں کے مابین حد فاصل قائم کی گئی ہے ورنہ موضوعی یکسانیت کے باعث ہر کہانی کی تاثراتی اکائی کو قائم رکھنا قدرے محال ہوتا۔منظر کشی،مکالمات اور عمرانیاتی جزویات کی شیرازہ بندی حسبِ ضرورت لسانی تراکیب ہی کے توسط سے کی گئی ہے۔

کہانی در کہانی اور کہانی بر کہانی بننے کا ہنر نورالحسنین خوب جانتے ہیں۔ایک کہانی کے اختتام سے دوسری کہانی ایسے فطری انداز میں ظہور پذیر ہوتی ہے جیسے رات سے دن یا دن سے رات یا پھر بالکل اسی طرح جیسے کسی تراشیدہ نظم کے ایک بند کے آخری مصرعہ سے اگلا بند رونما ہوتا ہے۔حصہ دوم کی کہانیوں میں فکشن کی تکنیک کے توسط سے عشق کے تنزل کے ڈسکورس کو بیانیہ میں ضم کیا گیا ہے۔عشق کی رعنائی ورعونت،توانائی وتقدس کا فقدان یہاں اغلب ہے،رومانوی تاویلات کے لئے یہاں موقع ہے نہ محل موزوں۔ثانوی تفصیلات بیانیہ کی روانی میں رخنہ گر ثابت ہو سکتی ہیں،اسی لئے تکنیک کے تحت اختصار اور اختصار کے تحت آئرنی کو روبہ عمل رکھا گیا ہے۔عصر حاضر کی صارفیت پسندی اور طلب آشنائی پر ایک ضرب کاری کے ساتھ ناول تکمیل کو پہنچتا ہے۔عشق شرمسار ہے،چاند آسمان کی اونچائیوں میں جا چکا ہے۔آخری جملہ میں لفظ'سوا' کا استعمال بڑا معنی خیز ہے۔محبت کے سوا بھی چاند کے دل میں کئی رازہائے سربستہ مضطرب ہیں مگر سماعتوں اور بصارتوں سے محروم انسان عہد نو کی چکاچوند میں کہیں کھو چکا ہے۔ دودھیا چاندنی غمگین اور کرب انگیز کرنیں خاموش ہیں۔

''آہنکار۔۔۔''

بشر نواز
(اورنگ آباد)

کہا جاتا ہے زندگی میں قدم قدم پر کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ میکل انجلو نے بھی اپنے فن کے مناسبت سے یہی بات کچھ اس انداز سے کہی ہے ''مر مر کی ہر سِل میں کوئی نہ کوئی مورتی ہوتی ہے۔ فنکار کا کام صرف اس کے غیر ضروری اجزا کو الگ کر کے مورتی کو برآمد کرنا ہوتا ہے۔'' اس قول میں یہ نکتہ بھی پوشیدہ ہے کہ فنکار کی نظر اتنی تیز ہونی چاہیے کہ وہ غیر ضروری حصّے اور مورتی میں فرق محسوس کر سکے۔ اسی بات کو اگر ہم افسانہ، ناولٹ، ڈرامہ، یا شاعری پر منطبق کریں تو واضح ہوتا ہے کہ ہر کامیاب فنکار کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ زندگی کے تجربات و واقعات سے ان غیر ضروری عناصر کو الگ کر کے اپنے فن کی تشکیل کرے۔ جو عناصر اس کے فنکاری اور تھیم تک پہنچنے میں حائل ہو رہے ہوں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کہانیاں واقعات و تجربات سے جنم لیتی ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر واقعہ یا تجربہ کہانی نہیں ہوتا۔ واقعہ کو کہانی تک پہنچنے میں کئی مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے اور یہیں کہانی کار کی آزمائش ہوتی ہے۔ اچھا کہانی کار مختلف واقعات میں سے اُن اجزا کو چن لیتا ہے جو اُس کے نظریے کو واضح کر سکے۔ بہت ممکن ہے کہ اس سلسلے میں اسے کئی واقعات کے مختلف اجزا کو جوڑ کر ایک نیا واقعہ ترتیب دینا پڑے۔ اجزا کی انتخاب، اُن کی ترتیب، اور اس میں تخیلی رنگ آمیزی تخلیقی عمل کی بنیاد ہے جو فنکار اس راز سے واقف نہ ہو، وہ یا تو لفظوں کے گورکھ دھندوں میں اُلجھ جاتے ہیں، یا پھر واقعہ کو صحافتی انداز میں بیان کر کے حقیقت پسندی کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں۔ حقیقت پسندی واقعات کا من وعن بیان نہیں ہے، بلکہ مختلف حقیقتوں کو ترتیب دے کر ایک نئی حقیقت کی دریافت کا عمل ہے۔ اور یہ عمل اس وقت تک پورا نہیں ہوتا جب تک فنکار اپنے خارجی وسائل مثلاً مشاہدے اور مشاہدے کے اظہار پر قدرت نہ رکھتا ہو۔ کوئی مشاہدہ اس وقت تک کہانی نہیں بن سکتا جب تک کہانی کار کو کہانی کہنے کا ہنر نہ آتا ہو، کہانی کہنا بذات خود ایک ایسا تخلیقی عمل ہے جو حقیقت پر مبنی ہوتے ہوئے بھی حقیقتِ کُلی نہیں ہوتا۔ جو ہے اس کا بیان صحافت ہے اور جو ہے اُسے کیسا ہونا چاہیے اس کی تفصیل فنکاری ہے۔ جب ہم فنکاری کہتے ہیں تو گویا ہم خود اپنے اوپر کئی پابندیاں عائد کر لیتے ہیں۔ اور ان پابندیوں کے بغیر کوئی فن، فن نہیں کہلا سکتا۔ پابندی یہ ہوتی کہ ہم جس زبان میں فن پارہ تخلیق کر رہے ہوں اس زبان کے اُصول وضوابط پر کس حد تک پورے اُترتے ہیں، پابندی یہ ہوتی ہے کہ ہر اُس واقعہ میں جو بیان کیا جا رہا ہو، تجسس اور دلچسپی کو برقرار رکھیں اور پابندی یہ بھی ہوتی ہے کہ ہمارے کردار و واقعات اپنے فطری انداز میں نمو کرتے جائیں۔ ان پابندیوں کے ساتھ کسی فن پارے کی تخلیق پُل صراط سے گزرنے کے مماثل ہے کہ ذرا سی بھول چوک بھی کہانی اور کہانی کار دونوں کی عاقبت خراب کر سکتی ہے گذشتہ چند برسوں میں اس قسم کی مثالیں مل جائیں گی۔

نورالحسنین اس پُر خطر راہ کی اونچ نیچ سے پوری طرح واقف ہیں۔ اس لیے وہ سنبھل سنبھل کر قدم اُٹھاتے ہیں لیکن اس ہُنر مندی سے کہ اُن کا ہر قدم بے ساختہ معلوم ہوتا ہے۔ شاید اسی انداز کو غالبؔ نے سادگی و پُر کاری کہا ہے۔ نورالحسنین کے یہاں سادگی بھی ہے اور پُر کاری بھی۔ اُن کی کہانیاں پہلی سطح پر بھی بہت کچھ کہتی ہیں لیکن ان کی دوسری اور تیسری سطح بھی معنوی پرتوں کو مزید کھولتی جاتی ہیں۔ اس طرح ان کی سادگی یا بیانیے کی بے ساختگی اپنے اندر کئی رموز وعلائم چھپائے ہوتی ہیں۔ اولین سطح پر رموز وعلائم کی نمائش کسی بیسوا کے جسم کی بھڑی نمائش سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ علامت ہو، استعارہ ہو، کنایہ ہو یا اشارہ سبھی کا حُسن اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ پڑھنے والے کے ذہن میں آہستہ آہستہ کھلتے جائیں اور جب خود کو پوری طرح منکشف کریں تو قاری ایک نئے جہان میں اپنے آپ کو محسوس کرے۔ ''آہنکار'' نورالحسنین کا ایسا ناول ہے جو پہلی سطح پر بھی قاری کو متوجہ کرتا ہے اور اہلِ نظر کے سامنے اپنی مختلف معنوی پرتیں کھولتا جاتا ہے۔ اس ناول کی ایک بڑی خوبی اُس کا منظر نامہ بھی ہے۔ یہ منظر نامہ ہمارے اطراف و اکناف بکھرا ہوا ہے۔ ناول کے تمام کردار ہمارے جانے پہچانے اور دیکھے بھالے ہیں۔ ناول کی فضاء بھی مانوس ہے لیکن جب ہم اسے پورا پڑھ جاتے ہیں تو کچھ نئے انکشاف ہوتے ہیں۔ ہر کردار کا سفر خارجی دُنیا میں تو جاری ہے ہی باطن میں بھی اس کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ سمپت راؤ کا ہر عمل خارج میں خواہ کچھ نظر آئے باطنی طور پر انسانی رشتوں کی تلاش بن جاتا ہے۔ مصنف نے اُس کے خارجی عمل کا جو جواز پیدا کیا ہے اُس میں بھی انسانی نفسیات کو پوری طرح پیشِ نظر رکھا ہے۔ چونکہ وہ بیوی کا علاج بر وقت نہیں کروا سکا، مادی وسائل کی کمی نے اُس کی جیتی جاگتی ہنستی کھیلتی زندگی کے تانے بانے بکھیر دیے۔ اس لیے اُس میں ایک نفسیاتی گرہ پڑ گئی اور اسی وجہ سے وہ بڑی حد تک ایذا پسندی کا شکار ہو گیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُس کے باطن میں موجود انسان اُسے بار بار کچوکے دیتا رہتا ہے۔ یہ باطنی انسان اُس کا ضمیر ہے اور مرحوم بیوی اُس کا اشاریہ، ہر غلط قدم پر اُس کی بیوی کی تصویر کا بول اُٹھنا، دراصل اس کے اپنے ضمیر کی آواز ہے۔

نورالحسنین نے انتہائی فنکاری سے سمپت راؤ کے مقابل ایک اور کردار بھی کھڑا کر دیا ہے اور وہ کردار ہے 'کڑوبا' کڑوبا گاؤں کی سیدھی سادھی زندگی اور فطری زندگی کا اشاریہ ہے۔ یہ کردار بڑی حد تک یک سطحی ہے۔ نورالحسنین نے سمپت راؤ کے پیچیدہ کردار کے مقابل اس یک سطحی کردار کو قائم کر کے اُن کمیوں اور خامیوں کو اُبھارنا چاہا ہے جو سمپت راؤ میں پیدا ہو گئیں ہیں۔ 'کڑوبا' خارجی سطح پر سمپت راؤ کے ضمیر کو جگاتا رہتا ہے۔ برخلاف اس کے سمپت راؤ کی بیوی بڑے غیر راست انداز میں اُس کے ضمیر کو کچوکے دیتی رہتی ہے۔ اور

سمپت راؤ اس خارجی اور داخلی دباؤ کے ساتھ نہ صرف جیتا ہے بلکہ زندگی کے مختلف مرحلوں سے گزرتا ہے۔ وہ گرہ جو مادی وسائل کی عدم موجودگی کی وجہ سے اُس کی نفسیات میں پڑ گئی ہے۔ اس سے گاؤں کی زمینیں بھی خریدواتی ہیں۔ مال و دولت کی چھچھوری نمائش بھی کرواتی ہے ۔ یہاں تک کہ وہ انسانی رشتوں کو خریدنے کی کوشش کرتا ہے۔ شنکر کو ملازم رکھنے کا عمل اسی انسانی رشتوں کو خریدنے کا عکاسی ہے۔ سمپت راؤ کا اپنے بیٹے سے دور ہو جانا، شنکر کو اس کے باپ سے دور کر کے تسکین پانے کی خواہش سے ظاہر ہے۔ چونکہ سمپت راؤ کی بیوی اس سے ہمیشہ کے لیے دور ہو گئی ہے اس لیے وہ شنکر کو بھی اُس کی بیوی کے پیار سے دور دور رکھنا چاہتا ہے۔ بظاہر تو یہ عمل بڑا ہی ولینیش (Villanous) معلوم ہوتا ہے لیکن سمپت راؤ کی محرومیاں بڑی حد تک اس کا جواز بن جاتی ہیں۔ اگر کہانی یہیں پر رُک جاتی اور سمپت راؤ آخر تک ایک ویلن ہی کے روپ میں برقرار رہتا تو شاید یہ ناول اتنا کامیاب نہ ہوتا۔ مصنف نے ایک خاص مقام و موقع تک سمپت راؤ کے اس کردار کو برقرار رکھا ہے لیکن آگے چل کر بہت ہی فطری انداز میں اس کی تقلیب بھی کر دی ہے۔ اور ایسے مواقع پیدا کیے ہیں جو سمپت راؤ کو اپنے روئیوں پر دوبارہ غور کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اور بالآخر اُس کے اندر کا انسان جاگ اُٹھتا ہے اور اُس پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ صرف مادی وسائل ہی مکمل زندگی نہیں ہے۔ اصل زندگی تو انسانی رشتوں سے جنم لیتی ہے۔ یہ رشتے خواہ کتنے ہی اُلجھ جائیں، ٹوٹتے نہیں ہیں اور کہیں نہ کہیں اُن کا ایسا سرا ہوتا ہے جس کے ہاتھ آتے ہی تمام گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔

سمپت راؤ کے یہاں یہ سرا اس کے بیٹے کی واپسی ہے اور جیسے ہی یہ سرا ہاتھ آتا ہے سمپت راؤ پھر سے وہی سمپت راؤ بن جاتا ہے۔ جو زندگی کے مثبت پہلو کا اشاریہ ہے۔

کہانی شروع سے آخر تک اپنا تجسس برقرار رکھتی ہے۔ تجسس برقرار رکھنے کے لیے نورالحسنین نے فلیش بیک اور فلیش فارورڈ کی تکنیک استعمال کی ہے۔ اس کے ہر عمل کے ساتھ ہی فلیش بیک میں کچھ اور واقعات نمودار ہوتے ہیں۔ جب تک قاری سمپت راؤ کے وقتی عمل سے گزرتا ہے اُس وقت تک اس میں یہ تجسس برقرار رہتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا ؟ فلیش بیک اس کی وجہ اور سبب بن جاتا ہے۔ اس طرح کہانی لپٹتی اور کھلتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی گرہیں پڑ جاتی ہیں اور سلجھتی ہیں پھر گرہیں پڑتی ہیں اور سلجھتی ہیں یہاں تک کہ آخری صفحات تک پہنچتے پہنچتے کہانی پھر سے ایک سیدھی ڈور بن جاتی ہے۔ نورالحسنین کی فنکاری یہی ہے کہ اُنھوں نے کہانی کی تمام شرائط کو پورا کرتے ہوئے اپنی بات کامیابی سے کہی ہے۔

یہاں ایک بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اسے ہم کہانی کی تکنیک سے بھی جوڑ سکتے ہیں۔ کہانی کا منظر نامہ بذات خود ایک کردار کی طرح سامنے آتا ہے جہاں کردار خاموش ہوتے ہیں یا موجود ہوتے ہی نہیں وہاں بھی کہانی چلتی رہتی ہے اور یہ منظر نامے کے بل پر جاری رہتا ہے۔ منظر کو کردار بنا دینے کا یہ عمل کم ہی کہانیوں میں نظر آتا ہے اور یہ نورالحسنین کی فنکاری کا ایک مثبت پہلو ہے۔

کہانی کے بنیادی کرداروں کے علاوہ جو چھوٹے موٹے کردار ہیں وہ بھی اپنے آپ میں مکمل اور ضروری معلوم ہوتے ہیں کہ ان کے بغیر کہانی کا تانا بانا بنا ہی نہیں جا سکتا۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''آہنکار'' ایک ایسا ناول ہے جو ہماری آج کی زندگی سے جڑا ہوا ہے۔ جس میں زرعی اور مشینی عہد کا ٹکراؤ بھی ہے۔ انسانی رشتوں کی اُلجھنیں بھی ہیں اور اُنکی قوت کا احساس بھی۔ اس ناول کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مکانی اعتبار سے یہ ''گاؤں'' آج کے ہندوستان میں واقع ہے۔ جیتا جاگتا ہے۔ سانس لیتا ہے اور اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے۔

بقیہ : ''تلک الایام''

طرح کسی تحریک کو قائم کریں؟ ہم مختلف زبانوں میں لکھنے والے ایک پلیٹ فارم پر آجائیں۔ ایک آواز بن جائیں۔ یہ اتحاد ممکن ہے۔ اس تحریک کو ہم کوئی عنوان دیں جیسے 'عوامی ادبی تحریک' یا 'ادبی تحریک اتحاد' United Literary Movement یا کوئی عنوان۔۔ یہ اتحاد بہت کچھ کام کر سکتا ہے۔ آپ کی رائے کا انتظار ہے۔ 'یہ انتظار نہ 'حسین' کا انتظار ہے اور نہ ہی اکیلے 'نورالحسنین' کا انتظار۔۔ یہ انتظار پورے ملک کا انتظار ہے، اس عظیم الشان ملک کا ہر شہری ایسی کسی تحریک کا انتظار کر رہا ہے جو ملک کی فضاؤں میں دوبارہ محبت اور امن و آشتی کی خوشبوئیں گھول دے۔ ناول کے اختتام کی وضاحت کے لیے غنی کاشمیری کی یہ رباعی ہی کافی ہے۔ غنی کاشمیری کی رباعی ہے

جان رفت و نرفت دردِ جانکاہ ہنوز
دل نیست زِ خوابِ راحت آگاہ ہنوز
ما گرچہ رسیدیم بہ منزل امّا
آسایشِ منزل است در راہ ہنوز

(جان چلی گئی لیکن ہنوز دردِ جانکاہ نہیں گیا۔ دل ہنوز خوابِ راحت سے آگاہ نہیں ہے۔ ہم اگرچہ منزل پر پہنچ گئے ہیں لیکن آسائشِ منزل ہنوز راہ میں ہے۔)

چاند ہم سے باتیں کرتا ہے

نورالحسنین

میں عشق ہوں، میں اپنے خالق کا کرشمہ ہوں، جنون میرا مزاج، وفا اگر میری سلطنت ہے تو سرکشی اور بغاوت میری صفت، میں ازل سے ہوں، اور ابد تک باقی رہوں گا، میرا پہلا جلوہ کائنات کی تخلیق کا بہانہ ہے، اُس کی حمد وثنا میں غرق ملائکہ میری ہی ڈوری میں بندھے ہوئے ہیں، وہ آسمان سے زمین پر مجھے بھیجنا چاہتا تھا، اُسے نے مجھے آدم اور حوا کی آنکھوں میں روشن کیا، اور پھر اُن کے ساتھ ہی مجھے بھی زمین پر اُتار دیا۔۔۔تب سے آج تک میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا ہوں۔

صدیوں نے میرے پیروں سے اُٹھنے والی آواز سلاسل سنی ، مذاہب نے میرے خلاف اونچی اونچی دیواریں بلند کیں، مجھے مٹانے کے لیے کبھی لشکر میدانِ جنگ میں اُترے، کبھی مجھے آگ کے دریا کو پار کرنا پڑا، کبھی مجھ سے قربانیاں طلب کی گئیں، کبھی مجھے دیواروں میں زندہ چنوا دیا گیا لیکن میں نے کبھی شکست کو تسلیم نہیں کیا، بلکہ کبھی تختہ دار پر، کبھی شہنائیوں کی گونج میں، کبھی دن کے اُجالوں میں اور کبھی رات کے اندھیروں میں اپنی فتح کا اعلان کیا۔

میں عشق ہوں، میں جنون ہوں، میں بے اختیاروں، میں لازوال ہوں، میں ہر پابندی کے خلاف ہوں، میں ذات پات، جماعت، سے بہت بلند ہوں، میں ہر جگہ موجود ہوں، زمانہ میری گذرگاہ ہے، میں ہر عہد میں سانسیں لیتا ہوں، میرے بے شمار چہرے ہیں اور میرے ہر چہرے کا راز دار چاند ہے۔۔۔۔

اُس نے چاند کی طرف دیکھا،'' ائے چاند۔۔۔! کیا تو میرے ہر سفر کی گواہی دے سکتا ہے؟''

چاند نے آنکھیں کھولیں، اور زمین کی طرف دیکھنے لگا
وقت کا چاک اُلٹا گھومنے لگا
رات دن میں اور دن رات میں تبدیل ہونے لگے
فضائیں معطر ہونے لگیں
صدیاں ماضی کی طرف لوٹنے لگیں

اور آخر کن کی سہیادری کے کوہستان پر 500 قبل مسیح کی ایک صبح پر ٹھہر گئیں، بلند وبالا پہاڑوں، گھنے جنگلوں اور بہتی ندیوں کے اوپر روشنی پھیلنے لگی۔

وہ بنا آواز کیے مضبوطی سے اپنی برچھی کو تھامے آگے بڑھ رہا تھا۔ اُس کے سامنے گھنی جھاڑیاں تھیں پہاڑ کا ڈھلانی راستہ طئے کرنا ویسے بھی بہت مشکل ہوتا ہے۔ وہ نہایت احتیاط سے قدم اُٹھا رہا تھا۔ گھانس اور خودرو پودوں کی بہتات زہریلے کیڑوں سے چوکنا رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔ پتہ بھی کھڑکتا تو وہ وہیں پر رک جاتا اور آواز کی سمت اپنی برچھی کا رُخ کر دیتا لیکن جب سناٹا ہو جاتا تو وہ پھر آہستہ سے قدم اُٹھاتا۔ ایک بار اُس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ دور دور تک اُس کا کوئی ساتھی نہیں تھا۔ وہ شکار کی تلاش میں اپنے جھنڈ کے ساتھ نکلا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب جنگل میں ادھر اُدھر پھیل گئے تھے، کچھ دیر تک وہ ایک دوسرے کو اپنی عجیب وغریب آوازوں کے ذریعے مطلع کرتے رہے اور پھر اُن کی آوازیں بھی معدوم ہو گئیں لیکن اُسے کب پرواہ تھی۔ وہ اکیلا بھی بہت کچھ کر سکتا تھا، اُس کا اونچا پورا قد، چوڑا چکلا سینہ اور مضبوط قوتِ ارادی، اُسے کبھی کسی سہارے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، یہی سبب تھا کہ اُس کے دوست اور قبیلے والے اُسے آگاشم کے نام سے ہی پکارنے لگے تھے۔ وہ نہایت پھرتیلا تھا۔ شیر کی طرح اپنے شکار پر جھپٹ سکتا تھا اور موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے وہ کسی ہرنی کے مانند دوڑ بھی سکتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنے شکار سے بلّی کی طرح کھیلتا بھی تھا۔ یعنی شکار اُس کی گرفت میں پوری طرح ہونے کے باوجود وہ اُسے بھاگنے کا موقع دیتا اور وہ جیسے ہی بھاگنے کی کوشش کرتا وہ اُسے زیر کر لیتا اور پھر اُس سے انجان ہو جاتا۔ یہ کھیل وہ اُس وقت تک کھیلتا رہتا جب تک اُس کے تمام ساتھی اپنے شکار میں کامیاب نہیں ہو جاتے اور واپسی کے لیے آوازیں دینے نہیں لگ جاتے، تب وہ اپنے شکار پر پھر ایک بار پوری قوت سے ٹوٹ پڑتا اور اُسے ختم کر دیتا۔

اس بار وہ ایک جنگلی گائے کا پیچھا کرتے ہوئے وہ اپنے جھنڈ سے بچھڑ گیا تھا، شکار گھنی جھاڑیوں کا فائدہ اُٹھا کر کہیں اوجھل ہو گیا تھا اور وہ اُس کی تلاش میں کلسو بائی کی بلند وبالا چوٹیوں سے اُترتا ہوا دامن تک پہنچ گیا تھا۔ اُس نے نظریں سامنے کیں پرورانڈی پورے جوش کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ بیچ بیچ میں اُبھری ہوئی چٹانوں سے پانی ٹکراتا تو اُچھل اُچھل جاتا اور اُن میں سے سورج کی کرنیں گزرتیں تو پانی کے قطرے ہیرے موتیوں کی طرح چمکنے لگتے۔ اُس نے ندّی کی طرف دیکھتے ہوئے قدم بڑھایا ہی تھا کہ اُس کا پیر پھسل گیا اور وہ بہت نیچے تک گھسرتا ہوا چلا جا رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کسی تناور پیڑ سے ٹکرا کر اپنا چہرہ زخمی کر لیتا اُس نے پوری قوت کے ساتھ اپنی برچھی کو سامنے کر دیا اور اُس کے قدم زمین سے چپک گئے اور برچھی کا پھل درمیان میں آنے والے پیڑ میں پیوست ہو گیا۔ وہ اپنے آپ پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا گھنی جھاڑیوں کے بیچ سے اُس کی نظریں ایسی ہی باہر نکلیں جیسے سورج کی کرنیں، آسمان میں پرندے اُڑ رہے تھے اور سورج سر پر آ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا، اُس نے دیکھا وہ پہاڑی کے نیچے آ چکا ہے۔ اُس کے سامنے اب بھی گھنا جنگل تھا۔ وہ اُس میں داخل ہو گیا اور کسی نئے شکار کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا۔ اُس کے کانوں میں ندی کے پانی کا شور تھا۔ وہ کچھ قدم اور آگے بڑھا اور جونہی جھاڑیوں کے پتوں کو ہاتھ سے ہٹا کر سامنے دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا، اُس کی نظریں پلک مارنا بھول گئیں۔ پرورانڈی کے تٹ سے لگی ایک چھوٹی سی چٹان پر وہ مادر ذات ننگی بیٹھی کنارے کے اُس طرف دیکھ رہی تھی۔ دھوپ سے اُس کا بدن چمک رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی پانی سے باہر نکلی ہے۔ اُس

کی برہنہ پیٹھ اب تک گیلی تھی۔ اُس کے بال بھیگے ہوئے تھے اور اُن سے پانی کی باریک دھاریں اُس کے کمر پر رینگ رہی تھیں۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو انگڑائی کی شکل میں اوپر کیے اور بالوں کو بیچ دینے لگی تا کہ اُن میں کا پانی نکل جائے۔ ایسا کرنے میں اُسکے جسم کا زاویہ بدل گیا اور سینے کے اُبھار اگاشم کی نظروں کے سامنے آگئے اور اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کا دل اُچھل کر باہر آجائے گا۔ پورے بدن میں عجیب سی تھرتھری شروع ہوگئی۔ ہاتھوں کے لرزنے سے جھاڑی کی ٹہنیاں جھنجھنا اُٹھیں اور اُس لڑکی نے پلٹ کر پیچھے کی طرف دیکھا، دونوں کی نظریں ٹکرائیں اور ٹھیک اُسی وقت دور کوئی کوئل کوکی، جھاڑی پر بیٹھا ہوا کوئی پرندہ پھڑ پھڑا کر اُڑا اور پھر دوسرے ہی لمحے اُس لڑکی نے ندی میں چھلانگ لگادی۔ پانی بہت زور سے اوپر کی طرف اُچھلا لیکن لڑکی نظروں سے غائب ہوگئی۔ وہ بھی دوڑتا ہوا ندی کے قریب پہنچا اور پھر وہ بھی ندی میں کود گیا۔ اس بار بھی پانی اُتنی ہی شدت سے اُچھلا تھا لیکن وہ غائب نہیں ہوا بلکہ گردن اُٹھا کر لڑکی کو ادھر اُدھر تلاش کرنے لگا۔ ندی کا پاٹ بہت چوڑا تھا اور پانی کی رفتار بہت تیز تھی، اچانک لڑکی اُس کی نظروں میں آگئی، وہ ندی کے بیچوں بیچ پہنچ چکی تھی اُس نے بیچ دھارے سے اپنا سر باہر نکالا، پلٹ کر اُس کی طرف دیکھا، وہ اُس کی طرف ہی آرہا تھا۔ اُس نے پھر ایک بار غوطہ لگایا اور نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

اگاشم کی سمجھ میں آگیا تھا کہ لڑکی ندی کے دوسرے کنارے کی طرف پہنچنا چاہتی ہے۔ اُس نے بھی اُسی سمت میں غوطہ لگایا اور نہایت اطمینان سے پانی کو کاٹتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ ندی تیز دھاروں کے درمیان بہہ رہی تھی اوپر آسمان میں پرندے اُڑ رہے تھے۔ اور وہ تیرتے ہوئے سوچ رہا تھا، میرے جھنڈ میں بھی تو ایسی کئی لڑکیاں ہیں لیکن اُن کو دیکھنے کے بعد دوبارہ اُن کی طرف نظریں کیوں نہیں اُٹھتیں، آخر اس لڑکی کو دیکھنے کے بعد وہ اس قدر کیوں بے قابو ہوگیا؟ وہ بھی ندی کے بیچوں بیچ پہنچ گیا تھا اور اُس نے جیسے ہی کنارے کی طرف دیکھا لڑکی ندی سے باہر کیا نکلی گویا اُس کی آنکھوں میں بجلی سی کوند گئی۔ وہ پورے قد کے ساتھ کنارے کی چڑھائی چڑھ رہی تھی اور اُس کے بدن کے سارے ہی اسرار حُسنِ لاجواب کی کتاب کھول رہے تھے۔ وہ اب بہت تیز دوڑنے لگی تھی۔ اُس نے بھی جلدی جلدی ہاتھ پیر مارنا شروع کیا اور کچھ ہی وقفے میں کنارے پر نکل آیا اور جس طرف لڑکی بھاگی تھی وہ بھی اُسی رخ پر دوڑنے لگا۔

راستہ پُر خطر جھاڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ذرا سی بد احتیاطی نقصان پہنچا سکتی تھی لیکن وہ ان سارے خطرات سے بے نیاز لڑکی کے تعاقب میں دوڑا جا رہا تھا لیکن لڑکی ابھی تک بھی اُس کی نظروں سے اوجھل تھی، یہاں تک کہ پھر ایک بار پہاڑی سلسلہ اور گھنی جھاڑیوں کا سفر شروع ہوگیا اور اگاشم کے قدم بلندیوں کی طرف اُٹھنے لگے اور وہ اُسی انداز میں آگے بڑھ رہا تھا جیسے وہ اپنے کسی شکار کا تعاقب کرتا ہے۔ کچھ ہی دیر میں وہ ایک ٹیکری کے بالائی حصے پر پہنچ گیا اور اُس نے وہاں سے جیسے ہی دیکھا۔۔۔ اُس کی نظریں ساکت ہوگئیں، وہ برہنہ لڑکی اُسی طرح دوڑ رہی تھی اور بہت دور گھانس پھونس کی جھوپڑیاں دکھائی دے رہی تھیں، آگ روشن تھی، عورتیں شکار کیے ہوئے جانوروں کی کھالیں اُتار رہی تھیں اور بہت سارے مرد اور عورتیں اور بچے اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ وہ وہیں رُک گیا اور دوڑتی ہوئی لڑکی کو دیکھتا رہا۔ وہ کسی ہرنی کی مانند قلانچیں بھر رہی تھی۔ اُس کی ہر جست اُس کے دل پر ضرب لگا رہی تھی اور اُس کے دل کی دھڑکن کے ساتھ عجیب سا سہانا ردم بنا رہی تھی۔

لڑکی کچھ ہی دیر میں اپنے قبیلے میں پہنچ گئی۔ اسے اس طرح حواس باختہ دیکھ کر سب ہی نے اُسے گھیر لیا تھا اور پھر عورتوں کے منہ میں ہاتھ کی پہلی اُنگلی پہنچی اور دونوں ہونٹوں کے درمیان تیز تیز گردش کرنے لگی اور اُن کے حلقوں سے احتجاجی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اُنکے مردوں کے چہروں کے تاثرات بدلنے لگے اور پھر وہ بھی عجیب وغریب آوازیں نکالنے لگے، گویا غصے سے شیر غرا رہے ہوں، کچھ ہی لمحوں میں اُن کی گرفت نیزوں اور لاٹھیوں پر مضبوط ہوگئی۔ اُنھوں نے ہتھیاروں کو ہوا میں بلند کیا اور اُن کی بھیانک چیخوں سے سارا ماحول گونج اُٹھا۔ سردار نے دیکھا اُن میں بزدل من چنا بھی شامل تھا اور پھر وہ سب اُس کی تلاش میں نکل پڑے۔

اگاشم نے جو یہ منظر دیکھا تو گھبرا گیا اور فوراً جس راستے سے وہ یہاں تک پہنچا تھا واپس دوڑنے لگا۔ غصے سے بپھرے ہوئے وہ لوگ اُسے شکاری کتوں کی طرح ڈھونڈھ رہے تھے۔ سارا جنگل اُن کی آوازوں سے دہل رہا تھا اور وہ کلسو بائی کی بلند چوٹیوں کو بندروں کی مانند سر کرتا ہوا تیز بہت تیز اپنے جھنڈ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں اب بھی وہی لڑکی تھی۔ اُس کا بھیگا بدن، بالوں سے اُترتا ہوا پانی، اُس کے اوپر اُٹھتے ہوئے ہاتھ، بدلتا ہوا اُس کے بدن کا زاویہ اور وہ آنکھیں جو اُس کی آنکھوں سے ٹکرائی تھیں۔ اُس کے بدن میں پھر ایک بار لاوہ دہکنے لگا۔ دل نے سرگوشی کی واپس چلتے ہیں تو خوف نے چپکے سے کہا فی الحال جان بچ جائے تو یہی بہت ہے۔ اُس کے بدن نے واپسی پر زور دیا لیکن اُس کے پاؤں آگے اور آگے ہی بڑھتے رہے اور وہ بڑی سرعت کے ساتھ فاصلے طئے کرتا چلا گیا، اُس کے تعاقب میں بلند ہونے والی آوازیں معدوم ہوتی چلی گئیں، یہاں تک کہ وہ بھی اپنے قبیلے میں پہنچ گیا۔

اُسے اس طرح خالی ہاتھ دیکھ کر کئی آنکھیں اُسے حیرت سے دیکھنے لگیں، کیونکہ وہ قبیلے کا ایک ایسا تیز وطرار نوجوان تھا جس نے کبھی خالی ہاتھ واپس آنا سیکھا ہی نہیں تھا، وہ تنہا کسی بھی جنگلی جانور کا مقابلہ کرسکتا تھا اور کرسکتا تھا کیا، کئی دفعہ اکیلے ہی اُس نے شیر کا شکار کیا تھا، اس لیے قبیلے پر اُس کی بہادری دھاک تھی اور قبیلے کی کئی لڑکیاں اُس پر جان چھڑکتی تھیں لیکن وہ اُنھیں منہ نہ لگاتا، لیکن آج وہ خالی ہاتھ ہی واپس آیا تھا، اُس نے کسی سے آنکھیں چار نہیں کیں اور چپ چاپ اپنے کٹیا کی طرف بڑھ گیا۔

رات کے سناٹوں کو کیڑے مکوڑوں کی مدھر اگنیاں رومانی بنا رہی تھیں۔ سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ پورا قبیلہ نیند کی آغوش میں ڈوبا ہوا تھا لیکن وہ جاگ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں اُس کا چہرا در آیا۔ وہ کون ہوگا؟ اُس کی آنکھوں میں جانے ایسا کیا تھا جو اس کے پورے بدن میں اُتر گیا تھا۔ وہ مجھے کیسی

''چہارسُو''

عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا، شاید آج تک کسی نے اس طرح اُسے دیکھا ہی نہیں تھا، لیکن وہ بھاگی کیوں؟ اُسے پچھتاوا سا ہونے لگا۔ جانے وہ اُس کے بارے میں کیا سوچتا ہوگا، کیا وہ بھی اس وقت جاگ رہا ہوگا؟ اُس نے اپنے اطراف سونے والوں پر طائرانہ نظریں ڈالی اور پھر چپکے سے اُٹھ بیٹھی۔ پالتو جانور جگالی میں مصروف تھے۔ کتے پائینتی بیٹھے رکھوالی کر رہے تھے۔ اُس نے ادھر اُدھر دیکھا اور پھر وہاں سے چپکے سے باہر نکل گئی۔ سامنے نیم کے گھنے درخت تھے، آسمان میں پورا چاند روشن تھا، اُن کی ٹہنیوں میں سے چھن چھن کر چاندنی نیچے پہنچ رہی تھی۔ وہ خاموشی سے ایک درخت کے نیچے پتھر پر بیٹھ گئی اور زمین پر اُنگلی سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے لگیں۔ اچانک کتوں نے بھونکنا شروع کیا اور اُس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا، پورے ماحول پر چاندنی کا راج تھا، اور دور وہ ٹیکری نظر آ رہی تھی جہاں اُس نے اُسے آخری مرتبہ دیکھا تھا۔ وہ وہیں کھڑا رہ گیا تھا کیا وہ اب بھی وہیں ہوگا؟ اُس نے ایک بار پھر اُسی ٹیکری کی جانب دیکھا، دو آنکھیں دور سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے فوراً نگاہیں وہاں سے ہٹالیں اور زمین کو گھورنے لگیں، زمین پر بھی وہی آنکھیں تھیں۔ اُس نے پیڑ کے تنے کو دیکھا، وہاں بھی اُسے وہی دکھائی دیں، اُس نے آسمان کی طرف دیکھا تو وہ چاند میں بیٹھا اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اُس نے آنکھیں بند کرلیں تو بند آنکھوں میں پورا منظر بھر گیا، وہ برہنہ چٹان پر بیٹھی ہوئی ہے اور جھاڑیوں کی اوٹ سے جھانکتا ہوا اُس کا چہرا۔ اُس نے آنکھیں اُسی طرح بند رکھیں اور اُس کی آنکھوں میں جھانکتی رہی۔

محبت خواہ خوف کے راستے داخل ہو یا نفرت کے دروازوں سے لیکن جب داخل ہوجاتی ہے تو پھر سارے خوف بے اثر ہوجاتے ہیں اور ساری نفرتیں منہ دیکھتے رہ جاتی ہیں اور اس وادی کا مسافر ایک ایسی منزل کا راہی ہوجاتا ہے جہاں بصیرت ،بصارت، عقل وہوش بے معنی ہوجاتے ہیں اور وہ سب سے بے نیاز ہوجاتا ہے۔

سورج اپنی کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ قبیلے کے تمام مرد شکار کے لیے آراستہ ہو رہے تھے۔ کوئی اپنے نیزوں کے پھلوں کو تیز کر رہا تھا، کوئی اپنے تیر کمان درست کر رہا تھا، کوئی جال درست کر رہا تھا، عورتیں اپنے کام کاج میں مصروف تھیں لیکن اگاشم اب بھی اپنی کٹیا میں آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا اور اُس کی آنکھوں میں وہی لڑکی تھی، وہ اُسے کبھی پلٹ کر دیکھتی، اور کبھی بے تحاشہ بھاگتی ہوئی اُس کی نظروں سے دور ہوجاتی۔ وہ اُسی کے تصور میں ڈوبا ہوا تھا کہ سردار کی آواز اُس کے کانوں میں پہنچی جو چلنے کا حکم دے رہا تھا وہ باہر آیا، اُس کی آنکھیں چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ رات تمام سویا نہیں تھا۔ اُس نے اپنا نیزہ اُٹھایا گلے میں جالا ڈالا اور اُن کے پیچھے پیچھے قدم اُٹھانے لگا۔ آسمان میں سورج جگمگا رہا تھا اور چیلیں منڈلا رہی تھیں، وہ سب تیز تیز قدم اُٹھا رہے تھے، اُن کے ہونٹوں پر گیت مچل رہے تھے اور اُن کی آنکھوں کے سامنے گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا، کچھ ہی دیر کی مسافت کے بعد وہ سب پہاڑی کے دامن میں پھیلے ہوئے جنگل میں داخل ہوگئے۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے جنگل اور بھی گھنا ہوتا جا رہا تھا یہاں تک کہ سورج کی کرنیں بھی پوری طرح نیچے تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ اُنھوں نے شکار کو گھیرنے کے لیے حلقہ بنانا شروع کیا اور دبکے ہوئے جانوروں کو باہر نکالنے کے لیے شور مچانا شروع کیا۔ اُن کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ شکار اتنی جلدی اُن کے سامنے ہوگا، ابھی وہ چلے میں تیر لگا ہی رہے تھے کہ جھاڑیوں میں سے کچھ ہرنوں نے جست لگانا شروع کیا۔ اگاشم نے فوراً جالے کو گلے میں سے باہر نکالا لیکن تب تک وہ اُس کی دسترس سے نکل چکے تھے۔ سردار کی غصے سے بھری آواز گونجی اور اُس نے اُس کے ہاتھوں میں سے جالے کو چھین لیا اور اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ اُس کی گردن جھک گئی، یہ اُس کی زندگی کا بھی پہلا موقع تھا جب شکار اُس کے ہاتھوں سے اس طرح نکل گیا تھا، وہ وہیں کھڑا رہ گیا اور وہ سب اگلے شکار کی تلاش میں آگے بڑھ گئے۔ اُسے عجیب سا پچھتاوا ہو رہا تھا۔ شرمندگی کے مارے اُس کی آنکھیں بند ہوگئیں لیکن آنکھوں کا بند ہونا تھا کہ وہ در آئی اور اُس کی آنکھیں اُسے ایسے دیکھ رہی تھیں گویا سوال کر رہی ہوں، کیا آج نہیں آؤ گے؟ اُس نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا، اُس کی نظریں گھنی جھاڑیوں سے باہر نکلیں اُس کے سامنے کلسو بائی کی بلند چوٹی تھی جو پھر ایک بار اُسی نظارے کی دعوت دے رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر مسرت دوڑ گئی اور اُس نے اپنی راہ بدل دی اور تقریباً دوڑتا ہوا پروراندی کی اور نکل گیا۔

گھنی جھاڑیوں اور خودرو گھانس کو روندتا ہوا آخر وہ اُس مقام پر پہنچ گیا۔ بس اب کچھ ٹہنیوں کو سامنے سے ہٹانا تھا لیکن یہ کیا اُس کے بدن میں پھر ایک بار وہی کپکپاہٹ ہونے لگی اور اُس کے ہاتھ شل ہوگئے۔ نظارے کے لیے بس دو قدم ہی تو چلنا تھا، پتہ نہیں کیوں اُس کے پیر اس قدر وزنی ہوگئے تھے۔ اُس کے کانوں میں ندی کے بہتے پانی کا شور تھا۔ وہ بہت دیر تک وہیں ٹھٹھکا کھڑا رہا یہاں تک کہ اُس کے پیروں میں چونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اُسے عجیب سی بے چینی ہونے لگی۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ ہاں اور نہیں کے وسوسوں میں گھر گیا تھا لیکن ٹھیک اُسی وقت اُس کے ہاتھوں میں جنبش ہوئی اور اُنھوں نے سامنے سے ٹہنیوں کو ہٹادیا، وہاں کوئی نہیں تھا بس ندی پورے جوش وخروش کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ وہ جھاڑیوں کے پیچھے سے نکل آیا اور اُداس نظروں سے ندی کو گھورنے لگا۔ ندی کا پانی چٹانوں سے ٹکرا کر اُچھل رہا تھا اور پانی کے قطرے انگاروں میں تبدیل ہو رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ اُس چٹان کے قریب آیا جس پر وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے ایک نگاہ اُس پر ڈالی، اپنے ہاتھوں سے اُسے چھو کر دیکھا اور پھر چپکے سے اپنا ستر کھول کر اُس چٹان پر بیٹھ گیا اور اُس کی نظریں ندی کے دوسرے کنارے کی جانب اُٹھ گئیں۔

☆

قبیلے کی عورتیں صاف صفائی میں مصروف تھیں۔ بچے کتوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ دھول اور گرد اُڑ رہی تھی۔ رفتہ رفتہ دھوپ میں حدت بڑھ رہی تھی۔ وہ کٹیا سے باہر نکلی کچھ قدم آگے بڑھی اور پھر لوٹ آئی، ماں نے اُس کی طرف دیکھا اور آنکھوں سے سوال کیا، موگا کیا ندی پر جانا چاہتی ہو؟ لیکن اُس نے انکار میں گردن ہلادی اور انگوٹھے سے زمین کو کُریدنے لگی، اُس کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ تیزی سے اپنی کٹیا میں داخل ہوگئی، اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ

زور زور سے خوب روئے، لیکن وہ رو بھی نہ سکی، کچھ دیر تک وہ اپنے آپ کو اِدھر اُدھر بہلاتی رہی اور پھر ایک بار کٹیا سے باہر نکلی اور کام کاج میں ماں کا ہاتھ بٹانے لگی۔

☆

اگاشم بہت دیر تک ندی کے کنارے اُسی طرح بیٹھا رہا، پھر اُس نے کچھ سوچا اور ندی میں چھلانگ لگا دی، بہت دیر تک یونہی تیرتا رہا، وہ جب بھی ڈبکی لگا کر اوپر نکلتا تو ادھر اُدھر دیکھتا کہ شاید وہ آ گئی ہوگی لیکن اُسے ہر بار نا کامی ہوتی اور وہ پھر ایک بار پانی میں ڈبکی لگا دیتا۔ آخر مایوس ہو کر اُس نے دوسرے کنارے پر جانے کا فیصلہ کیا اور تیز تیز ہاتھ پیر چلاتا ہوا دوسرے کنارے تک پہنچ گیا، اُس کی نظریں یہاں بھی لڑکی کو تلاش کر رہی تھیں لیکن اُسے نہیں آنا تھا، اور وہ نہیں آئی۔ وہ ندی سے باہر نکلا اور لڑکی کے قبیلے کی جانب قدم اُٹھانے لگا، اُس کی چال بہت دھیمی تھی۔ اُس کے ذہن نے سوال کیا، کیا تم نہیں جانتے کہ غیر قبیلے کی لڑکیوں کی طرف دیکھنا بھی پاپ ہے؟ اور جو ایسا کرے گا اُس کا نصیب صرف مرتیو ڈنڈ ہی ہے۔ یہی نیم تو سارے قبیلوں نے طئے کر رکھا ہے۔ کیوں اپنے جیون کو داؤ پر لگا رہے ہو؟ لوٹ جاؤ، لیکن اُس کے قدم رُکے نہیں اور اُس نے ٹیکری پر چڑھائی شروع کر دی۔

☆

دن ڈھل رہا تھا، اُس کے جھنڈ کے سارے ہی ساتھی آج بہت خوش تھے کیونکہ آج وہ اپنے ساتھ بہت کچھ لے کر جا رہے تھے۔ اُنھوں نے کئی ہرنوں کا شکار کیا تھا، شہد کی کئی پولیاں اُن کے ہاتھ لگی تھیں۔ ندی کے کنارے قدرتی کیلی کا بندھا اور بہت ساری پکی ہوئی پھلیاں اُنھیں مل گئیں تھی۔ وہ خوشی خوشی اپنے قبیلے کی طرف لوٹ رہے تھے، خوشی سے چلا رہے تھے۔

☆

موگا بھی دن تمام اُداس رہی، اُس کا دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بس کبھی کٹیا میں جاتی اور کبھی نیم کے پیڑوں کے نیچے ٹہلتی رہی۔ وہ جہاں بھی جاتی اُسے یہی محسوس ہوتا کہ دو آنکھیں اُسے نہار رہی ہیں۔ کبھی وہ بے تاب ہو جاتی اور اُس کا دل کہتا سب کو چھوڑ کر بس اُس کے پاس چلی جائے لیکن اُس کے قدم اُس کا ساتھ نہیں دیتے اور وہ یونہی ادھر سے اُدھر گھومتی رہتی۔ اُس کی ماں اُس کا خاموش جائزہ لیتی رہی لیکن اُس نے اُس سے کچھ پوچھا نہیں۔ شاید وہ سوچتی تھی کہ کل کے حادثے نے اُسے ڈرا دیا ہو؟ کبھی وہ یہ بھی سوچتی کہ من چنا نے اُسے بالکل صحیح مشورہ دیا ہے، کیوں نہ اُسے موئی بابا کو دکھایا جائے؟ وہ جادوئی ہڈی اُس پر گھما کر اُسے ٹھیک کر دیں گے، لیکن یہ لڑکی چلے تب نا؟ اُس نے ایک بار پھر اپنی لڑکی کی طرف دیکھا جو اس وقت کٹیا کے پیچھے جا رہی تھی۔ اُس نے اُسے آواز دی، لڑکی پلٹی لیکن اُس کی نگاہ ماں کے سر پر سے ہوتی ہوئی اُس ٹیکری پر چلی گئی، جہاں اگاشم کھڑا ہوا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی اُس کی عجیب حالت ہوگئی۔ اُس کا مرجھایا ہوا چہرہ ایک دم کھل اُٹھا اور وہ دوڑتے ہوئے ماں کے پاس پہنچی اور اُس سے لپٹ گئی۔ اُس کا چہرہ اب بھی ٹیکری کی طرف ہی تھا۔ اُس نے پوری قوت کے ساتھ ماں کو بھینچ لیا۔ ممتا اُس کی پیٹھ سہلانے لگی اور وہ بنا پلک جھپکائے ٹیکری کی جانب دیکھتی رہی۔

☆

آگ روشن تھی اور اُس پر ہرنوں کا گوشت بھنا جا رہا تھا۔ جگہ جگہ مشعلیں روشن تھیں۔ جب بھی سال چھ مہینے میں بھرپور شکار ہاتھ آ جاتا جشن منایا جاتا۔ آج بھی عمدہ شکار کی دستیابی پر جشن منایا جا رہا تھا۔ عورتیں اور مرد حلقہ بنا کر تھرک رہے تھے۔ گیت اُن کے ہونٹوں پر مچل رہے تھے۔ سانولے نیم عریاں بدن ایک دوسرے کو دعوتِ عیش دے رہے تھے۔ کنواری لڑکیاں اپنے من پسند لڑکوں کو چھیڑ رہی تھیں۔ قہقہے گونج رہے تھے۔ جانوروں کی جھلی سے منڈھے ہوئے تاشوں پر ہاتھ پڑ رہے تھے، دھن دھن دھنا کی پُرشور آوازوں میں اُن کے بدن تھرکنے لگے۔ اُن کا رقص بھی عجیب تھا، وہ سب ایک ساتھ ایک دوسرے کے ہاتھوں پر ہاتھ مارتے اور پھر فوراً اُچک کر اپنے دونوں ہاتھ اپنی اپنی کمروں پر مارتے اور ایک ایک قدم آگے پیچھے ہوتے لیکن اس بات کا خیال رکھتے کہ حلقہ ٹوٹنے نہ پائے۔ بہت دیر تک یہی رقص جاری رہا، تاشے بجتے رہے، پھر مرد پیچھے ہٹ گئے اور خالص عورتوں کا رقص شروع ہو گیا۔ تاشوں کا ردم بھی بدل گیا لیکن حلقہ اُسی طرح قائم رہا، عورتوں نے اپنے بال کھولنا شروع کیا اور اُن کی گردنیں جھٹکوں کے ساتھ ادھر اُدھر ہونے لگی، کمر ٹھمکیں لگانے لگی ہاتھ آگے پیچھے تالیاں بجانے لگے۔ مردوں نے آگ پر لٹکے ہوئے گوشت کے لوتھڑوں کو نیچے اوپر کرنا شروع کیا۔ عورتوں کے رقص میں تیزی آنے لگی اور مردوں اور نوجوانوں نے مدرا کے گھونٹ چڑھانا شروع کیا۔ رقص و سرور دو آتشہ ہونے لگا۔ عورتیں رقص بھی کر رہی تھیں اور اپنے اپنے شوہروں کو ہیجان انگیز اشارے بھی کر رہی تھیں۔ مرد اُن کے ہر عمل کا لطف اُٹھا رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے اور ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ بھی مار رہے تھے۔ رقص اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ عورتوں کے اوپری بدن تو پہلے ہی سے عریاں تھے، جوش اور مستی میں اُنھوں نے اپنے ستر بھی کھولنا شروع کر دیا۔ مردوں نے منہ میں اپنے ہاتھ کی پہلی اُنگلی ڈالی اور اور خوشی کے مارے عجیب سی آوازیں نکالیں اور عورتوں کے پیچھے اپنا حلقہ بنا لیا اور زور زور سے اپنا سیدھا پیر زمین پر پٹکنے لگے۔ یہ رقص اُس وقت تک جاری رہا جب تک کہ کنواریاں بھی اپنا برمنتخب کر لیں اور اپنے محبوب کے گلے میں اپنی بانہوں کا ہار ڈال دیں۔ جیسے ہی لڑکیوں کا یہ عمل پورا ہوا، سارے قبیلہ نے خوشی سے نعرے لگانا شروع کر دیا اور تاشے زور زور سے بجنے لگے۔ اُن کے رقص میں بھی شدت آ گئی اور اُنھوں نے پھر ایک بار اپنے منہ میں اُنگلی ڈال کر خوشی سے عجیب عجیب آوازیں نکالنا شروع کی اور نئے جوڑوں کو بھی اپنے حلقے میں لے لیا اور خوشی میں تھرکنے لگے۔ دھن دھن دھنا دھنا کی آوازیں شدت اختیار کر گئیں، کچھ دیر تک یہی ماحول رہا اور پھر ہر مرد نے اپنی اپنی بیوی کو گود میں اُٹھایا اور اُسے اپنی اپنی کٹیا میں لے کر چلا گیا اور مستی میں ڈوبی ہوئی اُن کی آوازیں اُبھرنے لگیں۔ آگ کے شعلے بھڑکنے لگے اور

''چہارسُو''

پھر آہستہ آہستہ آگ ٹھنڈی ہونے لگی۔

رات کافی ہو چکی تھی، سرد ہواؤں کے جھکڑ شروع ہو گئے تھے، جنگلی جانوروں کے پکارنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ اگاشم اپنی جگہ سے اُٹھا، آسمان کی طرف دیکھا، چاند روشن تھا۔ وہ نہایت احتیاط کے ساتھ ٹیکری سے نیچے اُترنے لگا، وہ اُسے نہیں ملی تھی لیکن اُس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ اُسے پورہ یقین تھا کہ وہ اُسے ضرور ملے گی۔ وہ جیسے ہی گھنے جنگل میں داخل ہوا بندروں نے شور مچانا شروع کر دیا، اُس نے بھی جواب میں شیر کی آواز نکالی اور بندر شور مچاتے ہوئے پیچھے کی جانب درختوں پر پھلانگنے لگے۔ وہ چاندنی میں اپنا راستہ طئے کرتا رہا یہاں تک کہ ندی کے پاس پہنچ گیا اور ایک درخت کی آڑ سے ندی کا جائزہ لینے لگا کہ کہیں کوئی جنگلی جانور پانی تو نہیں پی رہا ہے۔ جب اُسے اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ کہیں کوئی نہیں ہے تو وہ آہستہ سے ندی میں اُتر گیا اور تیرتا ہوا دوسرے کنارے تک پہنچ گیا۔ چٹان پر اُس کا نیزہ اُسی طرح پڑا ہوا تھا اُس نے اُسے اُٹھالیا اور پھر ایک بار جنگل میں داخل ہو گیا۔ نیزے کے ہاتھ میں آتے ہی اُس کے ذہن سے سارے خوف ہٹ گئے اب وہ ہر جانور کا مقابلہ کر سکتا تھا اور اپنی بستی میں پہنچ سکتا تھا۔ وہ جلدی جلدی قدم اُٹھانے لگا اگرچہ جنگلی جانوروں کی بھیانک آوازیں اب بھی اُسے سنائی دے رہی تھیں۔

وہ جس وقت اپنے قبیلے میں پہنچا، سناٹا ہو چکا تھا۔ انگاروں پر راکھ کے غلاف چڑھ گئے تھے۔ پورا قبیلہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ کتّے بھینکی ہوئی ہڈیاں چبا رہے تھے، اُن کی غرّش کی آوازیں اُٹھ رہی تھیں۔ قدموں کی چاپ سن کر اُنھوں نے گردن اُٹھا اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئے اور وہ بھی چپ چاپ اپنی کٹیا میں داخل ہو گیا۔

☆

کئی روز تک یہی سلسلہ جاری رہا اور اُن دونوں کی ملاقات نہیں ہو سکی، یا تو وہ وقت پر پہنچا نہیں یا پھر وہ نہیں آئی لیکن دونوں کے مزاج میں وہی بے چینیاں قائم تھیں۔

☆

آج بھی سارا قبیلہ معمول کے مطابق سو رہا تھا، کتے پائینتی بیٹھے پہرا دے رہے تھے، پالتو مویشی حسب معمول جگالی میں مست تھے۔ موگّا اپنی ماں کے پاس لیٹی سونے کا بہانہ کر رہی تھی۔ ماں نے کروٹ بدلی اور اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ اُس نے لیٹے لیٹے ٹیکری کی طرف دیکھا، چاندنی اُس پر برس رہی تھی۔ اچانک اُس کی آنکھوں میں اُس کا چہرہ گھوم گیا۔ کیا وہ آج کی رات بھی وہیں بیٹھا اس طرف دیکھ رہا ہوگا۔ اُسے اُس پر بے حد رحم آیا اور اُس کے دل نے سرگوشی کی اُسے اُس کے پاس جانا چاہیے۔ وہ سچا ہے۔ کئی دن اور راتوں سے اُس کے لیے تڑپ رہا ہے۔ اُس نے ایک بار پھر سب کی جانب دیکھا لیکن سب بہت ہی گہری نیند سو رہے تھے۔ وہ چپکے سے اُٹھی اور پھر نہایت احتیاط کے ساتھ آہستہ آہستہ ٹیکری کی طرف قدم اُٹھانے لگی، کچھ دیر تک وہ اسی طرح چلتی رہی اور پھر اس کے بعد سرپٹ دوڑنے لگی۔

ٹیکری کے قریب پہنچ کر موگّا نے اپنی سانسیں درست کیں اور پھر چڑھائی شروع کی، جیسے جیسے وہ قدم اُٹھاتی کبھی وسوسے اُس سے سوال کرتے، اگر وہ وہاں نہیں آیا ہوگا تو؟ لیکن اُس کا دل اُسے دلاسے دیتا وہ ضرور آیا ہوگا۔ وہ تو وہیں ہوگا اور کیا پتہ اب تک اُس نے اُسے دیکھ بھی لیا ہوگا؟ وہ ٹیکری کے بالائی حصّے پر پہنچ گئی اور جلدی جلدی قدم اُٹھانے لگی۔ ٹیکری پر موجود اونچے اونچے گھنے درختوں کی وجہ سے چاندنی بھی چھن چھن کر آ رہی تھی اور وہ اپنے خیالوں میں مگن تھی کہ اچانک اُسے خدشہ ہوا، اور اُس نے پلٹ کر اپنے قبیلے کی طرف دیکھا لیکن وہاں کوئی ہلچل نظر نہیں آئی۔ اُس نے اطمینان کا سانس لیا اور ٹیکری کے ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اُس کچھ بھی نظر نہیں آیا، البتہ کسی جنگلی جانور کی موجودگی کا ضرور احساس ہوا، وہ فوراً چوکنا ہو گئی۔ اُس کا قیاس قطعی غلط نہیں تھا۔ اُس سے کچھ قدم کے فاصلے پر ایک ریچھ اپنے پچھلے پیروں پر کھڑا اُس پر حملے کی تیاری میں تھا۔ اُس نے فوراً درختوں کے درمیان دوڑنا شروع کر دیا۔ ریچھ بھی بھیانک آوازوں کے ساتھ اُس کا تعاقب کرنے لگا۔ وہ ایک درخت سے دوسرے درخت کے درمیان گھوم جاتی۔ ریچھ کے لیے فوراً پلٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اتنی دیر میں اُس سے کافی دور ہو جاتی اور وہ غصے سے چیخنے لگتا۔ موت اور زندگی کے درمیان دوڑ لگی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی وہ اُس کے اتنے قریب آ جاتا تھا کہ بس وہ اُسے دبوچ لے گا لیکن وہ پھرتی سے کسی پیڑ کی جانب پلٹ جاتی اور اور ریچھ کی دسترس سے بچ نکلتی۔ وہ اُسے جھکائیاں بھی دے رہی تھی اور ساتھ ہی کسی ایسے پیڑ کی تلاش میں تھی جس کا تنا اتنا موٹا ہو کہ وہ ریچھ کے اگلے پیروں میں نہ سما سکے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ریچھ اُن ہی درختوں پر چڑھ سکتے ہیں جن کا تنا اُن کے اگلے پیروں میں پوری طرح آ جاتا ہے۔ مسلسل دوڑنے اور خوف کے باعث وہ پسینے میں شرابور ہو چکی تھی۔

موگّا نے ریچھ کو پھر ایک بار لمبی جھکائی دی اور تیز دوڑتے ہوئے اُس سے بہت دور ہو گئی اور اس درمیان اُسے وہ پیڑ بھی نظر آ گیا جو اس کی پناہ گاہ بن سکتا تھا۔ وہ پھرتی سے اس پر چڑھ گئی اور ایک موٹی سی شاخ پر بیٹھ گئی لیکن خوف اب بھی اُس پر اُسی طرح طاری تھا۔ کچھ ہی لمحوں میں ریچھ بھی وہاں پر پہنچ گیا اور اُسے دیکھ دیکھ کر غصے سے چیخنے لگا۔ اُس کی چیخوں سے جنگل دہل رہا تھا اور ایک عجیب سی وحشت چھا گئی تھی۔ اُس نے اب پیڑ کے اطراف گھومنا شروع کر دیا تھا۔

رات کا وقت، پہاڑی، جنگل اور ریچھ۔۔۔ اوپر سے اکیلا پن، خوف لڑکی کے روم روم سے عیاں ہو رہا تھا۔ وہ دم سادھے بیٹھی تھی۔ دل ہی دل میں پچھتا رہی تھی کہ اُس نے یہ قدم کیوں اُٹھایا۔ اُس کی آنکھوں میں اُس کی ماں کا چہرہ گھوم گیا اور اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسوں گرنے لگے۔

ٹھیک اُسی وقت سوکھے پتوں کو روندتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ لڑکی اور ریچھ نے ایک ساتھ آواز کی طرف دیکھا، کوئی نظر نہیں آیا، البتہ یہ احساس قوی ہو رہا تھا کہ کوئی آ رہا ہے۔ ریچھ نے گردن اوپر کی اور لڑکی کو دیکھتے ہوئے اتنی زور سے اُچھلا کہ اُس کے منہ کا جھاگ اُڑ کر لڑکی کے پیروں تک پہنچ

گیا، ایک لمحے کے لیے وہ گھبرائی ضرور اور اپنے لٹکتے پیروں کو اُس نے فوراً اوپر کھینچ لیا، لیکن اُس کی نظریں اب بھی اُسی آنے والے پر لگی ہوئی تھیں۔ ریچھ بھی چوکنا ہوگیا تھا اور دبی دبی عصیلی آوازوں کے ساتھ اُسی رخ پر دیکھ رہا تھا۔

قدموں کی چاپ لحہ لحہ قریب ہوتی جارہی تھی اور ریچھ کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ موگّا کا گمان یقین میں بدل رہا تھا کہ آنے والا اُس کا محبوب ہی ہوگا، چنانچہ وہ ٹہنی پر کھڑی ہوگئی تاکہ اُسے یہاں آنے سے روک سکے لیکن وہ ابھی تک نظروں میں نہیں آیا تھا۔ غالباً ریچھ بھی اپنے خطرے کو بھانپ گیا تھا اس لیے اب اُس نے موگّا پر سے اپنی توجہ ہٹا دی تھی اور آنے والے پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

اگاشم ٹیکری پر نمودار ہوا۔ اُس کے ہاتھوں میں اُس کا نیزہ تھا۔ اُسے دیکھتے ہی موگّا نے شور مچانا شروع کر دیا کہ وہ اِدھر نہ آئے، یہاں خطرناک ریچھ موت بن کر کھڑا ہے لیکن وہ رُکا نہیں، اُس نے اپنے نیزے کا رخ سامنے کر دیا اور نپے تلے قدم اُٹھانے لگا۔ ریچھ نے اُسے دیکھتے ہی پہلے تو زور سے اُسے للکارہ اور پھر نہایت تیزی سے اُس پر جست لگائی۔ اگاشم کے نیزے نے اُس کے سینے کے سفید بالوں کے قریب وار کیا اور اس کے رخ کو دوسری جانب موڑ دیا اور پھر، پھرتی سے ریچھ کی طرف پلٹا، ریچھ کے منہ سے جھاگ اُبل رہا تھا، وہ اس بار اس طرح حملہ آور ہوا کہ اگاشم کا نیزہ اُسے کوئی نقصان نہ پہنچا سکا اور وہ دونوں زمین پر آرہے اور خوف کے مارے موگّا کی چیخ بلند ہوگئی۔ دونوں طاقت آزما رہے تھے۔ اگاشم کا سینہ ریچھ کے پنجوں کے باعث زخمی ہوگیا تھا اور اُس سے خون رس رہا تھا۔ دونوں گتھم گتھا تھے۔ ریچھ کو جب بھی موقع ملتا وہ اُسے اپنے پنجے سے زخمی کر دیتا لیکن اگاشم اُس کے جبڑے کو اپنے قریب نہیں آنے دیتا تھا۔ آخر بڑی مشکل سے وہ اُسے اپنے سے پرے ڈھکیلنے میں کامیاب ہوگیا اور جلدی سے اپنے نیزے پر گرفت مضبوط کر لی اور چند قدم پیچھے سرکنے میں کامیاب ہوگیا۔ ریچھ ایک بار پھر پوری قوت کے ساتھ جیسے ہی اگاشم کی جانب اُچھلا، اگاشم نے پوری طاقت کے ساتھ اپنا نیزہ اُس کے منہ میں گھسا دیا۔ نیزہ حلق کو چیرتا ہوا پیٹ کے اندر تک اُتر گیا اور ایک بھیانک آواز کے ساتھ ریچھ زمین پر ڈھیر ہوگیا اور اُسی وقت موگّا نے پیڑ سے نیچے چھلانگ لگائی اور دوڑتے ہوئے آکر اُس سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ نہایت محبت سے اُس کی پیٹھ سہلا رہا تھا۔ موگا نے اپنا چہرا اوپر اُٹھایا، اور اُس کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر ایک بار رونے لگی۔ دونوں بہت دیر تک اسی کیفیت میں ڈوبے رہے۔ اچانک اگاشم کو احساس ہوا کہ اُس کی بانہوں کے ہار اُس کے گلے میں ہیں۔ اُس نے خوشی سے اُسے پوری قوت کے ساتھ بھینچ لیا۔ موگّا نے اُس کی آنکھوں میں حیرت سے جھانکا تو اُس نے اُسے اُس کی بانہوں کا احساس دلایا۔ وہ شرما کر اور بھی اُس سے لپٹ گئی اور پھر دوسرے ہی لمحے اُس سے علیحدہ ہو کر دو قدم آگے جا کر کھڑی ہوگئی۔ چاندنی رات، اُس کی عریاں پیٹھ اور کمر کے قوسین، اگاشم کے ہوش اُڑانے کے لیے کافی تھے اُسے نشہ سا ہونے لگا، وہ آگے بڑھا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُس کا رُخ اپنی طرف پھیر لیا۔ موگّا کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اگاشم کی نظریں اُس کی پیشانی سے ہوتی ہوئیں اُس کے گردن سے نیچے اُتریں اور پھر سینے پر ٹھہر گئیں، وہ جذبات سے بے قابو ہوگیا اور اُس نے اُس کے ہونٹوں پر اپنے لب رکھ دیئے۔ جذبات کا طوفان پرورہ ندی کی باڑھ کی طرح بدن کے کناروں تک پھیل گیا اور درمیان کے سارے فاصلے پل بھر میں طئے ہوگئے۔ اب وہ پوری طرح اُس کی ہو چکی تھی، اُس نے اُسے اپنی گود میں بھر لیا اور اُسے لے کر ایک چٹان کی آڑ میں چلا گیا۔ آسمان میں چاند مسکرا رہا تھا۔ ہوائیں چل رہی تھیں اور درختوں کی ڈالیاں ایک دوسرے میں پیوست ہو رہی تھیں اور پرورا ندی کا پانی زور و شور کے ساتھ بہہ رہا تھا۔

☆

اُس ایک رات نے اگاشم اور موگا کی زندگی کا رُخ ہی بدل دیا تھا۔ وہ جیسے سب سے بے نیاز ہوگئے تھے۔ موگا کا دل نہ کام کاج میں لگتا نا اگاشم اب شکار پر جاتا۔ کچھ دنوں تک تو کسی نے کچھ نہیں کہا لیکن رفتہ رفتہ سوالات منہ کھولنے لگے۔ ابتداً کسی جسمانی بیماری کا شبہ ہوا، موگا کی ماں اُسے مونی بابا کے پاس لے گئی۔ بابا نے اُس کے جوبن کی باڑھ کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور پھر اُس کی آنکھوں میں جھانکا، وہاں رات کی تھکن دن کے خمار میں ڈوبی ہوئی چغلی کھا رہی تھی۔ بابا نے اُس کے جسم کو چھونا چاہا تو اُس نے اُس کے ہاتھ کو پرے دھکیل دیا کہ یہ جسم اب کسی پرائے مرد کی چھون کے لیے نہیں ہے۔ بابا نے جادوئی ہڈی اُٹھائی تو اُس نے اُسے بھی روک دیا اور اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ بابا نے ماں بیٹی کی طرف غصے سے دیکھا اور علامتی انداز میں گویا ہوا، ''یہ رات جاگی ہے۔ اس کے جاگنے کا راز ہی اس کی بیماری کا علاج ہے۔'' ماں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور موگا نے لاپرواہی سے جماہی لی اور دونوں قبیلے کی طرف لوٹ آئے۔

من چنا قبیلے کی عورتوں میں بیٹھا اُنھیں لبھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ موگا نے ایک نظر اُس پر اُچٹتی ہوئی سی ڈالی اور آگے بڑھ گئی اور وہ اُسے حسرت بھری نظروں سے دیکھتا رہ گیا۔ عورتوں کے قہقہے گونجے اور اُن میں سے ایک چہکی، ''من چنا اُس کو کیا دیکھتا ہے؟ وہ تیرے کبھی ہاتھ نہ آئے گی۔''

''ارے جن کو برسوں سے دیکھ رہا ہوں، وہ کونسے ہاتھ آئے؟ اب تک کتنے ہی جشن منائے گئے لیکن آج تک کسی نے میرے گلے میں اپنی بانہوں کا ہار نہیں ڈالا۔''

''کتے کی طرح دم ہلاتا رہے گا تو کچھ نہ ہوگا، شکاری بن شکاری۔'' ساری عورتوں نے پھر ایک بار ایک ساتھ قہقہہ لگایا اور من چنا شرمندہ ہو کر زمین کو تکنے لگا، کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ وہ شکاری نہیں بن سکتا۔ وہ بزدل تھا۔ وہ بس قبیلے میں عورتوں کی خدمت کے لیے ہی تھا۔ وہ اُن کے لیے جنگل سے لکڑیاں لاتا، آگ جلاتا، عورتیں نہاتیں تو وہ اُن کی پیٹھ گھس دیتا۔ اُن کے لیے جنگل سے طرح طرح کے پھول لے کر آتا۔ اُن کے ہر کام میں ہاتھ بٹاتا لیکن اس کے باوجود قبیلے کی کوئی لڑکی اُس کے گلے میں اپنے بانہوں کا ہار ڈالنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

اگاشم کو جب سوالات کے گھیرے میں لیا گیا تو پہلے اُس نے کسی کے

سوال کا جواب نہیں دیا بلکہ اطمینان سے آسمان کو گھورتا رہا لیکن جب سردار نے محبت سے اُس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا تو وہ گویا ہوا، ''سردار میں رین اور پربھات کا بھید ہوں، میں ندی کا ویاکل پانی ہوں، میں اگنی میں پانی کا جیون ہوں، میں اپرادھ اور دنڈ کی پری بھاشا میں کیول مانو ہوں، تمہارے سنسکار کا لوبھ بھی نہیں، تمہاری دیا کا بھکاری بھی نہیں، میں کیا ہوں اور کیا ہو گیا ہوں یہ تم نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ تم تو کیول، نیم کے دھارک ہو مجھے کشل منگل دیکھنا چاہتے ہو تو انوراگ کو سمجھو اور قبیلوں کے نیم میں پری ورتن کرو، پھر میں تمہارے جیسا بن جاؤں گا۔''

سردار کی سمجھ میں اُس کی کوئی بات نہیں آئی۔ اُس نے ایسی نظروں سے سب کی طرف دیکھا، گویا اگاشم پاگل ہو گیا ہے، اور پھر وہ سب شکار کی تلاش میں نکل گئے۔ اگاشم کی ماں کی آنکھوں میں آنسوں تھے اور قبیلے کی دوسری عورتیں اُسے رحم طلب نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ اگاشم نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اُسے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور پھر اُس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا، رات تمام جاگی ہوئی اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور پھر وہ گہری نیند سو گیا۔

سورج کلسو بائی کی بلند چوٹی سے نیچے گھنے جنگلوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ زندگی حسب معمول اپنا سفر طئے کر رہی تھی۔ شکاری جانوروں کے پیچھے لپک رہے تھے۔ عورتیں چراگاہوں میں پالتو جانور چرا رہی تھیں۔ کتے اُن کے ساتھ تھے۔ شیر گھنی جھاڑیوں میں آرام کر رہے تھے۔ مور اُن کے دانتوں میں سے گوشت کی دسیاں نوچ رہے تھے۔ درختوں کی ٹہنیوں پر بیٹھے ہوئے پرندے ہوا سے جھول رہے تھے اور دور ندیوں کا پانی چھل بل کی آوازوں کے ساتھ بہہ رہا تھا۔

موگا کی ماں اپنی کٹیا میں بیٹھی تھی لیکن اُس کی سوچ پر اب تک بھی مونی بابا کے الفاظ سوار تھے اور وہ غور کر رہی تھی کہ اُس کی بیٹی تو اُس کے پاس ہی سوتی ہے؟ پھر مونی بابا نے اُس کے جاگتے رہنے کی بات کیوں کی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ رات کو اُٹھ کر کہیں جاتی ہے؟ اور اگر جاتی ہے تو کس کے پاس، اُسے تو قبیلے کا ایک بھی لڑکا بھاتا نہیں، اُس کے ساتھ کی لڑکیاں تو کب کہ اپنے ساتھیوں کے گلے میں بانہوں کے ہار ڈال چکی ہیں۔ اُس نے کٹیا میں سے باہر جھانکا، موگا نیم کے درخت کے نیچے ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی تھی اور اُس کی نظریں ٹیکری کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔ وہ باہر نکلی، اور خود بھی ٹیکری کی طرف دیکھنے لگی، لیکن وہاں کوئی نہیں تھا، پھر یہ موگا کسے دیکھ رہی ہے؟ اچانک اُس کے ذہن میں وہ منظر یاد آ گیا جب موگا اُسی ٹیکری سے بھاگتی ہوئی آئی تھی اور اُس نے کسی نوجوان کے چھیڑنے کا ذکر کیا تھا۔ تو کیا۔۔۔؟ اُس کا چہرہ غصے سے دہکنے لگا، جی میں آیا کہ موگا کو اتنا مارے کے وہ سب کچھ بھول جائے؟ لیکن دوسرے ہی لمحے ممتا کی سوچ بدل گئی، کہیں وہ اُس کے ڈر کے مارے ہی تو سوتی نہیں؟ اُسے پھر ایک بار اپنی بیٹی پر پیار آ گیا لیکن اُس نے پھر بھی یہ طئے کر لیا تھا کہ وہ خود بھی رات کو جاگے گی اور اصل بات تک ضرور پہنچے گی۔

ماں کی کیفیات کو موگا بھی خوب سمجھ رہی تھی اور دل ہی دل میں ہنس رہی تھی کہ ماں تم اس سیلاب کا پیچھا نہ کر سکو گی چنانچہ اُس نے اپنے رویئے میں ایک دم تبدیلی پیدا کر لی۔ وہ نہانے کے لیے ندی پر بھی جاتی تو ماں کو ساتھ لے کر جاتی، جلدی جلدی نہا کر ماں کے ساتھ ہی واپس ہو جاتی۔ کئی بار جھاڑیوں کی اوٹ سے اگاشم نے ماں بیٹی کو دیکھا، وہ موگا کے اس رویئے سے پریشان تھا لیکن پھر بھی اُس نے صبر سے کام لیا اور اُسی طرح جھاڑیوں میں دبکا رہا۔

رات کو وہ ماں کے گلے میں ہاتھ ڈال کر سوتی۔ ماں نے کئی راتیں سونے کا ڈھونگ رچا کر جاگ جاگ کر کاٹیں لیکن جب بھی موگا کو دیکھا وہ اُسے گہری نیند ہی میں نظر آئی، یہاں تک کے وہ اب اُس کی طرف سے بے فکر سی رہنے لگی تھی۔ موگا بھی دن بھر ماں کے ساتھ ہی رہتی، کبھی وہ کام کاج میں اُس کی ہاتھ بٹاتی اور کبھی اُس کے ساتھ چراگاہوں میں مویشیوں کے ساتھ رہتی۔

موگا کی اس احتیاط نے اگاشم کو عجیب سے وسوسوں کا شکار بنا دیا تھا۔ وہ گھنٹوں پرورہ ندی کی جھاڑیوں میں دبکا پڑا رہتا، راتوں میں ملن کی اُس ٹیکری پر پڑا رہتا۔ عجیب عجیب جانوروں کی آوازیں نکال کر موگا کو متوجہ کرنے کی کوشش کرتا لیکن موگا نے تو جیسے اُس ٹیکری کی طرف نہ دیکھنے کا عہد کر رکھا تھا۔

آج کی رات بھی وہ اُسی ٹیکری پر موجود تھا۔ رات بھیانک ہو رہی تھی جنگلی جانوروں کی آوازیں قریب و دور سے آ رہی تھیں۔ آسمان سے چاند بھی غائب تھا اور چاروں طرف ڈراؤنی رات کی سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔ اُس نے ٹیکری پر سے ندی کی طرف دیکھا ندی کا پانی اُداس سروں میں گا رہا تھا۔ اُسے عجیب سی بے چینی ہونے لگی، وہ ادھر سے اُدھر ٹہلنے لگا لیکن ہر بار اُس کی نگاہ موگا کے قبیلے کی طرف اُٹھ جاتی اور پھر مایوس لوٹ آتی، اندھیرا وہاں بھی چھایا ہوا تھا۔ وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا، وہ تھک کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا اُس کی بے چینیوں کے بھیتر سے موگا کسی روشنی کی طرح باہر نکلی، اُس کے گلے میں چمپا کے پھولوں کا مالا تھا، ہاتھوں میں چمپا کے کنگن تھے اور پیشانی پر بھی چمپا کے پھولوں لڑی تھی اُس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ اُس نے کمر پر بھی پھولوں کی ڈوری باندھ رکھی تھی۔ وہ خرامہ خرامہ کبھی اُس کے پاس آ جاتی اور کبھی اُس سے بہت دور ہو جاتی۔ وہ بہت دیر تک اپنے تصورات سے بہلتا رہا، لیکن کب تک اپنے آپ کو دھوکے دیتا، آخر پھر اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور حسرت بھری نظروں سے موگا کے قبیلے کی طرف دیکھنے لگا۔ یکا یک اُس کی جسارت نے اُس کے کانوں میں آہستہ سے کہا، یہاں بیٹھنے سے کیا فائدہ؟ کیوں نہ اُس کے قبیلے تک جایا جائے، اگر وہ جاگ رہی ہو گی تو۔۔۔۔

اور پھر اُس کے قدم ٹیکری سے نیچے اُترنے لگے۔ اُس کی آنکھوں میں صرف موگا تھی اور قدم بے قابو تھے۔ وہ چھپتا چھپاتا کسی طرح اُس کے قبیلے تک پہنچ گیا، اچانک کتوں نے زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا اور وہ فوراً اندھیرے میں دبک گیا۔ موگا جاگ رہی تھی، اُسے پورا یقین تھا کہ وہی ہو گا۔ اُس نے کٹیا میں سونے والوں پر ایک نگاہ ڈالی، سب سو رہے تھے۔ ٹھنڈی ہواؤں نے اُنھیں نہایت گہری نیند سلا دیا تھا۔ کتے بھی خاموش ہو گئے تھے۔ وہ بہت دیر تک اُسی طرح لیٹی رہی اور جب اُسے پوری طرح اطمینان ہو گیا تو وہ آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی کٹیا سے باہر نکل گئی۔ اُسے ملگجے اندھیرے میں ایک سایہ نظر آیا اور اُس

کے یقین نے تصدیق کر دیا کہ وہ اگاشم ہی ہے۔ اُس نے اُسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور خود تیزی سے جھاڑیوں میں اُتر گئی۔

دونوں ملتے ہی ایک دوسرے کے ساتھ پوری شدت کے ساتھ لپٹ گئے اور اگاشم اُس کے بدن کے ایک ایک عضو کا پیار لینے لگا، ہجر کی تڑپ کا ایک ایک پل وصال کی لذتوں سے سیراب ہو رہا تھا۔ پھر اُس نے اُسے اپنی گود میں بھر لیا، ساری تدبیریں، احتیاطی اقدامات منہ دیکھتے رہ گئے اور محبت جھینگروں کی جھائیں جھائیں سے بے نیاز، کیڑے کاٹوں کے خوف سے پرے اپنا سفر طے کرتی رہی، دو پیاسی روحوں کا ملن ہو گیا۔ موگا نے اُسے ساری باتیں بتا دیں اور یہ بھی یقین دلا دیا کہ اُس نے پھر ایک بار ماں کا اعتماد جیت لیا ہے۔ وہ اب پھر سے ملتے رہیں گے لیکن اُسے اس پورنیما تک انتظار کرنا ہوگا۔ پھر وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ موگا کے سارے بدن میں عجیب سا میٹھا میٹھا درد ہو رہا تھا۔ وہ خمار میں ڈوبی ہوئی قدم اُٹھا رہی تھی، بار بار پلٹ کر اگاشم کی جانب دیکھ رہی تھی اور اگاشم کے چہرے پر کسی فاتح کی مسکراہٹ تھی۔ جب وہ اُس کے نظروں سے غائب ہو گئی تو وہ بھی نہایت احتیاط کے ساتھ اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

آریاؤں کے جنگجو قبیلے ساز و سامان سے لدے گھوڑوں اور، بیل گاڑیوں پر سوار دکن کی طرف آ رہے تھے اُن کے ساتھ اُن کی عورتیں، بچے اور ہزار ہا مویشی بھی تھے۔ راستہ اوبڑ کھابڑ پتھریلا تھا، دھوپ کی شدت میں لحہ لحہ اضافہ ہو رہا تھا۔ عورتیں سوتی کپڑوں میں ملبوس تھیں اُن کے بدن پر سونے چاندی کے گہنے چمک رہے تھے، سفر نہایت تزک و احتشام کے ساتھ جاری تھا۔ وہ جس علاقے میں پہنچتے مقامی لوگوں کو مار بھگاتے اور اُن کی بستیوں پر قبضہ کر لیتے۔ یہ قوم بھارت میں کوہِ ہندوکش اور درۂ خیبر کے راستے عمدہ چراگاہوں کی تلاش میں داخل ہوئی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورے سپت سندھو پر قبضہ کر لیا تھا۔ اُنھوں نے یہاں کی قدیم قوم دراوڑیوں کو یا تو مار بھگایا تھا یا پھر اُنھیں اپنا غلام بنا لیا تھا۔ کیونکہ وہ اُن کے مقابلے میں زیادہ طاقتور، جدید جنگی ہتیاروں سے لیس اور ترقی یافتہ تھے۔ وہ کھیتی باڑی سے بھی واقف تھے۔ اُن کی رنگت گوری تھی قد و قامت کے لحاظ سے بھی وہ اونچے پورے، ناک نقشے کے اعتبار سے بھی نہایت خوبصورت تھے۔ انتظامی امور سے بھی وہ خوب واقف تھے اور اب دکن اُن کا نشانہ تھا۔

چلچلاتی ہوئی دھوپ میں اُن کے بدن جھلس رہے تھے۔ عورتیں اور بچے پریشان تھے لیکن راجن کا حکم تھا کہ سفر جاری رہے۔ جب تک کوئی سبزہ زار ندی کی وادی نہیں آ جاتی قافلے روکیں گے نہیں۔ بچوں نے بھوک سے بلکنا شروع کر دیا تھا اور پیاس کے مارے جانوروں کا بُرا حال تھا، لیکن اُن کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی، گرد و غبار اُڑ رہا تھا اور کہیں کہیں بگولے اُن کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے۔ اُنھوں نے کتنے ہی چٹیل میدان پار کیے، کتنے ہی گھنے جنگلوں سے اُن کا گزر ہوا، وہ مسلسل آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ اُنھوں نے دور سے دیکھا ندی کا پانی چمک رہا ہے۔ ندی کو دیکھتے ہی گویا تھکے ہوئے قبیلوں میں نئی جان آ گئی، جانوروں پر کوڑے برسنے لگے اور اُن کی رفتار تیز ہو گئی۔ اُن کے چہرے کھل اُٹھے، آخر وہ سب ندی کے کنارے پہنچ گئے اور اُنھوں نے پڑاؤ ڈال دیا۔ عجب منظر تھا۔ آوازوں کا شور تھا، جانور پیاس بجھا رہے تھے۔ درختوں کے نیچے خیمے نصب ہو رہے تھے، کوئی نہا رہا تھا۔ کوئی اپنے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ بچے درختوں کے نیچے کھیل رہے تھے اور عورتیں کھانے پینے کے بندوبست میں جُٹی ہوئی تھیں۔

اور اُن کی آمد سے بے نیاز دکن میں دراوڑی اب بھی چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں منقسم اپنی گھانس پھونس کی جھونپڑیوں میں مست تھے۔ اُنھیں خبر ہی نہیں تھی کہ آسمان کیا رنگ دکھانے والا ہے۔ وہ دن اور رات کی گردش سے بے نیاز وقت کی چادر پر میٹھی نیند سو رہے تھے۔

پورنیما کے چاند کے ساتھ ہی موگا اور اگاشم کی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ وہ کبھی دن کی روشنی میں پرورہ ندی کے کنارے بہت دور تک نکل جاتے، کبھی ندی میں ڈبکیاں لگاتے اور کبھی ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے جنگلوں میں بھٹکتے رہتے اور کبھی چاندنی راتوں میں ایک دوسرے سے ملتے، ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھاتے، ایک دوسرے کو چھیڑتے، قہقہے لگاتے، عیش و مستی کے مزے لوٹتے، گویا اُن کی زندگیوں پر بہار ہی بہار چھا گئی تھی۔

موگا دن بدن خوبصورت ہوتی جا رہی تھی، اُس کا جسم اور بھی سڈول ہو گیا تھا، اگاشم کی بے پناہ محبت نے اُس میں عجب سی خود اعتمادی پیدا کر دی تھی بلکہ وہ کسی حد تک خود سر بھی ہو گئی تھی۔ ماں اُس کے جسم اور مزاج کی ان تبدیلیوں سے پھر ایک بار فکر مند ہو گئی تھی۔ وہ لاکھ جتن کرتی لیکن بیٹی کا راز اُس کے ہاتھ نہ آتا اور وہ اگاشم سے ملنے کا موقع نکال ہی لیتی۔ ماں نے مجبور ہو کر من چنا سے مدد مانگی اور اُس نے نہ صرف مدد کی حامی بھری بلکہ اُسے یہ بھی یقین دلایا کہ اگر موگا غلط راستے پر بھٹک بھی گئی ہو تو وہ اُسے اپنا لے گا، بس اُسے اپنی لڑکی کو مجبور کرنا ہوگا کہ وہ اُس کے گلے میں اپنی بانہوں کہ ہار ڈال دے۔ مجبور ماں کے لیے اس سے بڑا اور کیا احسان ہو سکتا تھا کہ لاٹھی بھی نہ ٹوٹے اور سانپ بھی مر جائے۔ اُس نے خوشی خوشی وعدہ کر لیا، اور من چنا اپنے کام پر لگ گیا، وہ جانتا تھا کہ چاہے جیسی گھٹنا گھٹ جائے موگا کبھی بھی اُس کے گلے میں بانہوں کا ہار ڈالنے والی نہیں، اس کی خاطر مجھے وہ کھیل کھیلنا پڑے گا جس سے وہ پوری طرح ٹوٹ جائے اور قبیلے والے خود یہ آدیش دیں کہ وہ میری ہو جائے۔ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اُس نے اپنا کلہاڑہ اُٹھایا اور جنگل کی طرف جانے لگا جیسے ہی وہ چراگاہ کے قریب پہنچا اُس کے کانوں میں عورتوں کے قہقہے گونجے اور اُن میں سے ایک سوال اُبھرا، ''کلہاڑہ لے کر کہاں جا رہا ہے۔''

اُس نے سب کی طرف نہایت تمکنت سے دیکھا، ''شکار کی تلاش میں نکلا ہوں؟''

''شکار کی تلاش میں یا شکار ہونے۔۔۔؟'' ایک آواز اُبھری

''اری بیچارہ کسی چڑیا کا شکار کرنے جا رہا ہوگا؟۔۔۔ ہے نا من چنا؟''

''ہاں۔۔۔ جب چڑیا مار لاؤں گا نا۔۔۔ تب دیکھ لینا، آنکھیں حیرت سے پھیل جائینگی۔''

''جلدی سے لانا۔۔۔تب تک ہم یہیں تمہارا انتظار کریں گے۔''

اور پھر وہ سب ہنسنے لگیں اور من چنا تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

آریاوں کا کوہِ ست پڑا کے دامن میں آباد دراوڑیوں سے مقابلہ ہوگیا لیکن کچھ ہی دیر میں اُن کے بے شمار افراد مارے گئے اور جو بچے تھے وہ جنگلوں کی طرف بھاگ نکلے، اسی بھاگم دوڑ میں راجن کی دس سالہ بیٹی یشودھرا کی نظر ایک چودہ پندرہ برس کے لڑکے پر پڑی جو شاید بھاگتے وقت ٹھوکر کھا کر گر گیا تھا، وہ زور سے چلائی، ''دیسو۔۔دیسو'' (غلام۔غلام) راجن نے بیٹی کی آواز سنی اور گرے ہوئے لڑکے کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں بڑبڑایا، دیسو۔۔۔اور پھر حکم دیا، اُس لڑکے کو میرے پاس لے آؤ، اور جب لڑکا اُس کے سامنے لایا گیا تو اُس نے اپنی بیٹی کی طرف مسکرا کر دیکھا، ''لیش ! آج سے یہ تیرا دیسو ہے۔''

یشودھرا نے نہایت میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ دیسو کی طرف دیکھا اور پھر دیسو کے ہاتھ باندھ کر رسی کو یشودھرا کے بیل گاڑی کے پیچھے باندھ دیا گیا اور جیسے ہی بیلوں نے دوڑنا شروع کیا، وہ اُس کی گاڑی کے پیچھے اُسی رفتار سے دوڑنے لگا۔

آریاوں کا یہ قافلہ پھر ایک بار دکن دیس کی طرف روانہ ہوگیا۔

چاندنی دودھ کی طرح چٹکی ہوئی تھی اور وہ پرورا ندی کی وادی سے دور بھنڈار در ے کی ایک نہایت اونچی گھاٹی پر بیٹھے ہوئے تھے اور اُس کے بہت نیچے مولا ندی شانت بہہ رہی تھی۔ اگاشم چمپا اور گیندے کے پھولوں سے اُس کا سنگھار کر رہا تھا۔ موگا کی آنکھیں بند تھیں۔ پیشانی پر پھولوں کی لڑی باندھنے کے بعد اُس نے گیندے کے پھولوں کی مالا اُس کے گلے میں پہنایا، اور کمر میں پھولوں کی لڑی کو باندھنے کے لیے جیسے وہ اُس کی طرف جھکا وہ اُس کے سینے سے لگ گئی، اُس کی آنکھیں اب بھی بند تھیں، ''اگاشم وچن دو کہ سارا جیون مجھے اسی طرح پیار کرتے رہو گے۔''

اگاشم کی بانہوں نے اُسے پوری شدت سے بھینچ لیا، اور پھر وہ اُس کے کانوں میں پھس پھسایا، ''تم ایک جنم کا وچن لے رہی ہو لیکن میں تو تمھیں جنم جنم اسی طرح پیار کرتا رہوں گا۔''

موگا نے اُس کی چھاتی سے سر اُٹھایا اور اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ دونوں کی آنکھوں میں ایک دوسرے کا نشہ چھایا ہوا تھا۔ خمار میں ڈوبی ہوئی ادھ کھلی آنکھیں پیار کے ساغر لنڈھا رہی تھیں اور موگا کے منہ سے بہت آہستہ سے نکلا، ''اگاشم اور اگاشم کے ہونٹ شہد جیسی مٹھاس سے بھر گئے۔ دونوں کے جسم میں خون کی روانی بڑھ گئی اور وہ دونوں ایک دوسرے میں سمانے لگے۔ اگاشم اُسے لیے زمین پر لیٹ گیا۔ آسمان سے چاند نے دونوں کی طرف دیکھا۔ ہواوں نے سیٹیاں بجائیں اور پیپل کے درختوں کے پتوں نے خوش ہو کر تالیاں بجانا شروع کیا ساتھ ہی گھاٹی سے، بہت نیچے بہنے والی مولا ندی نے نہایت سریلا راگ چھیڑا۔

گھاٹی سے بہت دور بے شمار افراد مشعلوں کی روشنی میں چلے آرہے تھے۔ آسمان میں کوئی ستارہ ٹوٹا اور موگا گھبرا کر اُٹھ بیٹھی، وہ بھی اُٹھ بیٹھا اور حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگا تو اُس نے کہا، ''اگاشم ابھی ابھی ستارہ ٹوٹا ہے۔''

''تو۔۔۔؟''

''ماں کہتی ہے جس نے بھی ستارے کا ٹوٹنا دیکھا، اُس پر آفت آتی ہے۔'' اگاشم ہنس پڑا، ''تم پر اس سے بڑی آفت اور کیا ہوسکتی ہے کہ میں مرجاوں؟'' اُس نے فوراً اُس کے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ دی، ''ایسی باتیں نہ کرو اگاشم، مجھے بھئے ہو رہا ہے۔''

اگاشم نے اُس کے گال پر ہلکی سی چپت لگائی، ''مورکھ! بھئے، چنتا اور ڈر۔۔۔یہ سب کائرتا کے روپ ہیں۔ تم کائر نہیں ہوسکتی، اگر میں مر بھی جاوں تو تم کو یہ بات پوری ویرتا کے ساتھ سویکار کرنا چاہیے۔''

''تم ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو؟''

''نہیں۔۔۔اگر میں مرجاوں تو؟''

'' میں بھی مرجاوں گی۔''

اچانک چاروں طرف سے اُن پر روشنی نے حملہ کیا، اور وہ دونوں اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ من چنا کی آواز اُبھری، ''میں نے سچ ہی کہا تھا نا، دیکھ لیا ان کو۔''

موگا، اگاشم سے لپٹ گئی، وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ سردار نے اُس کی گردن پکڑ کر زور سے کھینچا اور وہ پوری شدت سے چلائی، ''یہ میرا ہے، میں نے ہی اس کے گلے میں اپنی بانہوں کا ہار ڈالا تھا۔''

سردار نے اُس کے منہ پر پوری طاقت سے تھپڑ رسید کر دیا اور وہ لوگوں کے پیروں میں جا گری۔ اگاشم نے اپنا بھالا اُٹھا لیا اور تن کر کھڑا ہوگیا اور غصے سے چلایا، ''موگا پر ہاتھ اُٹھانے والے کو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''اگاشم!'' یہ اُس کے اپنے سردار کی آواز تھی، ''تو یہ تھا تیرا بھید، اسی مارگ پر چل کر تو آگ میں پانی کا جیون بننا چاہتا تھا۔ مورکھ تو نے نیم توڑا ہے۔ پاپ کیا ہے اور ایسے پاپ کا ایک ہی دنڈ ہے۔۔۔مرتیو دنڈ۔''

اگاشم نے باری باری وہاں پر کھڑے ہوئے مردوں اور عورتوں کی طرف دیکھا، موگا کو لوگوں نے سختی سے پکڑ رکھا تھا اور پھر اُس کی نظریں اُس کی ماں پر ٹھہر گئیں، ''ماں ہم نے کوئی پاپ نہیں کیا ہے۔ اُس نے میرے گلے میں اپنی بانہوں کے ہار ڈالے اور میں نے اُسے سویکار کیا، اس میں پاپ کہاں ہے؟''

موگا کی ماں آگے بڑھی اور دونوں سرداروں کے سامنے گھٹنے ٹیک کر اور ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہوگئی، ''ان کو چھما کر دو اور اسے اپنے قبیلے میں سویکار کر لو۔''

دونوں سرداروں نے اُس کی طرف حقارت سے دیکھا تو اگاشم کی ماں نے زمین پر اپنا ماتھا ٹیک دیا اور گڑگڑاتے ہوئے اپنے سردار سے بولی، ''وہ اگر اُنھیں اپنے قبیلے میں نہیں چاہتے تو سردار تم اُنھیں اپنے قبیلے میں سویکار کر لو، تم جانتے ہو میرا اگیا باگھ ہے، جس قبیلے میں رہے گا سکھ پہنچائے گا۔ اُنھیں چھما کر دو۔''

دونوں سرداروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''تاکہ لوگ بار بار نیم توڑیں اگر ان کو چھما کر دیا گیا تو سمجھو کسی قبیلے

میں کوئی لڑکی سرکھشت نہیں رہے گی؟'' من چنا نے سب کی طرف دیکھا،''میں نے کیا غلط کہا ہے؟۔۔۔بولو۔۔۔نیم توڑنے والوں کو اوشیہ ڈنڈ ملنا ہی چاہیے۔''

اور سب لوگوں نے اپنے منہ میں اُنگلی ڈال کر زور زور سے آوازیں نکالیں گویا وہ من چنا کی تائید کررہے ہوں۔سرداروں نے تیراندازوں کو اگاشم کے سامنے کھڑے ہونے کا اشارہ کیا،اوراس سے پہلے کہ وہ تیر برساتے اگاشم کے ماں کی آواز گونجی،'' رُک جاو۔۔چھما کردوان بچوں کو،میں تم سب سے دیا کی بھیک مانگتی ہوں۔''لیکن کوئی چہرہ پسیجا نہیں،وہ باری باری سب کی آنکھوں میں جھانکنے لگی ۔اس بے مروتی نے ماں کے کلیجے میں آگ بھردی،اُس نے آسمان کی طرف دیکھا، اور پھر اُس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے اور الفاظ بددعا میں تبدیل ہونے لگے،''سن لو۔۔۔ایک ماں کی گھوشنا بھی سن لو۔۔اگر ان معصوموں کو مارو گے،تو تم سب کو پاپ لگے گا،اور ایسی آندھی اُٹھے گی کہ تم سب بھسم ہوجاو گے۔''

پورے ماحول پر سناٹا چھا گیا۔

موگا جھٹ پٹانے لگی اور سرداروں نے تیراندازوں کو اشارہ کیا کہ اگاشم کو ختم کردیا جائے۔چلوں پر تیر چڑھنے لگے اور موگا نے کسی طرح اپنے آپ کو چھڑالیا اور تیزی سے بھاگنے لگی،لوگ اُس کے پیچھے دوڑے لیکن اُس نے گھاٹی پر سے مولاندی میں چھلانگ لگادی اور تیروں کی بوچھار نے اگاشم کو ختم کردیا اور سب کے کانوں میں بہت دیر تک موگا کی دردناک چیخ سنائی دی۔پورے ماحول پر سکوت چھا گیا صرف دو مائیں بلبلاتی ہوئیں اپنا سینہ کوٹ رہی تھیں،اور ہواؤں کی رفتار میں اضافہ ہونے لگا تھا،اور مشعلوں کی روشنی تھرتھرانے لگی تھی۔

''اے چاند۔۔۔!''عشق چاند سے مخاطب تھا،'' موگا اور اگاشم کی موت میری موت نہیں ہے۔میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ میں لافانی ہوں،میں عشق ہوں،میری رہ گذر کا کوئی انت نہیں۔۔۔انتظار کر میرے اگلے سفر کا۔۔۔''

اور چاند نے دیکھا۔۔۔دور۔۔۔۔بہت دور اُٹھنے والی آندھی اپنی آمد کا اعلان کررہی تھی۔

فرانز کافکا

(1924-1883)

فرانز کافکا نے کبھی شادی نہیں کی اور نہ کبھی اُن کے بچے ہوئے۔چالیس سال کی عمر میں وہ ایک دن برلن کے ایک پارک میں چہل قدمی کر رہے تھے جب انھیں ایک چھوٹی بچی ملی جو رو رہی تھی۔پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اس کی سب سے پسندیدہ گڑیا کھو گئی ہے۔کافکا نے بچی کے ساتھ مل کر گڑیا ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔کافکا نے بچی سے کہا کہ وہ کل وہیں ملے اور وہ ایک مرتبہ پھر گڑیا ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔اگلے دن جب انھیں گڑیا نہیں ملی تھی تو کافکا نے بچی کو ایک خط دیا جو اس گڑیا نے 'لکھا' تھا۔خط میں لکھا تھا کہ 'میری دوست،رو مت۔میں دنیا گھومنے جا چکی ہوں اور میں تمھیں اپنے حیرت انگیز سفر کے بارے میں بتاؤں گی۔'یوں ایک ایسی کہانی کی ابتدا ہوئی جو کافکا کی زندگی کے اختتام تک جاری رہی۔

بچی سے ملاقاتوں کے دوران کافکا اس گڑیا کے خطوط پڑھتے جس میں حیرت انگیز سفر اور مزے مزے کی کہانیاں ہوتیں جسے وہ بچی اپنی گڑیا کے خطوط سمجھ کر پڑھتی اور اسے دلی سکون ملتا۔بالآخر ایک دن کافکا نے اس بچی کو ایک گڑیا لا کر دی اور کہا کہ اس کی گڑیا دنیا کے سفر سے برلن واپس آگئی ہے۔

بچی نے کہا کہ یہ گڑیا تو بالکل بھی میری گڑیا جیسی نہیں لگتی۔کافکا نے بچی کو ایک اور خط دیا جس میں گڑیا نے لکھا تھا کہ 'دنیا بھر کے سفر سے میں تبدیل ہوگئی ہوں۔'چھوٹی معصوم بچی نے گڑیا کو گلے سے لگایا اور خوشی خوشی اپنے گھر لے گئی۔ایک سال بعد کافکا کی موت ہوگئی۔کئی سال بعد جب وہ بچی اپنی جوانی میں داخل ہوئی تو ایک دن گڑیا کو الٹتے پلٹتے اسے اس کے اندر سے فرانز کافکا کا دستخط شدہ ایک خط ملا جس پر لکھا تھا:

'ہر وہ چیز جس سے تم محبت کرتی ہو،ایک دن گم ہوجائے گی،لیکن بالآخر تمھیں کسی اور شکل وصورت میں ہی سہی،لیکن محبت ضرور ملے گی۔

"عزم وایمان"

قرآن
(کلامِ پاک)

اسی قرآن سے کایا پلٹ دی تھی محمدؐ نے
بساطِ کفر و شر یکسر اُلٹ دی تھی محمدؐ نے

اسی سے تو فتح پائی تھی اصحاب محمدؐ نے
زمیں انصاف سے بھر دی تھی اصحابِ محمدؐ نے

اسی قرآن سے بدلا تھا وحشت کو تمکن سے
بدل ڈالی تھیں بد اخلاقیاں خلق و تمدن سے

اسی قرآن سے ایثار کا رستہ دکھایا تھا
اسی سے احترام آدمیت کو سکھایا تھا

اسی سے ذی شرف اور متقی ان کو بنایا تھا
اسی سے عزم و ایمان و عمل کا گُر بتایا تھا

اسی سے قوتوں کا وہ خزانہ ہاتھ آیا تھا
کہ دنیا کی بڑی دو طاقتوں کا سر جھکایا تھا

اسی سے سرکشوں کی گردنوں کو بھی جھکایا تھا
اسی سے جنگ جُو، وحشی قبائل کو ملایا تھا

جو بارہ لاکھ میلوں تک تھے ریگستان میں پھیلے
وہی سرکش، معلم بن گئے اخلاق کے کیسے

برکت سے قرآنِ پاک کی سب کو دوا مل جائے
دعا شاہد کی ہے بیمار روحوں کو شفا مل جائے

محمد شاہد صدیقی شاہدؔ (کینیڈا)

نعت رسول مقبول ﷺ

کیا خوب ہیں ہمارے لئے رہنما اصول
ہم کو جو دے گئے ہیں شہِ دوسرا ﷺ اصول

ہر ابتدا اصول ہے، ہر انتہا اصول
یعنی مِرے حضور ﷺ کا ہر نقشِ پا اصول

جن کو ہوئے ہوں دستِ نبی ﷺ سے عطا اصول
درکار ہوں بھلا اُنہیں پھر اَور کیا اصول؟

مَیں خاک ہو کے خاک سے آگے نکل گیا
اُن ﷺ سے عطا ہوئے جو مجھے کیمیا اصول

آئین کوئی اَور ، نہ منشور کوئی اَور!
اپنا ہے صرف پیروِیِ مصطفیٰ ﷺ اصول

اپنے لئے مثال ہے بس سیرتِ رسول ﷺ
درکار ہی نہیں ہے کوئی دوسرا اصول

گُم کردہ راہ ہونے کا خطرہ بھلا کہاں؟
سیرت ﷺ کی پیروی کو اگر کر لیا اصول

خوشبو ہی بانٹتی ہے وُہ سب زائرین میں
رکھتی ہے خوب طیبہ کی آب و ہوا اصول

اے کاش ہم نسیمِ سحر عمر بھر رکھیں
اللہ اور رسول ﷺ کی حمد و ثناء اصول

نسیم سحر (راولپنڈی)

ہم سفر کوئی مل جائے گا

فیروز عالم
(کیلی فورنیا)

تانگے نے اسے چوک میں اتار دیا۔رات ہو چکی تھی۔ہر طرف دکانوں کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں اور تانگوں، ٹھیلے والوں اور پیدل چلنے والوں کے ہجوم کی وجہ سے اس چوک میں اب بھی ایسی ہی رونق تھی جیسے سالوں پہلے ہوتی تھی۔حامد یہاں کوئی پچیس سال بعد آیا تھا۔ریلوے اسٹیشن سے اس نے تانگہ لیا تھا کہ اسے یقین تھا کہ وہ کسی مشکل کے بغیر اپنے پتے پر پہنچ جائیگا مگر اس کا اندازہ غلط نکلا تھا۔یہ شہر، اس کا شہر جہاں اس نے زندگی کا ایک ناقابل فراموش دور گزارا تھا اور جس کی گلیوں میں کبھی اس کے قدموں کے نشان ثبت تھے اب اسقدر بدل چکا تھا کہ اسے پہچاننا بھی مشکل تھا۔کچھ گلیوں میں گھمانے کے بعد تانگے والا جھنجلا گیا تھا اور اس نے حامد ہی کی درخواست پر اس کو اس چوک میں اتار دیا تھا۔یہ چوک بڑی حد تک اب بھی ایسا ہی تھا جیسے پہلے تھا۔اسے یقین تھا کہ یہاں سے وہ اس گھر کو تلاش کرلے گا جو اسکی منزل ہے۔اس کے پاس ایک کندھے پر ڈالنے والا بیگ تھا اسلئے یہ مشکل نہ تھا کہ وہ پیدل ہی راستہ تلاش کرلے۔ایک دو گلیوں میں بھٹکا کئی دروازوں کو غور سے دیکھا مگر کھٹ کٹانے کی ہمت نہیں ہوئی۔پرانے گھر توڑ کر کئی منزلہ نئے گھر بن چکے تھے۔پیپل اور نیم کے وہ درخت جنکی شاخیں ان گلیوں میں سایہ کئے رہتی تھیں کاٹ دئے گئے تھے۔مگر پھر اچانک اسے سامنے وہ پرانا کنواں نظر آیا جو اس گھر کی پہچان تھی۔وہی کنواں جسکے چاروں طرف شام کو بڑی رونق رہتی تھی اور بچے پیاس نہ ہونے کے باوجود بہشتیوں سے بار بار مانگ کر اوک سے پانی پیا کرتے تھے۔کس قدر ٹھنڈا اور میٹھا پانی ہوتا تھا اس کنویں کا۔سامنے ہی رضیہ کا دروازہ تھا۔اب بھی ویسا ہی، لکڑی کا بھاری دروازہ جس میں موٹی موٹی لوہے کی کیلیں اور کنڈے لگے تھے۔مگر اسکا رنگ ادھڑ چکا تھا اور اسکے اطراف اینٹوں کی دیواروں کا پلستر جھڑ گیا تھا۔اس کا دل اس گھر کو دیکھ کر دھڑکا، دھڑکن میں ہلکی سی بے قائدگی بھی ہوئی۔''کیسی ہوگی وہ۔۔۔کتنے سال بعد اسے دیکھوں گا'' اس نے سوچا اور پھر آگے بڑھ کر دروازے کا کنڈا کھٹ کھٹا دیا۔

وقت کیسا ظالم ہے۔جب گذرتا ہے تو معلوم ہی نہیں ہوتا۔ایک ایسا چور جو نظر بھی نہیں آتا مگر دبے پاؤں ہماری سب سے قیمتی دولت، عمر کی پونجی چرا کر لے جاتا ہے۔حامد کو بھی معاً وقت کے تیزی سے گذر جانے کا احساس ہوا۔اس نے سوچا۔کتنے ہی سال بیت گئے ہیں انہیں ایک دوسرے سے ملے۔اب جب ہم مل رہے ہیں دونوں ہی عمر کے اس دور میں ہیں جب میرے سیاہ گھنگر والے بالوں میں سفیدی جھلک رہی ہے اور آنکھوں پر موٹا چشمہ چڑھا ہوا ہے۔اور شاید رضیہ کے بھی سنہرے مائل بھورے بالوں میں چاندی مل گئی ہو۔

کئی سال پہلے اسے اس چھوٹے سے شہر میں نئی نئی ملازمت ملی تھی۔یہاں کچھ ہی پہلے کالج کھلا تھا اور انگریزی ادب کے استاد کی ضرورت تھی۔اس نے اسی سال انگریزی میں ایم اے کیا تھا اسے اپنے شہر میں تو نوکری ملنا ناممکن تھی کیوں کہ وہ بہت بڑا شہر تھا اور بقول اس کے دوستوں کے، کہ اگر کوئی اینٹ اٹھاؤ تو نیچے سے کئی ایم اے نکلیں گے۔اس نے موقعہ کو غنیمت جانتے ہوئے اس پیشکش کو قبول کرلیا تھا۔سندھ کا یہ چھوٹا سا شہر ایک انتہائی ذرخیز علاقے میں آباد تھا۔اسے ایک نئے شہر ایک نئے ماحول میں زندگی شروع کرنے کے تصور سے کچھ پریشانی تھی مگر جب وہ یہاں پہنچا تو علاقے کی خوبصورتی، لوگوں کی سادگی اور شہر کی کشادگی نے اس کا دل موہ لیا۔کالج شہر سے باہر تھا۔چند ہی قدم پر لہلہاتے کھیت شروع ہوجاتے تھے اور ان کے درمیان ان گنت آموں کے باغات تھے جن میں موسم بہار میں مور آتا تھا۔صبح میں ایسی تازگی تھی اور شام میں لہلہاتے کھیتوں اور دور دور تک کھلے جنگلی پھولوں کی ایسی مہک تھی جو اُس نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔پھر مغرب کی جانب کچھ دور پر کھجوروں کا ایک جھنڈ تھا جس کے بیچ ایک کچا کنواں تھا جہاں شام کو مقامی عورتیں شیشے کے کام کے بنے لمبے چوغے پہنیں پانی بھرا کرتی تھیں۔۔یہ منظر اسے ناولوں میں پڑھے عرب کے نخلستانوں کی یاد دلاتا تھا۔وہ ڈھلتی شام کے وقت ٹہلتے ٹہلتے اس طرف نکل جاتا اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر اپنے خیالوں میں ڈوب جاتا تھا۔غرض زندگی اتنی خوشگوار تھی کہ شہر میں رہتے اس نے اسکا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

کالج میں مخلوط تعلیم تھی۔فیکلٹی میں بھی کئی خواتین تھیں۔اساتذہ کا اسٹاف روم بھی مخلوط تھا، وہاں صاف ستھرے صوفے بچھے تھے اور دیوار کے سہارے کافی چائے اور دوسرے لوازمات کی ٹیبل لگی تھی۔فری پیریڈز میں بڑی رونق ہوتی تھی اور کمرہ قہقہوں اور چہ چوں سے بھر جاتا تھا۔یہیں اس نے پہلے پہل ''میڈم رضیہ'' کو دیکھا تھا۔یہ ایک مضحکہ خیز بات تھی کہ تمام خواتین لیکچررز ''میڈم'' کہلاتی تھیں چاہے وہ جوان ہوں یا عمر رسیدہ، شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ۔شاید یہی اس چھوٹے شہر کا کلچر تھا۔رضیہ بمشکل چھبیس یا ستائیس سال کی تھی اور دیکھنے میں اس سے بھی کم عمر لگتی تھی مگر وہ سب سے الگ تھی۔جہاں باقی خواتین خوش مزاج، بڑی حد تک بیباک اور بنی سنوری رہتی تھیں وہاں رضیہ بہت سادہ، ہمیشہ سفید کپڑوں میں ملبوس اور نہایت خاموش طبع لڑکی تھی اس نے اسے بہت ہی کم بولتے سنا تھا۔فری پیریڈس میں بھی وہ ایک کونے میں بیٹھی کچھ پڑھتی رہتی تھی۔اس میں اس قدر تمکنت اور رکھ رکھاؤ تھا کہ کسی کو اس سے مزاق کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔بس وہ اپنی دنیا میں گم رہتی تھی۔

اپنے آپ میں گم ہونے کے باوجود اسکی شخصیت کچھ ایسی تھی کہ ہر شخص اسکی جانب کھنچا جاتا تھا اساتذہ میں اسکے لئے بڑی عزت تھی اور اس نے محسوس کیا تھا کہ سب لوگ چاہتے تھے کہ اس سے گفتگو یا اسکے قریب آنے کا موقعہ ملے۔ایک دن وقفے کے دوران جب اسٹاف روم میں دو چار ہی لوگ تھے اور وہ دونوں ہی چائے کے اسٹینڈ کے پاس کھڑے تھے، چائے انڈیلتے ہوئے رضیہ کے

ہاتھ سے بھری ہوئی چائے کی پیالی پھسل کے اس کے کپڑوں پر گری اور اسکی سفید پتلون کو آلودہ کر گئی۔ حامد کو تو اسکا اتنا برا نہ لگا، کہ حادثات ہوتے ہی ہیں، مگر رضیہ پر تو جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا، اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح اس سے معافی مانگے یا اسکا اظہار کرے۔ اس نے عجیب نظروں سے اسے دیکھا اور پھر انتہائی بے بسی کی وجہ سے اسکی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔ بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی'' آئی ایم سوری۔۔ مجھے معاف کر دیجئے، میرا دھیان کہیں اور تھا'' اسکو خیال ہوا کہ اس نے اس سے پہلے رضیہ کو اتنے مختصر جملے بھی کسی سے کہتے نہیں سنے تھے۔ اس نے پہلی دفعہ اسکی جانب نظر بھر کر دیکھا، کھڑکی سے آنے والی دھوپ کی نرم روشنی اسکے چہرے کو منور کر رہی تھی اور اسکے ہلکے بھورے بالوں کے گرد ایک حالہ سا بن گیا تھا، بڑی بڑی بادامی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور اسکے خشک ہونٹوں پر ہلکی سی لرزش تھی۔ ''نہیں رضیہ یہ۔۔ یہ تو کوئی بڑی بات نہیں۔۔۔ ایسا تو ہو جاتا ہے۔۔۔'' اس نے پہلی بار اسے مخاطب کیا تھا اور نہ جانے کیوں وہ اس دھان پان سی لڑکی کو میڈم نہیں کہہ سکا تھا۔ ''مگر۔ مگر اب آپ کلاس کیسے لینگے؟؟'' وہ ہنس پڑا'' ہاں بھئی یہ بات تو ہے لڑکے سمجھیں گے میں اتنا بڑا ہو کر بھی پھوہڑ کا پھوہڑ ہی رہا'' وہ بھی ہلکا سا مسکرائی پھر کہنے لگی آپ کل یہ کپڑے مجھے لا دیں میں انہیں دھو کر لا دونگی۔ حامد نے مسکرا کر اسکی بات ٹال دی۔

مگر نہ جانے کیوں اس رات حامد میں ایک نئے احساس نے کروٹ لی، اسے رضیہ کا یہ کہنا بہت اچھا لگا تھا کہ میں آپ کے کپڑے دھو کر لا دونگی۔۔۔ ایک اپنائیت تھی اس میں، وہ نوجوان تھا، اس کے جذبات ناپختہ تھے۔ شاید اس کے دل کے دریچہ پر یہ پہلی دستک تھی۔ حامد میں ایسا احساس پہلے کبھی نہ جاگا تھا۔ وہ رات بھر بیچین رہا مگر یہ بیچینی ایک بے نام سی لذت بھی لئے تھی۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اسکی کوئی اہمیت نہیں۔۔ یہ تو ایک حادثہ تھا اور یہ رضیہ کی اخلاقی ذمہ داری تھی جسکے لئے اس نے یہ رسمی جملہ ادا کر دیا تھا۔ اسے اس معمولی سے واقعہ اسقدر خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔ مگر پھر بھی دل ناداں ایک انجانی مسرت میں ڈوب گیا تھا۔ اس کے بعد جب بھی وہ اسے اسٹاف روم میں دیکھتا اس کے دل میں رضیہ کے لئے عجب سی اپنائیت کا احساس جاگتا۔ وہ اس سے کسی نہ کسی بہانے بات ضرور کرتا، چاہے وہ بات کتنی ہی مختصر ہوتی یا کیسی ہی بے معنی۔

لیکن رضیہ کی شخصیت اس کے لئے ایک معمہ تھی، اسکی آنکھوں میں ایک بے نام سا دکھ، ایک چھپی ہوئی افسردگی نظر آتی تھی۔ اسکے چلنے پھرنے، اسکے خاموش رہنے اور کبھی کبھی اپنے آپ میں گم ہو جانے کے پیچھے اسے کوئی کہانی چھپی نظر آتی۔ ایک سہ پہر جب کامن روم میں تنہائی تھی کہ یا تو زیادہ تر لیکچرر زاپنے پیریڈس ختم کر کے گھر جا چکے تھے یا اپنے آخری پیریڈس میں مشغول تھے رضیہ کمرے میں داخل ہوئی، اس نے اُس کی طرف دیکھا، ہلکے سے مسکرائی اور پھر میز پر جا کر کافی کا پیالہ بنا کر اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ کر کوئی کتاب کھولنے ہی والی تھی کہ وہ اٹھ کر اسکے پاس گیا اور کہا'' رضیہ کیسی ہو۔۔؟'' رضیہ نے اس کی طرف اپنی موٹی موٹی آنکھیں اٹھا کر دیکھا، وہ آنکھیں جن میں ہمیشہ دور کہیں غم کے سائے لہراتے تھے۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی، کہنے لگی ٹھیک ہوں۔'' اس نے کہا'' رضیہ۔۔ دیکھو انسان پیدا ہی انسان کے دکھ سکھ بانٹنے کے لئے ہوا ہے، کیا تم نے سنا نہیں کہ انسان social animal ہے میں دیکھتا ہوں کہ تم سب سے الگ سب سے جدا ہو۔ نہ جانے کیوں مجھے اسکا خیال آتا ہے کہ تم تنہا اور اداس ہو۔ مجھ پر اعتماد کرو، ہم ہم پیشہ ہیں، تعلیمی طور پر بھی یکساں ہیں اس لئے ایک دوسرے کے حالات کو سمجھ سکتے ہیں۔ میں خلوص سے چاہتا ہوں کہ تمہارے حالات جانوں۔۔ مجھ پر بھروسہ کرو'' رضیہ نے ایک بار پھر نظریں اٹھائیں اسکے چہرے پر ایک عجیب رنگ آیا، کچھ کہنے کے لئے لب کھولے مگر صرف ہلکی سی لرزش ہوئی پر وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ وہ چپ ہو گیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر کہنے لگی'' حامد صاحب۔۔ پھر کبھی'' اس کی ہمت بڑھ گئی۔ اس نے کہا'' اچھا تو پھر وعدہ؟؟'' رضیہ نے کوئی جواب نہیں دیا مگر مسکرائی اور پھر کافی کا پیالہ لبوں سے لگا لیا۔

اس کے بعد اسے اس کا موقع تو نہیں ملا کہ رضیہ سے اس موضوع پر بات کرتا مگر ایسا لگتا تھا کہ ان کے درمیان برف پگھل گئی ہے۔ وہ اس سے کبھی کبھی مسکرا کر بات کر لیتی تھی اور حامد بھی کوشش کرتا تھا کہ اس کے ساتھ چند لمحے اسٹاف روم کی تنہائی میں نصیب ہو جائیں۔ رضیہ کے خیال نے اسے جکڑ لیا تھا۔ وہ اپنی تنہا راتوں میں اس کے متعلق سوچ نے لگا تھا۔ اسکا خیال حامد کی رات کے ریشمی اندھیرے میں جیسے ایک خوشبو بکھیر دیتا۔ حامد کو اسکے قدموں کی چاپیں سنائی دیتی تھیں اگرچہ وہ جانتا تھا کہ صرف یہ اس کے اپنے ذہن اور تصور کی فریب کاری ہے ورنہ وہ تو اس سے اتنی ہی دور ہے جتنی روز اول تھی۔

شہر کے مغربی جانب کچھ میل دور ایک نہر بہتی تھی۔ شہر کے اسکول و کالج کے طلبہ اس کے کنارے پکنک منانے جاتے تھے۔ حامد نے تو صرف اسکے بارے میں سنا ہی تھا کبھی وہاں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ طلبہ کی سوشل سوسائٹی نے وہاں پکنک منانے کا پروگرام بنایا۔ بسوں میں بھر کر طلبہ اور اسٹاف اس کے کنارے پہنچے۔ خیمے لگائے گئے، کھانے کی دیگیں چڑھیں اور کچھ لوگ تیراکی کے لئے نہر میں اتر گئے۔ خواتین نے بھی دو درختوں کے درمیان نیٹ باندھ کر بیڈمنٹن کھیلنا شروع کر دیا۔ حامد نے سن رکھا تھا کہ رضیہ ایسی کسی تفریح میں کبھی شریک نہیں ہوتی مگر لوگ حیران تھے کہ آج وہ بھی ان میں شامل تھی لیکن وہ حسب دستور سب سے الگ تھلگ، خاموش اور سنجیدہ تھی۔ ایسا لگتا تھا اسکا دل مر چکا ہے۔ نہر کے دونوں جانب پیپل اور نیم کے گھنے درخت تھے جنہوں نے اس پر ہریالی کی ایک سرنگ بنا دی تھی۔ کبھی کبھی طوطوں کا ایک غول ٹیں ٹیں کرتے ہوئے ان درختوں سے اڑ جاتا تھا۔ نہر کے پانی میں کنارے کی ریت اور مٹی ملی ہوئی تھی اور کچی زمین کی سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ موسم خوشگوار تھا اور بہت ہی خنک اور لطیف ہوا روح میں ایک تازگی کا احساس دلا رہی تھی۔ اس نے دیکھا تھوڑی دور رضیہ پیپل کے ایک گھنے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے زمین پر تنہا بیٹھی ایک کتاب پر نظریں جمائے تھی۔ اسے یہ موقع غنیمت لگا۔ حامد نے کافی کا ایک کپ اپنے لئے اور ایک اسکے لئے بنایا اور اسکے پاس جا کر کہا'' رضیہ۔۔ یہ دن تنہا بیٹھ نے

کانہیں ہے۔دیکھوسب لوگ کیسے ان لمحات سے لطف اندوز ہورہے ہیں۔میں تمہارے لئے کافی بنا کرلایا ہوں کم ازکم اسے ہی انجوائے کرو۔'' رضیہ نے مسکرا کر دیکھااور حامد کے ہاتھ سے کافی کا پیالہ لے لیا۔ایک چسکی لیکر کہنے لگی:

''آپ نے کافی تو اچھی بنائی ہے کیسے معلوم ہوا کہ میں کتنی شکر پیتی ہوں'' ''بھئی اب اتنے دنوں سے ہم اسٹاف روم میں کافی پی رہے ہیں تو کیا میرا اتنا بھی مشاہدہ نہ ہوگا'' رضیہ نے کوئی جواب نہیں دیااور ایک بار پھر کتاب پر نظریں جمادیں۔ پکنک کا ماحول،شہر سے دوری اور خوشگوار موسم نے شاید حامد کو دلیر بنادیا تھااس نے نہایت بے تکلفی سے اسکے ہاتھ سے کتاب چھین لی اور کہا''رضیہ آج میں تم سے تمہاری کہانی ضرور سنوں گا۔اتنی کم عمری میں تم نے یہ کیسا جوگ لے رکھا ہے۔ایسا لگتا ہے تم نے ہنسنے کی قسم کھا رکھی ہے۔تم تو مسکراتے ہوئے بھی ڈرتی ہو۔یہ کیسی پابندی ہے،تمہیں کس کا خوف ہے؟؟''اس نے حامد کی جانب ایسی نظروں سے دیکھا جیسے ایک زخم خوردہ ہرنی کسی کو دیکھتی ہو پھر اپنے پیر سمیٹ کر دونوں ہاتھ گھٹنوں کے گرد باندھ لئے اور بس سر جھکا لیا۔ایک رندھی ہوئی آواز میں کہنے لگی''حامد صاحب۔۔آپ کیا سننا چاہتے ہیں۔۔'' کچھ دیر خاموشی رہی،پھر آنکھیں حامد کی آنکھوں میں ڈال کر بولی''میں بیوہ ہوں!!'' حامد نے کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ ایک لمحے میں دنیا کیسے بدل سکتی ہے۔اسے ایسا لگا کہ قوس قزح کے جس ست رنگے پل پر وہ چل رہا تھاوہ کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹ کر بکھر گیا ہواور وہ قلابازیاں کھاتے ہوئے کئی فٹ نیچی کھائی میں گر رہا ہو۔جیسے اسکے چہار طرف موجود حسین مناظر آندھیوں کی نذر ہوگئے ہوں۔رضیہ کا چہرہ جو کچھ لمحے پہلے کسی انجانی خوشی سے منور تھااس پر غم کی راکھ اڑ رہی تھی اور اس کے ہونٹ خشک ہوکر بھنچ گئے تھے جیسے وہ اپنی سسکیوں کو روک رہی ہو۔وہ اٹھ کر جانے لگی مگر حامد نے اس کا راستہ روک لیا۔اسے معلوم تھا کہ وہ کسی پیڑ کے پیچھے چھپ کر رونے جارہی ہے'' رضیہ،پلیز میری بات سنو۔۔میں تمہارا دوست ہوں۔مجھے بتاؤ قسمت نے تمہیں اس آزمائش میں کیسے ڈال دیا۔۔دل کا بوجھ بتانے سے ہلکا ہوتا ہے۔مجھ پر اعتماد کرو۔۔پلیز!!''ایک ننھے سے رومال سے،جس میں سے عنبر کی مہک اٹھ رہی تھی رضیہ نے اپنی آنکھوں کو نرمی سے چھوااور ایک بار پھر نظریں اٹھا کر حامد کو دیکھا۔۔جیسے سوال کررہی ہو،آپ کون ہیں۔۔میں کیوں آپ سے یہ سب شئر کرنے پر تیار ہوں۔وہ کچھ نہ بولا صرف،بہت نرمی،بہت آہستگی اور بہت مہذب انداز سے اس نے اپنا ہاتھ رضیہ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔رضیہ نے نظریں جھکالیں اور کچھ دیر، کہ شاید وہ لمحہ ایک سیکنڈ کے ایک ہزارویں حصے سے بھی چھوٹا تھا یا پھر وہ کئی صدیوں پر پھیلا ہوا تھا،اپنا ہاتھ وہیں رہنے دیااور پھر نہایت آہستگی سے اسے اپنی جانب کھینچ لیا۔''حامد صاحب نہ صرف میں بیوہ ہوں بلکہ میرا ایک سات سال کا بچہ بھی ہے جو اب میری کل کائنات ہے۔وہ میری خوشیوں،میری آرزوؤں اور میری زندگی کا مرکز ہے۔میں شائد اسی کو پھلتا پھولتا دیکھنے کو زندہ ہوں ورنہ اب مجھے مزید جینے کی کوئی حسرت یا چاہت نہیں۔'' رضیہ نے بتایا کہ اسکی شادی اگرچہ عزیزوں کے درمیان طے کی گئی شادی تھی مگر وہ محبتوں اور خوشیوں سے بھرپور تھی۔اسکا شوہر بہت نرم دل، محبت کرنے والا اور حساس انسان تھا جس نے اسکو خوش رکھنے کے لئے اپنی زندگی وقف کردی تھی پھر ایک ہی سال بعد ان کے بیٹے کی پیدائش کے بعد تو وہ جیسے اسکا گرویدہ ہوگیا تھااور بار بار اسے گلے لگا کر کہا کرتا تھا کہ بیٹے کی شکل میں اسنے اسے کتنا قیمتی تحفہ دیا ہے۔اس کا شوہر اپنے بیٹے کا دیوانہ تھااور بیٹا بھی اس سے اتنا مانوس تھا کہ باپ کے بغیر نہ تو کھانا کھاتا تھا نہ ہی اسکے تھپکیاں دئے بغیر سوتا تھا۔زندگی خوشیوں کے جھولے میں جھول رہی تھی کہ ایک رات اچانک اسکے شوہر کے پیٹ میں درد اٹھا،ہسپتال پہنچتے پہنچتے اسکی آنت پھٹ چکی تھی اور وہ صبح ہونے تک رضیہ اور اپنے بچے کو اکیلا چھوڑ کر اس راہ پر چل دیا جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔رضیہ نے بتایا کہ اب وہ اپنی ماں اور بیٹے کے ساتھ رہتی ہے۔حامد نے محسوس کیا کہ رضیہ کو اپنے شوہر سے گہری محبت تھی اور اب بھی جبکہ وہ مر چکا ہے اسکی محبت رضیہ کو اپنے حصار میں قید کئے ہوئے ہے۔مزید کچھ کہنے سننے کے لئے نہیں تھا۔رضیہ خاموش تھی،حامد بھی کچھ دیر خاموش رہا،پھر اٹھااور آہستہ آہستہ قدم رکھتا اس طرف چل دیا جہاں رونق تھی قہقہے تھے اور جہاں کھانا تقسیم ہونے والا تھا۔

وہ رات حامد پر بھاری تھی۔ایک بے نام سی بیچینی تھی جو اسے سونے نہیں دیتی تھی۔بار بار سفید لباس میں ملبوس رضیہ کا سراپا اس کے سامنے آجاتا تھا۔اسے کمرے میں اسکے قدموں کی چاپ سنائی دیتی تھی۔وہ اسکے لباس کی سرسراہٹ اور اسکے وجود کی خوشبو کو محسوس کرسکتا تھا۔۔پھر کہیں سے آواز آتی ''مگر وہ بیوہ ہے'' پر اسکا دل کہتا تو کیا ہوا ہمارے مذہب میں تو بیواؤں سے نہ صرف شادی کی اجازت ہے بلکہ اسے تو قابل ستائش سمجھا جاتا ہے۔وہ سوچتا،زندگی کے سفر میں رضیہ کو بھی تو کسی ساتھی کی ضرورت ہوگی۔۔مستقبل کی طویل اور ان دیکھی راہوں میں ایک لمبا سفر وہ تنہا کیسے کاٹے گی۔میں اسکا ہاتھ تھاموں گا۔اسے سہارا دونگا اسکے زخموں کی درماندگی کرونگا۔خزاں رسیدہ درختوں پر پھر کونپلیں پھوٹتی ہیں پھر شگوفے کھلتے ہیں۔مگر اسکا بچہ؟ حامد نے فیصلہ کیا وہ اس بے باپ کے بچے کو سچا پیار دیگا اسے سینے سے لگائے گا۔انہی خیالوں میں اسے رات بھر نیند نہیں آئی،سارا جسم ٹوٹ رہا تھا،ریشے ریشے میں درد تھا وہ وقت پر کالج بھی نہیں جاسکا۔جب دیر سے کالج پہنچا تو اسکی نظریں رضیہ کو تلاش کررہی تھیں مگر رضیہ کالج نہیں آئی تھی،نہ صرف اس دن بلکہ مزید کئی دن،وہ بے قرار ہو گیا،کیا ہوگیا اسے؟ کیوں کالج نہیں آرہی،معلوم ہوا بیمار ہے۔اس کی بیقراری اور بڑھ گئی۔صبح شام رضیہ کا تصور اسے پریشان وبیچین رکھتا۔چھوٹا شہر تھا سب کو ہر ایک کے گھر کا پتہ تھا اسے یہ تو معلوم ہی تھا کہ رضیہ اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہے،ایک شام اسکی دیوانگی اسے رضیہ کے دروازے پر لے گئی۔اسکی ماں نے دروازہ کھولا۔وہ مہذب خاتون تھیں اسے اندر بلایا۔رضیہ آئی،وہ حسب معمول سفید لباس میں تھی۔لگتا تھا سالوں سے بیمار ہے۔روکھے بال تھے اور آنکھوں میں ویرانی تھی۔اپنے بیٹے کی انگلی پکڑے تھی''آپ نے بڑی تکلیف کی''نہیں رضیہ یہ تو انسانی فرض ہے۔پھر اسکی ماں سے کہنے لگا''اس گھر میں کسی مرد کا وجود نہیں اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھ سے کہہ دیجئے۔'' تھوڑی دیر بیٹھا اور پھر اٹھ آیا۔

''چہارسُو''

رضیہ ٹھیک ہوگئی۔وہ اس کنبے سے مانوس ہوگیا تھا کبھی کبھی وہاں چلا جاتا تھا۔رضیہ کی ماں اس سے شفقت سے ملتیں،رضیہ کچھ لئے دئے رہتی مگر وہ بھی رفتہ رفتہ اس سے بے تکلف ہوتی جارہی تھی۔اس نے اپنے گرد جو فصیل بنائی تھی شاید اس میں دراڑیں پڑنے لگی تھیں۔مگر حامد محسوس کرتا تھا کہ کوشش کے باوجود اسکا بچہ اس کے پیار،اسکی توجہ کا جواب نہیں دیتا تھا بلکہ اس کو خوشمگیں نظروں سے دیکھتا تھا۔حامد اس کے لئے کھلونے لاتا،اس کے ساتھ گیند بلا کھیلنے کی کوشش کرتا مگر وہ پھر بھی حامد سے چڑھا رہتا جیسے اسے حامد کے وجود سے نفرت ہو۔شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی ماں کی محبت میں کوئی اس کے ساتھ شریک ہو۔اسے حامد کا اپنے گھر آنا اچھا نہیں لگتا تھا۔پھر بھی جب کبھی حامد کو موقعہ ملتا تو وہ رضیہ سے کہتا ''رضیہ۔۔میں تمہارا سہارا بننا چاہتا ہوں۔۔زندگی کی ان سنسان راہوں پر تمہیں ایک ساتھی کی ضرورت ہے'' وہ کہتی ''حامد صاحب آپ بیکار کوشش کررہے ہیں، میں ایک اجڑا گلشن ہوں جس میں کبھی بہار نہیں آسکتی، میں ایک ایسا گھر ہوں جو اب کھنڈر بن چکا ہے۔اب یہاں صرف تاریکی کا راج ہے۔اب اس میں قہقہے نہیں گونج سکتے'' وہ کہتا نہیں رضیہ میں اپنے خون سے اس گلشن کی آبیاری کرونگا، ان ٹنڈ منڈ درختوں پر پھر کونپلیں پھوٹیں گی، میں اس گھر میں خوشیوں کے دئے روشن کرونگا یہاں پھر قہقہے گونجیں گے'' مگر وہ چپ رہتی۔

مگر تنہا ئی کے لمحوں میں رضیہ کو بھی اپنی ویران زندگی کا خیال آتا تھا، سردیوں کی طویل راتوں میں وہ اپنے بستر میں غیر ارادی طور پر کسی کا ساتھ تلاش کرتی، دن بھر کے کام اور مشقت کے بعد شام واپسی پر دل چاہتا کوئی اس کا مسکرا کر استقبال کرے اور وہ کسی سے دن کا احوال سنا کر اپنا بوجھ ہلکا کرے۔اپنی اداس زندگی میں اسے دور دور تک ایسا کوئی موڑ نظر نہ آتا تھا جہاں خوشیاں اسکا انتظار کررہی ہوں،مگر اسے اپنے موجودہ حالات کا بھی علم تھا، وہ بیوہ ہے، پھر اسکا بچہ اسکی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔اسے بڑی تکلیف سے یہ بات یاد آتی کہ سب کے بتانے پر اسکے بیٹے کو اس کا یقین ہوگیا تھا کہ ابو کہیں دور چلے گئے ہیں۔ اس کے ننھے ذہن نے سوچ لیا تھا کہ وہ ضرور واپس آئینگے اسی لئے جب کچھ دنوں کے بعد رضیہ اور اسکی ماں نے سوچا تھا کہ وہ اس شہر کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں تو اس کے بچے نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا تھا کہ ہم یہ گھر نہیں چھوڑینگے کیونکہ جب ابو واپس آئینگے تو انہیں کیسے معلوم ہوگا کہ ہم کہاں چلے گئے ہیں۔اسی وجہ سے یہ لوگ اب بھی اسی گھر میں تھے۔حامد ایک اچھا سہارا تھا وہ اسکی جانب کچھ مائل بھی ہوگئی تھی مگر اسکا بچہ کسی نئے ابو کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔اسکی ذمہ داری اسکا بچہ تھا۔مائیں ہمیشہ سے بچوں کے لئے اپنی خوشیاں،اپنی نیندیں اور اپنے آرام قربان کرتی رہی ہیں۔۔وہ بھی اپنے بچے کے لئے اپنی خوشیوں سے منہ موڑ لے گی،اپنی تنہائی کو گلے لگالے گی۔

ایک دن جب بارش پڑ رہی تھی اور ماحول کہر آلود تھا،حامد رضیہ کے بر آمدے میں لمبی کرسی ڈالے ایک گرم اور مہکتی ہوئی چائے کا مزہ لے رہا تھا رضیہ اسکے پاس آکر کرسی کے ہتھے پر بیٹھ گئی۔اس نے حامد کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جس میں طوفان کی آمد آمد تھی۔حامد کا دل دھڑکنے لگا۔وہ کیا کہنا چاہتی ہے؟؟۔کچھ دیر ایک پراسرار خاموشی رہی، پھر کہنے لگی ''حامد صاحب میں اس وقت زندگی کے دوراہے پر ہوں۔کئی بے خواب راتوں کے باوجود میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پائی ہوں۔مجھے معلوم ہے کہ میں جو بھی فیصلہ کرونگی اس پر مطمئین تو نہیں ہونگی مگر اب فیصلے کی گھڑی آ پہنچی ہے۔صرف وقت ہی یہ بتا سکے گا کہ یہ فیصلہ صحیح ہے یا نہیں مگر میں نے فیصلہ کرلیا ہے''۔۔حامد کے ہاتھوں میں تھامی ہوئی چائے کی پیالی کپکپانے لگی۔اس نے رضیہ کو ایسی نظروں سے دیکھا جن میں رحم کی درخواست تھی مگر رضیہ بولتی چلی گئی اس نے حامد کو بتا دیا کہ اسکا خیال چھوڑ دے۔وہ اس بات پر تیار نہیں کہ وہ اپنے بچے کو کسی ذہنی انتشار میں مبتلا کرے۔اس نے محسوس کیا ہے کہ حامد کی موجودگی اسکے بچے کو اندرونی غصے اور حسد میں مبتلا کردیتی ہے۔اب اسکی اولیں ذمہ داری اسکا بچہ ہے، جب تک وہ بڑا ہوکر اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوجاتا وہ کسی اور جانب دیکھنا نہیں چاہتی۔فی الحال انکا ساتھ ممکن نہیں۔حامد کو محسوس ہوا کہ اس کے خوابوں کے سارے محل چکنا چور ہوگئے ہوں مگر وہ سنبھلا اور اس نے صرف اتنا کہا۔۔''رضیہ میں کائنات کے آخری لمحے تک تمہارا انتظار کرونگا'' وہ کرسی سے اٹھا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس سے دور ہوگیا۔

اس کے بعد حامد دل شکستہ ہوکر وہ شہر چھوڑ آیا تھا اور اس نے پھر پلٹ کر اس شہر کی جانب کبھی نہ دیکھا۔مگر دونوں نے اس تمام عرصے ایک دوسرے سے رابطہ رکھا تھا اور وہ اب بھی خلوص سے ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہے تھے۔۔اب کئی سال بعد جب اسکا بچہ بڑا ہوکر ملک سے باہر چلا گیا تھا اور وہاں ہمیشہ کے لئے سیٹل ہوگیا تھا حامد کو رضیہ کا خط ملا تھا۔ایک عام سا خط تھا مگر حامد کو ایسا لگا کہ اس میں ایک پیغام چھپا ہو شاید اب زندگی کے آخری دور میں رضیہ کو اپنی تنہائی کا احساس ہوگیا تھا۔شائد اتنے عرصے بعد اس سوکھے اجڑے درخت پر پھر پھول کھلنے والے تھے۔

نارسائی

1906 سے پہلے کوئی اہلِ حدیث نہیں تھا
1896 سے پہلے کوئی بریلوی نہیں تھا
1867 سے پہلے کوئی دیوبندی نہیں تھا
250 ہجری سے پہلے کوئی حنبلی نہیں تھا
200 ہجری سے پہلے کوئی مالکی اور شافعی نہیں تھا
150 ہجری سے پہلے کوئی حنفی اور جعفری نہیں تھا
جبکہ حضور نبی کریم ﷺ کا اس دنیا سے چلے جانے تک کوئی سنی شیعہ نہ تھا البتہ مسلم ضرور تھے جو آج کے دور میں شائد کہیں کھو گے ہیں۔

☆

سرفروشی کی تمنّا

رینو بہل
(چنڈی گڑھ)

برآمدے میں سلطان کے مسلسل بھونکنے کی آواز سن کے پرکاش کور نے باہر نکل کر دیکھا تو چاروں طرف گھنے کُہرے کی پھیلی چادر میں کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ شام سات بجے ہی اُس نے سات فٹ لمبے لوہے کے گیٹ پر تالا ڈال دیا یہ جانتے ہوئے کہ تالا انسان اپنی تسلی کے لیے لگاتا ہے ورنہ چوروں کو نہ بند دروازے اور نہ ہی دروازوں کے قفل روک سکتے ہیں۔ جنوری کی ٹھٹھرتی سردی اور کُہرے کی گہری پرتوں نے گاؤں کے لوگوں کو گھر کے اندر ہی رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ گاؤں کے کم سے کم پچاس ساٹھ مرد تو اس وقت گاؤں میں موجود بھی نہیں اور ایسے میں شرابی، نشیڑی، چور اُچکے ان گھروں کو نشانہ بنا سکتے ہیں جہاں صرف بچے اور عورتیں ہی ہوں۔ ویسے پرکاش کور ایسے لوگوں سے ڈرنے والی تو ہے نہیں۔ ریٹائرڈ صوبیدار حُکم سنگھ کی بیوی اور دو فوجی جوانوں کی ماں کو اپنے گھر اور کھیتوں کی حفاظت کرنی خوب آتی ہے۔ خونخوار سلطان بھی کہاں کسی کو بخشنے والا ہے۔ پھر بھی حالات اور موسم کی نزاکت دیکھتے ہوئے اُس نے کبھی بھی احتیاط کا دامن نہیں چھوڑا۔

ویسے تو پانچ ایکڑ زمین صوبیدار حُکم سنگھ کے نام ہے مگر اس کی اصل مالک پرکاش کور ہی ہے۔ تیس سال حُکم سنگھ فوج میں رہا اور زمینوں کا کام پرکاش کور کی نگرانی میں ہوتا رہا۔ حُکم سنگھ کی پوری کوشش ہوتی کہ گندم اور دھان کی بوائی اور کٹائی کے وقت کچھ دنوں کی چھٹی لے کر گھر آ جائے تاکہ پرکاش کا ہاتھ بٹا سکے۔ وہ جب چھٹی پر آتا پوری طرح کسان کے فرض نبھاتا مگر پرکاش کور کی مرضی کے خلاف زمین کے کاموں میں کبھی دخل نہ دیتا۔ پرکاش کسان کی بیٹی تھی اور کاشت کاری اُس کی رگوں میں تھی۔ حُکم سنگھ کی ایک ہی خواہش تھی کہ اُس کے دونوں بیٹے کے نام بھی اُس کی طرح فوج میں بھرتی ہوں۔ دونوں بیٹوں کے نام بھی اُسی نے رکھے۔ بڑا جرنیل اور چھوٹا میجر۔ بچپن سے ہی دونوں کے دل و دماغ میں فوج میں جانے کا خیال گُوٹ گُوٹ کر بھر دیا تھا۔ اُن کا باپو اُن کا ہیرو تھا۔

باون سال کی عمر میں صوبیدار حُکم سنگھ ریٹائر ہو کر گھر لوٹا تو پرکاش کور نے کھیتوں کی ساری ذمہ داری صوبیدار کو سونپ دی۔ اب وہ کھیتوں پر کم ہی جاتی تھی البتہ گھر کے ساتھ لگی زمین پر دال، سبزیاں وہ ہی دیکھتی تھی۔ صوبیدار کے جتھے کے ساتھ جانے کے بعد کھیتوں کی پوری نگرانی پھر اُس کے ذمہ آ گئی تھی۔ ویر کو جب پتہ چلا کہ دار جی جتھے کے ساتھ دلّی جا رہے ہیں تو وہ بھی ضد پر اڑ گیا تھا۔

''میں آپ کے ساتھ جاؤں گا دار جی۔ ضرور جاؤں گا۔''

''تم گھر پر رہو گے ویر۔ کوئی مرد تو گھر پر ہونا چاہیے نا۔''

صوبیدار نے پانچ سال کے ویر کے کاندھے پر پیار اور اعتماد کی تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

''دار جی ہماری بے بے کسی مرد سے کم ہے کیا؟ میں تو ساتھ جاؤں گا۔ جاؤں نا ماں؟'' سمرن سے لپٹتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

''مجھے تنگ نہ کر ویر روٹی جل جائے گی۔ تو وہاں جا کر صرف دار جی کے لیے مصیبت بنے گا۔''

''دھی رانی ویر میرے لیے مصیبت نہیں بن سکتا تو اپنے دل کی بتا دے۔ تیرا دل لگ جائے گا اس کے بغیر؟''

''دار جی اگر آپ کے ساتھ نہ گیا تو ہمارا جینا محال کر دے گا۔''

''بالکل باپ پر گیا ہے۔ جرنیل بھی اسی طرح ضد کرتا تھا۔'' جرنیل کا ذکر آتے ہی سمرن کا تمتماتا چہرہ مرجھا گیا۔ کمرے میں افسردگی چھا گئی۔ پرکاش کور کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے مگر اُس نے ضبط کر کے ایک بھی قطرہ چھلکنے نہیں دیا۔ صوبیدار ویر کا ہاتھ پکڑ کر خاموشی سے وہاں سے اُٹھ کر باہر نکل گیا۔ ہر کوئی اندر سے ٹوٹا ہوا تھا مگر کوئی کسی کو اپنا زخم دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ جرنیل نے جو زخم دیا تھا وہ تا عمر بھرنے والا نہیں تھا۔

جرنیل سنگھ چھ فٹ کا سجیلا جوان جب فوجی کی وردی پہن کر ماں کے سامنے آتا تو ماں واری نیاری جاتی۔ اپنی ہی نظر سے بچانے کے لیے چوری چوری اُس کی نظر اتارتی۔ ماں جانتی تھی کہ گاؤں کی کنواریاں کیا شادی شدہ بھی اُس پر نظر لگائے بیٹھی ہیں۔ اُسے دیکھ کر کیسے ٹھنڈی آہیں بھرتی ہیں۔ اس کا احساس جرنیل کو بھی تھا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر مند مند مسکراتے ہوئے موچھوں کو تاؤ دیتے ماں نے کئی بار اُسے دیکھا تھا۔ وہ تو اس تاک میں تھی کہ بیٹے کے ٹکر کی لڑکی مل جائے تو وہ جلد ہی اُسے بہو بنا کر گھر لے آئے۔ سمرن کو دیکھتے ہی اُس کی مراد پوری ہو گئی۔ جرنیل پہلی نظر میں ہی اُس کا عاشق ہو گیا۔ سمرن خوبصورت بھی تھی اور خوب سیرت بھی۔ شادی کے کچھ دنوں بعد ہی وہ سب سے ایسے گھُل مل گئی جیسے برسوں سے اس گھر کا حصّہ ہو۔ اُن کی جوڑی دیکھ کر ایسے لگتا جیسے رب نے ایک دوسرے کے لیے ہی بنایا ہو۔ جرنیل ڈیوٹی پر لوٹ گیا تو اُس نے بھی گھر کی ذمہ داریوں میں بے بے اور کھیتوں پر باپو کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ سال بعد ہی ویر نے اُس کی زندگی میں آ کر اُس کی مصروفیت اور بڑھا دی۔

دو سال بعد سمرن اپنی چھوٹی بہن گُل کو اپنی دیورانی بنا کر گھر لے آئی۔ میجر سنگھ نے بھابی کی پسند کو آنکھ موند کر قبول کر لیا۔ دونوں بہنوں نے گھر کی ذمہ داری اچھے سے سنبھال لی۔ گھر میں جو بیٹی کی کمی تھی وہ دونوں کے آتے ہی پوری ہو گئی۔ اگر اولاد نیک اور فرماں بردار ہو تو زمین پر ہی جنت کی مراد پوری ہو جاتی ہے۔ اُن کا گھر بھی کسی جنت سے کم نہ تھا۔

ویر کے تین سال بعد میجر سنگھ کے گھر بیٹی پیدا ہوئی تو گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ پرکاش کور نے سارے گاؤں میں دیسی گھی کے لڈو بنوا کر بانٹے۔ ویر نے ہی اُس کا نام نِکی رکھا اور سارا دن نِکی نِکی کرتا اُس کے اردگرد ہی منڈلاتا رہتا۔

پھر نہ جانے اس گھر کی خوشیوں کو کس کی نظر لگ گئی۔ پرکاش کور کی کوکھ میں آگ کیا لگی اُن کی جنت جل کر راکھ ہوگئی۔ گھر کے کونے کونے سے گونجتے قہقہے سسکیوں میں بدل گئے۔ مسرتیں دریچوں سے رُخصت ہوئیں تو غموں نے دروازوں سے گھُس کر گھر کے کونے کونے میں قبضہ جما لیا۔ ۱۶۔ جون کی وہ چندری صبح جب جرنیل سنگھ کی سِکھ بٹالین سے فون آیا کہ نائیک صوبیدار جرنیل سنگھ رات وادی گلوان میں چینی فوجیوں کے ساتھ ہوئی خونی جھڑپ میں شہید ہوگیا۔ دو دن بعد جب چھ فٹ کا سجیلا جوان تابوت میں بے حس پڑا گاؤں لایا گیا تو اُسے خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے نہ صرف اُس کے گاؤں بلکہ آس پاس کے گاؤں کے لوگ ایسے اُمڈ آئے تھے جیسے اُن کا اپنا کوئی عزیز رخصت ہو رہا ہو۔ اُس وقت پرکاش کور نے نہ صرف خود کو سنبھالا بلکہ سمرن کو بھی ٹوٹنے نہیں دیا۔ مضبوط ڈھال بن کر اُس کے پیچھے کھڑی رہی۔ پورے ریاستی اعزاز کے ساتھ جرنیل کو وداعی دی گئی۔ صوبیدار کا ہاتھ تھام کر پانچ سال کے ننھے ویر نے باپ کی چِتا کو نم آنکھوں سے اگنی دی۔

اس دن کے بعد گھر کا ماحول بدل گیا۔ حالانکہ کوئی کسی کے سامنے آنسو نہیں بہاتا تھا مگر رات کے سنّاٹے میں سمرن کے کمرے سے تو کبھی پرکاش کور کے کمرے سے سسکیوں کی آوازیں صوبیدار کو بے چین کر دیتی تھیں مگر وہ کروٹ بدل کر آنکھیں موندے خاموش پڑا رہتا۔ ایک روز اُس نے پرکاش کور کو صبح اٹھتے ہی کہا تھا:

''تجھ سے اک ضروری بات کرنی ہے مگر وعدہ کر میری بات سُن کر کچھ نہیں کہے گی صرف میرا ساتھ دے گی۔''

''آج تک کبھی کسی بات کی مخالفت کی ہے بھلا جو یہ کہہ رہے ہو؟ جو دل میں ہے کہہ دو۔''

''جرنیل کی برسی کے بعد سمرن کو رخصت کر دوں گا۔''

''مطلب؟'' اُس نے چونک کر شوہر کو دیکھا۔

''بیٹی بنا کر اس گھر سے رخصت کروں گا۔ ابھی عمر ہی کیا ہے اس کی۔ ہم کب تک بیٹھے رہیں گے؟ اسے ایک ساتھی ایک محافظ کی ضرورت تو ہوگی''

''اور ویر؟ کیا وہ یہ سب قبول کرلے گا؟ کیا اُسے خود سے دور کر سکتے ہو؟''

''ابھی ویر پانچ سال کا ہے اُسے سمجھایا جا سکتا ہے تھوڑا وقت اور گزر گیا تو مشکل ہو جائے گی۔''

''تم کیا سوچتے ہو سمرن مان جائے گی؟ مجھے تو امید نہیں۔''

''اُسے منانا تیرا فرض ہے پرکاش۔ مجھے یقین ہے تو یہ کام بخوبی کر لے گی۔''

''مجھ سے نہ ہوگا یہ سب'' اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

''ہمت کر مضبوط بن۔ تجھے اس طرح رونا زیب نہیں دیتا تُو تو گھر کا مضبوط ستون ہے تو کمزور نہیں ہو سکتی۔''

اُس کی آنکھیں برستی رہیں۔ ایک ماں کب تک خود پر بند لگا سکتی ہے؟ صوبیدار نے اُسے چپ کرانے کی کوشش نہیں کی۔ اگر بند ٹوٹ ہی گیا ہے تو سیلاب کے ساتھ دل کا درد بہہ جائے تو اچھا۔

زندگی کو تو ہر حال میں چلتے رہنا ہے اسے کیا غرض بندوں کے سُکھ سے یا دُکھ سے۔ اسے کیا معلوم کہ دُکھ کا وقت کاٹے نہیں کٹتا اور سُکھ کے لمحے پنکھ لگا کر اُڑ جاتے ہیں۔ کسی کے چلے جانے سے کچھ بھی نہیں رُکتا بس جانے والا ایک خلا پیدا کر جاتا ہے جو کبھی پُر نہیں ہوتا۔

زندگی رینگتی ہوئی آگے بڑھنے لگی تھی۔ پرکاش کور اور گُل نے سمرن کو سنبھال لیا تھا۔

پھر اچانک ایک روز ایسا زلزلہ آیا کہ کسانوں کی زندگی درہم برہم ہو گئی۔ سرکار کے نئے قوانین نے کسانوں کی زندگیوں اور اُن کے آنے والی نسلوں کے مستقبل کو لے کر انہیں سوچنے اور اُن قوانین کو رد کروانے کے لیے مخالفت پر مجبور کر دیا۔ اگر کسانوں کے فائدے کے لیے یہ قوانین لاگو کیے جا رہے ہیں تو انہیں بناتے وقت کسانوں کو اعتماد میں کیوں نہیں لیا گیا؟ اُن کی رائے اُن کی رضا مندی بھی تو لینی چاہیے تھی۔ جمہوری ملک کے باشندوں پر یہ حکم تھوپے نہیں جا سکتے۔ سب کو محسوس ہو رہا تھا کہ اگر یہ قوانین عائد کر دیے گئے تو آنے والے کچھ سالوں میں کسان صرف سرمایہ دار اور بڑے کارپوریٹس کے رحم و کرم پر جینے پر مجبور ہو جائے گا۔ ٹھیکے پر کاشت کرنے والے کسان اپنی شناخت کھو دیں گے وہ محض مزدور بن کر رہ جائیں گے۔ انہیں یہ خوف تھا کہ آنے والے حالات انہیں گاؤں چھوڑ کر شہر کی طرف بھاگنے پر مجبور کر دیں گے اور وہاں جا کر مزدوری کے علاوہ وہ کچھ کر نہیں پائیں گے۔ دھیرے دھیرے اُس کا رشتہ اپنی زمین، اپنے گاؤں، اپنے پُرکھوں، اپنی وراثت سے ٹوٹ جائے گا۔ اُس کی شناخت گم ہو جائے گی اور یہ وہ کبھی کسی حال میں ہونے نہیں دیں گے۔ مخالفت ہونے لگی، احتجاجی مظاہرے ہونے لگے۔ یہ سرگرمیاں تیز ہوئیں تو مخالف سیاسی پارٹیاں بھی اس آگ میں کود پڑیں۔ کسان لیڈروں نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہاں صرف کسان اور اُس کے حق کی بات ہوگی۔ دھیرے دھیرے غصے کی آگ ایک ریاست سے دوسری اور پھر تیسری اور ملک کے کئی حصوں میں پھیلنے لگی۔ پنجاب کے کسان بھی جان ہتھیلی پر لے کر اس آگ میں کود پڑے۔

نئے قوانین کے خلاف احتجاجی مظاہرے شروع ہوئے تو ہزاروں کی تعداد میں کسان گاؤں سے جتھے بنا کر دلّی کی طرف نکل پڑے۔ اُن کے راستے روکے گئے، کڑکتی سردی میں اُن پر پانی برسایا گیا، لاٹھی چارج ہوا مگر اُن کے قدم نہیں رُکے۔ ہر رُکاوٹ پار کرتے دلّی کو چاروں طرف سے گھیرنے میں کامیاب ہوگئے۔ مقصد صرف نئے قوانین کو پُرامن طریقے سے رد کروانا ہے۔

اُن کے گاؤں سے پہلا جتھا صوبیدار کی نگرانی میں جب دلّی کے لیے روانہ ہوا تو گاؤں کی سرحد تک نعروں کی گونج میں اُنہیں رخصت کیا گیا۔ گاؤں سے دس ٹرالیاں مزدروں، کسانوں اور راشن سے بھر کر نکلیں۔ ہر گھر سے کوئی نہ کوئی مرد ضرور گیا تھا۔ عورتوں نے مردوں کو جاتے ہوئے کہا تھا کہ ''پیچھے کی فکر مت کرنا۔ ہم گھر اور کھیت سب سنبھال لیں گے تم فتحیاب ہو کر آنا۔''

انہوں نے بھی یقین دلایا تھا:

''کفن سر پر باندھ کر چلے ہیں۔ جب تک بات نہ بنی ڈیرہ وہیں لگا ئیں گے۔ پورے سال کا راشن لے کر چلے ہیں۔اب تو بس جیتے گے یا مریں گے۔''

دارجی کے جانے کے بعد ویر دو تین گھنٹے تو روتا رہا پھر بکی کے ساتھ مست ہو کر سب بھول گیا۔

کھیتوں میں گیہوں کی فصل بوئی ہوئی تھی۔ پندرہ بیس دن بعد ہی یوریا چھڑکنے کی ضرورت تھی جس کے لیے گاؤں میں مزدور آسانی سے مل جاتے ہیں۔ تین چار گھنٹوں میں اپنی نگران میں پرکاش کور نے یہ کام مکمل کروا دیا اور ہفتے بعد انہیں دوبارہ آنے کو کہہ دیا۔

بیس دن بعد گاؤں سے دوسرا جتھا بھی روانہ ہو گیا جس میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ وہاں کی ایک ایک خبر دنیا کے ہر کونے میں پہنچ رہی تھی۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ملک سے بھی بھاری تعداد میں لوگ اس مہم سے جُڑ رہے تھے۔ دسمبر کی کڑکتی سردی بھی اُن کے جذبات کو ٹھنڈا نہیں کر پائی تھی۔ ٹھٹھرتی سردی میں لوگ کھلے آسمان کے نیچے رہنے سے بھی نہیں ہچکچا رہے تھے۔ لاکھوں کی تعداد میں کسانوں کے رہنے کے لیے نئے ٹینٹ، نئے بستر، نہانے کو گرم پانی مختلف اقسام کے لنگر اور ضرورت کی ہر چھوٹی بڑی چیز وہاں دستیاب تھی۔

پُر امن طریقے سے احتجاج ہو رہا تھا۔ کسانوں نے نہ صرف اپنا یوٹیوب چینل شروع کیا تھا بلکہ ایک اخبار بھی وہاں سے نکلنے لگا تھا۔ بچوں کو پڑھانے کا انتظام بھی تھا اور مریضوں کو دیکھنے کے لیے ڈاکٹر بلکہ مِنی ہسپتال بھی۔ کرتن بھی ہو رہا تھا اور کوی دربار بھی سج رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا شہر بسا لیا تھا کسانوں نے۔

جیسے جیسے دن گزر رہے تھے تحریک کا زور بھی بڑھ رہا تھا۔ لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ سرکار کوشش میں تھی کہ کسی طرح دھرنا ختم ہو جائے اور کسان اس بات پر اڑے تھے کہ تینوں قوانین رد کیے جائیں۔ دونوں طرف سے کئی بار بیٹھک ہو چکی تھی پر کوئی بھی جھکنے کو تیار نہ تھا۔ سردی کا قہر بڑھ رہا تھا اور ساتھ ہی کسانوں کا جوش بھی اس حقیقت کے باوجود کہ ساٹھ دنوں میں تقریباً سو سے اوپر کسان اپنی جان کی قربانی دے چکے تھے۔ یہ صرف سو سے زائد کسان ہی شہید نہیں ہوئے تھے ان کے ساتھ جڑے کئی رشتے بھی قربان ہوئے تھے۔ اتنا ہونے کے باوجود حکومت کے کان پر جُوں نہیں رینگ رہی تھی۔ سرکار کے ساتھ جیسے ہی بیٹھک کے دن کا اعلان ہوتا لوگوں کی اُمیدیں بڑھ جاتیں اور ہر نا کام بیٹھک کے ساتھ احتجاج کی لَو اور تیز ہو جاتی۔ نہ صرف کسانوں کے بلکہ انسانیت کے ناطے بھی لوگ دل کھول کر اس مہم کے لیے چندہ دے رہے تھے۔ بیرون ملک میں بیٹھے کسانوں سے جُڑے رشتے داروں سے بھی بھاری تعداد میں رقم آ رہی تھی اسی لیے لاکھوں لوگوں کو کھانے کے ساتھ ہر سہولت مہیا کی جا رہی تھی۔ کسان جتھوں کا یہ انتظام دیکھ کر سیاسی لیڈر بھی سٹپٹا گئے تھے اور اب اس پر سوال بھی اٹھانے لگے تھے۔ ایک نے تو یہاں تک بیان دے دیا کہ ''یہ کسان نہیں خالستانی ہیں۔'' پھر اس کے بعد بہت وبال اٹھا مگر کسانوں نے بات امن کے دائرے سے باہر نہیں جانے دی۔ کسان لیڈروں نے کھل کر کہہ دیا تھا کہ ''۹/۱۱ کے بعد ہر مسلمان کو دہشت گرد کی نظر سے دیکھا جانے لگا تھا اور بھائیو تیار ہو جاؤ اب ہر سکھ کو خالستانی دہشتگرد قرار دیا جائے گا جو ہم قطعی برداشت نہیں کریں گے۔ سرحدوں پر بھی یہ ہی سکھ سینہ تانے کھڑا ہے۔ کبھی کسی سرمایہ دار کی اولاد نے سرحد پر گولی کھائی ہے؟ ایسے بیان ہمارے ارادوں کو کمزور نہیں کر سکتے۔''

اسی بیان کے نتیجے میں کسانوں نے ٹریکٹر ریلی نکالنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ حکومت کو دکھانا چاہتے تھے کہ سبھی کسان سکھ نہیں ہیں۔ اس میں ہندو بھی ہیں مسلم بھی اور عیسائی بھی۔ ہزاروں کی تعداد میں کسانوں نے اس ریلی میں حصہ لے کر اپنی طاقت کا مظاہرہ کر دیا۔ یہ بھی اعلان کر دیا کہ اگر ان کا مطالبہ پورا نہ ہوا تو ۲۶۔ جنوری کو دلّی پریڈ میں ٹریکٹر ریلی نکال کر شامل ہوں گے۔

گاؤں کی عورتوں نے اس ریلی میں حصّہ لینے کے لیے اپنے اپنے نام درج کرانے شروع کر دیے تھے۔ ساٹھ دن سے اُوپر ہو گئے تھے صوبیدار کو دلّی گئے ہوئے۔ وہ بھی گاؤں کی عورتوں کے ساتھ دھرنے پر بیٹھنا چاہتی تھی مگر دونوں لڑکیوں کو اکیلے کیسے چھوڑ کر جائے بس یہ ہی پریشانی اُس کا راستہ روک رہی تھی۔ فتح محمد نے صبح سویرے اس کے گھر آ کر یہ پریشانی بھی دُور کر دی۔

''سنا ہے آپ بھی ٹریکٹر ریلی میں جا رہی ہیں؟''

''ارادہ تو ہے مگر لڑکیوں کی وجہ سے ممکن نہیں لگتا۔ صوبیدار کو کہا ہے کہ کچھ دنوں کے لیے وہ لوٹ آئے تو میں وہاں چلی جاؤں۔''

''آپ گھر اور زمینوں کی فکر مت کرنا میں سنبھال لوں گا۔ بس مجھ پر یہ احسان کر دو کہ نوشین کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔ جب سے بھائی گیا ہے دن رات جانے کی رَٹ لگا رکھی ہے بھلا اسے کسی کے ساتھ کیسے بھیج دوں۔ آپ کے ساتھ جائے گی تو تسلی رہے گی۔''

''میں بات کرتی ہوں آج صوبیدار جی سے۔''

''آپ نام درج کرا دو صوبیدار جی آپ کی کہاں بات ٹالنے والے ہیں۔''

لڑکیوں نے بھی بے بے کو جانے کے لیے زور دیا تو اُسی دن پرکاش کور نے اپنا نام درج کروا دیا اور صوبیدار کو اطلاع بھی دے دی۔ اُس نے بھی کہہ دیا ''میں ایک دو روز میں لوٹ آؤں گا۔ تم اپنی تیاری رکھنا۔ یہ سلسلہ لمبا چلنے والا ہے۔ میں کچھ دنوں بعد پھر لوٹ آؤں گا یہاں۔''

''رب کرے یہ ہمارے سب کے حق میں جلد سے جلد نپٹ جائے۔ سردی بہت ہے تم اپنا خیال رکھنا۔''

''تو فکر مت کر بس سب کے لیے دعا کر۔''

اُسے یاد آیا کہ دادا سناتے تھے کہ ۱۹۰۷ء میں انگریزوں نے دریا کے پانی کے لیے تین قانون بنائے تھے جس سے کسانوں کو پوری طرح غلام بنایا جا سکتا تھا۔ اس کے خلاف کسانوں نے بڑے پیمانے پر احتجاج کیا تھا اس تحریک کو ''پگڑی سنبھال جٹا'' کا نام بھی دیا گیا یہ نام لیل پور سے نکلنے والے اخبار ''جھنگ سیال'' کے مدیر بانکے دیال نے دیا۔ ان کا لکھا یہ گانا ہر عام اور خاص کی زبان پر تھا۔

''چہارسُو''

یہ تحریک ۹ مہینے چلی اور آخر کار انگریز سرکار کو کسانوں کے آگے جھکنا پڑا تھا۔ دلّی کا یہ اندولن بھی سو سال پرانے اندولن سے منسلک ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اُس وقت کسان نے توڑ پھوڑ اور تشدد کا راستہ اختیار کیا تھا مگر اس بار پُر امن طریقے سے احتجاج ہو رہا تھا۔ اُس وقت انگریز حکومت تھی اور اب اپنی حکومت ہے۔ اپنی چُنی ہوئی سرکار نئے قوانین کسانوں پر تھوپ کر انہیں بڑے سرمایہ داروں کا غلام بنانا چاہتی ہے۔ تب نعرہ تھا ''پگڑی سنبھال جٹا'' اور اب کا نعرہ ہے ''جیتیں گے یا مریں گے'' حق کے لیے لڑنا اور مرنا منظور ہے جھکنا نہیں۔

دو دن سے سورج نے شکل نہیں دکھائی تھی۔ شام سے ہی آسمان پر بادل چھا گئے تھے۔ آدھی رات کو جب بجلی کڑکی تو پرکاش کور ہڑبڑا کر اُٹھی۔ کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تیز بارش شور مچا رہی تھی۔

''ہائے ربّا یہ امتحان بھی دینا پڑے گا۔'' اُس کا ذہن سب سے پہلے اُن کسانوں کی طرف گیا جو کڑاکے کی سردی میں کھلے آسمان کے نیچے رات گزار رہے ہیں جن میں جوان بھی ہیں بچے بھی اور بوڑھے بھی۔ اُس کے بعد نیند اس کی آنکھوں سے غائب ہوگئی۔ رات اس کی پاٹھ کرتے گزری۔

اپنے کمرے میں گرم بستر پر بیٹھی وہ خود کو مجرم سمجھنے لگی۔ رات بھر بارش کا رسلسلہ چلتا رہا۔ صبح پَو پھٹنے سے پہلے بارش تھم گئی تھی۔ سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ مسلسل کوشش کے بعد بھی صوبیدار کا فون نہیں لگ سکا۔ گیارہ بجے تک خبر مل گئی تھی کہ رات ٹینٹ کے اندر بارش کا پانی بھر گیا تھا۔ بستر کپڑے سب بھیگ گئے۔ لوگوں کو قریب کے بازار، گرودوارے، مندر، مسجد اور شمشان گھاٹ میں پناہ لینی پڑی۔ لنگر والی جگہ بھی پانی بھر گیا مگر بارش تھمتے ہی سب اپنے ٹھکانے پر لوٹ آئے اور لنگر کا کام پھر سے شروع ہو گیا۔

دھوپ اگلے دن بھی نہیں نکلی سارا دن ہلکی بوندا باندی ہوتی رہی مگر یہ مصیبت نہ تو آنے والوں کی تعداد میں کمی کر سکی اور نہ ہی اُن کا جوش ٹھنڈا پڑ سکا۔

پرکاش کور نے ٹریکٹر کی صاف صفائی کروا کر ایک بار انجن بھی چیک کروالیا۔ بس اب صوبیدار کے آنے کا انتظار ہے۔

رات کو بادل پھر گرجنے لگا۔ اُس کا دل پھر ڈوبنے لگا۔ بے چینی بڑھنے لگی۔ سات بجے سے پہلے ہی اُس نے گیٹ پر تالا ڈال دیا تھا۔ سمرن اور گل کے اصرار پر بڑی مشکل سے ایک روٹی اُس کے حلق سے نیچے اتری۔ کچھ دیر ویر اور ٹکی کی شرارتیں دیکھتی رہی کہ شاید طبیعت سنبھل جائے مگر چت کہیں ٹِک نہیں رہا تھا۔ اپنے کمرے میں آ کر دیر تک دعائیں کرتی رہی۔ سب کی خیر سب کا بھلا بار بار اُس کے دل سے نکلتا رہا۔ رات کے کس پہر اُس کی آنکھ لگی اُسے نہیں معلوم آنکھ تب کھُلی جب سمرن نے اُسے جھنجھوڑ کر اُٹھایا۔ پرکاش کور ہڑبڑا کر اُٹھی۔

''کیا ہوا؟''

آواز سمرن کے حلق میں اٹک گئی۔ سسکیوں کے بیچ فون بے بے کو پکڑاتے ہوئے صرف اتنا کہہ سکی ''دار جی۔'' لرزتے ہاتھوں سے پرکاش کور نے فون پکڑا۔

''ہیلو''

''بھابی کرنیل بول رہا ہوں۔''

''کیا ہوا؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟''

''بھابی صوبیدار شہید ہو گیا'' اتنا کہہ کر، کرنیل سنگھ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''کیا کہہ رہا ہے کرنیل؟'' وہ چیخ کر بولی۔

''دل کا دورہ پڑا اور اُسی وقت اس نے دم توڑ دیا۔''

پرکاش کور لڑکھڑا کر گر ہی جاتی اگر سمرن اُسے تھام نہ لیتی۔ رونے کی آوازیں سن کر گل بھی کمرے میں پہنچ گئی تھی۔ بڑی مشکل سے دونوں نے بے بے کو سنبھالا۔

صبح ہوتے ہوتے پورے گاؤں میں خبر آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ صوبیدار کے گھر آنے سے پہلے سارا گاؤں وہاں موجود تھا۔

سات مہینے پہلے بھی اس گھر سے شہید جوان کی ارتھی اُٹھی تھی جو دشمنوں کے ساتھ لڑتے لڑتے وطن کے لیے شہید ہو گیا اور اب وہ صوبیدار جو کئی لڑائیاں لڑا اور صحیح سلامت گھر لوٹ آیا۔ آج وہ حق کے لیے اپنے ہی لوگوں سے لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔

شام تک میجر سنگھ بھی جموں سے گھر پہنچ گیا تھا۔ جس طرح بیٹے کے انتم سنسکار پر پرکاش کور فخر سے سر اُٹھائے کھڑی تھی بالکل اُسی طرح اپنے شوہر کی شہادت پر بھی اُسے ناز تھا۔ اُسے فخر تھا کہ وہ مٹی سے جڑی ہے، کسان کی بیٹی بھی ہے اور خود بھی کسان ہے۔ فوجی کی ماں اور فوجی کی بیوی۔ اُسے ہمت نہیں ہارنی۔

صوبیدار کی چتا پر نعرے گونج رہے ہیں:

''اب جیتیں گے یا مریں گے۔ جئے جوان جئے کسان''

وہ اپنے شوہر کی شہادت بیکار نہیں جانے دے گی۔ یہ جنگ نہ جانے کتنی لمبی چلے۔ حکومت اسے ناکام بنانے کے لیے کئی طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرے گی۔ صوبیدار کی جگہ اب وہ دھرنے پر حاضری دے گی۔ حق کے لیے اپنوں کی قربانی دینا تو اُن کے گوروؤں نے سکھایا ہے۔

صوبیدار کے چوتھے کی رسم کے بعد پرکاش کور نے نوشین کو بلایا اور کہا:

''تیاری کر لے صبح جتھے کے ساتھ دلّی کے لیے نکلنا ہے۔''

قطرہ

- اگر یہ صاف ہاتھوں پر گرے تو پینے کے قابل ہے۔
- گٹر میں گرے تو پاؤں دھونے کے قابل نہیں۔
- گرم سطح پر گرے تو بخارات بن کر غائب۔
- Lotus کے پتے پر گرے تو موتی کی طرح چمکے۔
- سیپی کے اندر گرے تو موتی بن جاتا ہے۔

مولانا رومیؒ

مٹی کی ٹوکری

جمیل احمد عدیل
(گوجرانوالہ)

اسے اطلاع بروقت ہی مل گئی تھی چناں چہ وہ علی الصباح گھر سے روانہ ہو گیا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا رہا، ہجوم میں غیر معمولی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ دو رویہ سڑک کے دونوں بائیں اطراف میں میلوں تک: بسیں، ویگنیں، کاریں، جیپیں، موٹر سائیکلیں قطار اندر قطار کھڑی تھیں۔ اگر اس کے ساتھ 'خطِ عظمت' قسم کا کوئی مسئلہ لاحق ہوتا تو وہ یہ گمان کر کے اعلا انبساط محسوس کرنے میں حق بجانب ٹھیرتا کہ یہ سب لوگ اسی کی خاطر بھیجے گئے ہیں لیکن وہ نمانا اس نوع کے کسی اختباط کی عیاشی کا کہاں متحمل ہو سکتا تھا! اس کے لیے تو یہ جمِ غفیر پیہم مزاحم ہو رہا تھا، شدید مزاحم! کہ لوگوں کے 'جھنڈ' اسے راستہ دینے کو تیار نہیں تھے۔ وہ جدھر بھی نگاہ ڈالتا نفوس کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر دکھائی دیتا۔ ماب سے تو فرشتے بھی مکالمہ نہیں کر سکتے؛ سو، اس بھگشو کے راستہ مانگنے پہ بھلا کون کان دھرتا! لیکن اس کا پہنچنا بھی ضروری تھا۔ اس لیے اصولاً وہ قصدِ سفر ملتوی کرنے کی بابت کوئی گنجایش پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا طرزِ احساس درست تھا کہ اگر اس موقع پر بھی کوئی نہ پہنچ پائے تو کیسا نانا اور کہاں کا واسطہ! یوں وہ بھیڑ میں گھس کر برابر آگے بڑھنے کے لیے کوشاں رہا۔ اب آدم اس قدر تھا کہ وقت کی گزران اور فاصلے کے درمیان موثر ریاضی معطل ہو چکی تھی۔ ہاں! یہ یقین اس کا ہمسفر رہا کہ وہ منزلِ مراد تک لازماً پہنچ جائے گا کیوں کہ اس کا سبب وابستگی کی قدر تھی۔ وہ وابستگی جو راہی کو اس خاص ساعت کے سپرد کرنے میں اکثر نامراد نہیں رہتی۔ درحقیقت ایسا مخلص مسافر نمایشی شرکت کے لیے عزمِ سفر نہیں باندھتا۔ اس کے من میں متعلقین کو چہرہ دکھانے کی کارروائی سرے سے اپنا وجود نہیں رکھتی۔ اس کی جڑت جذبے میں ڈھل کر اسے عازم بنائے رکھتی ہے۔

بہت پہلے کسی نے اسے بتایا تھا کہ جس میدان میں لوگوں کو جمع کیا جائے گا، اسے محشر کہتے ہیں، لیکن یہاں تو ہر طرف حشر برپا تھا۔ اس نے سر بلند کر کے پیچھے دیکھا تو یہ اندازہ کرنے سے قاصر رہا کہ اتنے لوگوں میں سے گزر کر وہ یہاں تک آ گیا ہے یا اب تک وہیں کھڑا ہے اور اس کے عقب میں مزید لوگ شامل ہو چکے ہیں؟ لگتا تھا کوئی مرد آج گھر میں نہیں رہے گا! جب گنتی اتنی بڑھ جائے کہ اعداد کم پڑنے لگیں تو حاشر اس پریشر کا اثر قبول کیے بغیر کہاں رہ سکے گا! اسے یکدم وہ لوگ یاد آ گئے، جو بے گور و کفن تھے، کوئی ان کے چھلنی ابدان کا پرسانِ حال نہیں تھا۔ ان محسنوں کی احتیاج ردائے خاک سے بڑھ کر تو کچھ نہیں تھی!

ان گھڑیوں میں یہ احساس بھی سوہانِ روح بنا ہوا تھا کہ ان لاکھوں میں وہی اکیلا ہے، جس کے متعلق کراماً کاتبین کو بھی خبر نہیں ہو گی کہ یہ فرد ایک بالکل مختلف مقصد کو لیے اس انبوہ میں شریک ہے۔ یہ اس کی مجبوری تھی کہ اسے ان راستوں پر انحصار کرنا پڑ رہا تھا وگرنہ ان پامال جادوں میں اس کے لیے کیا رکھا تھا! پر جبر جبر ہے، اس سے مفر کہاں ممکن ہے! لہٰذا ان دہکتے مانسوں کا حصہ بنے وہ آگے سرکتا رہا۔

ایسا نہیں کہ آتے ہوئے وہ عجلت میں جوتا پہننا بھول گیا تھا بلکہ اس سفر میں جوتے پہننے کی مناہی آئی تھی۔ اگر کوئی اسے پہچاننا چاہتا تو ننگے پاؤں واضح شناخت تھے مگر اس سمٹنے والے مقام پر کسے فرصت تھی جو اس برہنہ پا کا جائزہ لیتا! اور اسے اب تک یہی طمانیت قائم رکھے ہوئے تھی کہ جوتے نہ پہننے کے باعث ہی وہ لمبے پینڈوں کی کھچل سے بچ جائے گا۔

کھیل تو سارا بیم و رجا کے بیچ مضمر رکھا گیا ہے، یوں یہ جھنجھلاہٹ لاحق ہو کے رہی کہ آج ہی اس ساری مخلوق کو گھروں سے نکلنا تھا؟ دونوں وقوعے الگ الگ دنوں میں بھی تو شیڈول کیے جا سکتے تھے! لیکن واقعات کی ترتیب سے بڑا بھید کہاں متعین ہو سکا ہے! سو، ایسا ہی ہونا تھا، ایسا ہی ہوا! ایک طرف لاکھوں کا جمگھٹا، ایک جانب فردِ فرید! اس صورت حال میں 'مبارزت' اور 'ستیزہ کاری' ایسے بھاری بھرکم الفاظ کے لیے کیا جواز بن سکتا ہے مگر فریقین میں سے فی الحال کوئی پسپا نہیں ہوا تھا کہ موقع کی ماہیت کو تراش ہی ایسی ملی تھی جس کی تقدیر میں دوسری بار درج نہیں کی گئی۔

آخرکار ننگے پاؤں، پورے وجود کو میدان کے مرکزے میں لے گئے۔۔۔ لیکن یہ کیا! وہاں ایک ہی چارپائی رکھی گئی تھی، جو ظاہر ہے خالی نہیں تھی۔ یہی وہ فیصلہ کن مرحلہ تھا، جب اس نے اپنے معاملے کو معرضِ التوا میں رکھنے کا قدم اٹھا لیا اور اس لائن میں لگ گیا جو آخری دیدار کی غرض سے رینگ رہی تھی۔۔۔ جب اس کی باری آئی تو وہاں پھولوں میں گھری سونے کی مورتی کو دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا! اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور اونچی آواز میں پوچھا:

تم میں ابنِ ظفر کون ہے؟

اس جواب کا انتظار کیا جانا ضروری نہیں تھا کیونکہ سانس لیتی طلائی مورتی کا ابلاغ سے تہی تکلم ہی اس بات کا کافی ثبوت تھا کہ ابنِ ظفر وہیں کہیں محوِ تماشا ہے۔ اس نے موجودگان کے جوتوں کی جانب دیکھا تو وہ اپنی غیر معمولی مضبوطی اور چمکاہٹ سے آنکھوں میں گھسے جا رہے تھے، جیسے ہر شخص طول طویل مسافتوں کے لیے تو آمادہ ہے لیکن آس پاس ہی موجود گوہرِ مراد کی ماہیت کو تسلیم کرنا اسے قبول نہیں۔ وہ یہ مشاہدہ کر کے اور حیران ہوا کہ لوگ باگ دائروں کی شکل میں گھوم گھوم کر اور بار بار اس سجی سجائی طلائی مورتی کی زیارت کیے جا رہے تھے۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ تدفین کا عمل پروگرام میں شامل ہی نہیں۔

پھر اس عظیم الشان مجمعے کو یہ سوچتے ہوئے وہ بہت جلد پیچھے چھوڑ آیا کہ اپنی میت کا جنازہ تو کسی بھی وقت پڑھا جا سکتا ہے، اس وقت تک مٹی کی ٹوکری کو ڈھونے میں کیا مضائقہ ہے!!

بٹوارہ

تنویر احمد تماپوری
(ریاض، سعودی عرب)

پو پھٹ رہی تھی۔ آس پاس کے پیڑوں پر پرندے اپنے رب کی حمد وثنا میں مشغول تھے۔ سورج کی نوزائدہ نرم کرنیں وہاں ریشمی سائبان بنا رہی تھیں۔ میرا ہسپتال قلب شہر میں ہونے کے باوجود کافی پرسکون جگہ کہلا سکتا تھا۔ شاید اس لئے کہ یہ کافی بڑے علاقے پر پھیلا ہوا تھا۔ اندر ہی اندر رہائشی عمارتیں، اسکول اور باغات تک موجود تھے۔

میرے کیبن کا عقبی دروازہ ایک برآمدے میں کھلتا ہے۔ یہ اصل عمارت کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اپنے الگ ہونے کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ پچھلی ذیلی سڑک سے منسلک ہونے کے سبب یہاں ہمیشہ معمول کا بھیڑ بھڑ کا نہیں ہوتا۔ شاید بائیں سمت ملحقہ مردہ خانے کی اداسی ہے، جو چوبیسوں گھنٹے ایک یاسیت اور تعزیت، فضا میں نشر کرتی رہتی ہے۔ دن کے وقت اسٹاف، مریض اور ایمبولینس کی آوا جاہی کچھ غنیمت رہتی ہے۔ مگر صبح کے ان اولین ساعتوں میں یہاں شور شرابہ نا ہونے کے برابر تھا۔ نائٹ شفٹ میں نیند کا الٹا پیٹرن، تھکاوٹ اور کسلمندی کو بڑھاتا ہے۔ سر کا بھاری ہونا، آنکھوں کا جلنا، زبان پر جمی کھرنڈ طبیعت کو مکدر سی کر دیتی ہے۔ میں اس وقت ایمرجنسی وارڈ کا انچارج ڈاکٹر تھا۔ رات کی تھکاوٹ اور بیزاری کو بھگانے کے لئے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ضروری تھے۔ بھاپ اڑاتی ہوئی چائے کا ایک کپ تھکے تھکائے دماغ کے فارمیٹ کے لئے کافی ہوتا ہے۔ ساتھ میں ادرک کا تڑکہ ہو تو پورا سافٹ ویر ہی بدل جاتا ہے۔ چائے نے میری طبیعت کسی قدر بحال کر دی۔ وارڈ میں معمول کا ایک چکر میرا آج کا آخری ٹاسک تھا۔ سب کچھ قابو میں تھا۔ ڈیوٹی نرس سے ضروری معلومات کا تبادلہ۔ مریضوں کا مارننگ چیک اپ۔ دواؤں کا انتخاب۔ کچھ ایک کے عزیز و اقارب سے ملاقات اور تسلی۔ روزمرہ کے معمولات سے فارغ ہو کر واپس اپنے کیبن میں پہنچا تو ٹیبل پر صبح کا اخبار میرا منتظر تھا۔

مطالعے کے میرے انہماک کو توڑنے والی ایمبولینس کی آواز تھی جو دیکھتے ہی دیکھتے برآمدے تک پہنچ گئی۔ شاید کوئی ناگہانی صورت حال تھی۔ میں مستعد ہو کر واپس وارڈ کی طرف لپکا۔ شہر کے مشرقی حصے میں کوئی حادثہ ہو گیا تھا۔ تین زخمی تھے۔ دو کو معمولی چوٹ تھی۔ نرس کو ابتدائی مرہم پٹی کا کہہ کر میں تیسرے کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کا ایک ہاتھ زیادہ متاثر ہو چکا تھا۔ شاید ہڈی کو نقصان بھی پہنچا ہو۔ فرسٹ ایڈ کے طور پر پین کلر اور عارضی پٹیوں کے بعد ایکس رے اور ایم، آر۔ آئی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ مریض کی حالت نازک تھی تاہم بروقت ہسپتال تک رسائی نے نقصان کے خطرے کو کافی کم کر دیا تھا۔ میری شفٹ ختم ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر ہونے کے ناطے اس طرح کے حالات میرے لئے حیرت ناک نہیں تھے۔ تاہم ان دوستوں کی خدائی فوجداری میرے لئے متحیر کن ضرور تھی۔ جو اس بار بھی زخمیوں کو بروقت یہاں تک پہنچانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

قدرت بعض لوگوں کو کسی مخصوص کام کے لئے منتخب کرتی ہے۔ میرے یہ بچپن کے دوست بھی اسی خاص گروپ سے متعلق تھے۔ پہلا بشارت احمد، بچپن سے سمارٹ تھا۔ مثبت سوچ اور پڑھا لکھا۔ کالج کے بعد ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازم ہوا۔ خود کے ساتھ کمپنی کی ترقی کو بھی پر لگ گئے۔ چھے ہندسی تنخواہ کا حقدار ہوا تو چار ہندسے خدمت خلق کے لئے اٹھا رکھے۔ دوسرا دوست باقر مرزا ایک کاروباری جوان تھا۔ تجارتی سوجھ بوجھ کا ماہر۔ جو کہتا اس کو جینے کی کوشش کرتا۔ خود بھی کامیاں تھا۔ کاروبار میں ترقی رہی۔ عوامی فلاح و بہبود کے لئے اس نے آمدنی کا ایک بڑا حصہ مختص کر دیا۔ تیسرا دوست سلیم صدیقی غریب طبقے کا ایک عام نوجوان تھا۔ کچھ باپ کی کوشش۔ کچھ سرکاری مدد۔ جوں توں کر کے ڈگری تو مل گئی۔ مگر اچھی کمائی کے لئے خلیجی بے ساکھیوں کی ضرورت پڑی۔ آج چھے سال سے ریال کی کمائی جاری تھی۔ ناوالدین کو کمی محسوس ہونے دی نا اپنے دوستوں کے عظیم مقصد کو نظر انداز کیا۔ یہ تینوں بچپن کے دوست، کلاس فیلو اور پڑوسی تھے۔ کھاتے پیتے اور رہتے بھی ساتھ ہی تھے۔ لڑنا جھگڑنا بھی ساتھ ہی رہا۔ مظلوم اور پریشان حال لوگوں کی امداد ہی ان کا نصب العین تھا۔ ایکسیڈنٹ، فساد، یا پھر قدرتی آفات ہر افتاد کے سامنے سینہ سپر رہتے۔ ان کا ساتھ سلیم کے خلیج جانے پر بھی نہیں چھوٹا۔ اس بیچ اپنی جاب کی وجہ سے میں البتہ رحمت نگر سے یہاں سرکاری کوارٹر میں شفٹ ہو گیا۔ تاہم ان کی خبر مجھے ملتی رہتی تھی۔

زمانہ سرپٹ بھاگ رہا تھا۔ واردات اور طریقہ واردات کیوں پیچھے رہتے۔ ٹیسٹ اور ون ڈے سے ہوتا ہوا اب یہ کھیل ٹونٹی ٹونٹی تک پہنچ چکا تھا۔ فاسٹ فوڈ کے اس دور میں دنگہ فساد نے بھی اپنے انداز بدل لئے تھے۔ اب ماب لنچنگ اور گینگ ریپ کے بھیس میں تانڈو ہو رہے تھے۔ تاہم زخموں پر مرہم لگانے کے متوازی کارخانے بھی چل رہے تھے۔ اور یہ باقر، بشارت اور سلیم جیسے سر پھروں کے مرہون منت تھے۔

دیش بدل رہا تھا۔ سیاست کے داؤ پیچ بھی بدل رہے تھے۔ نئے دور کے نئے راوی نے کچھ الگ ہی تیور اپنا رکھے تھے۔ فلمی ہیرو کی خودکشی بھی ملک بھر میں فسادات کا پٹارہ کھول سکتی تھی۔ اس نئے سچ کے پرانے دنگوں میں مہلوکین کا گراف مہنگائی کی مانند اوپر ہی اوپر جا رہا تھا۔ آسرا دینا، جان بچانا اور عزت کی حفاظت کرنا ان کا اختصاص تھا۔ میں نا صرف ان کے کارنامے سن رہا تھا بلکہ دیکھ بھی رہا تھا۔ کبھی شادگنج میں جھلسے ہوئے امام کا علاج کروانے میں مشغول تو کبھی شانتی نگر کے زخمی پجاری کی مرہم پٹی میں لگے ہوئے تھے۔

رات کا پہلا پہر تھا۔ میری ڈیوٹی کی شروعات تھی۔ سلیم کا فون آیا۔

''چہارسُو''

اس کی آواز ڈوب رہی تھی۔ جان کنی کے انداز میں وہ مجھے مدد کے لئے بلا رہا تھا۔ وہ وطن پہنچتے ہی اپنی ٹیم کے ساتھ خدمت خلق میں جٹ چکا تھا۔ کافی سراسیمہ لگ رہا تھا۔ شہر میں دنگے اپنے شباب پر تھے۔ ایسی حالت میں میرا ہسپتال چھوڑ کر باہر جانا مصلحت کے خلاف تھا۔ مگر مصلحت اور ضمیر کے بیچ کبھی بنی بھی نہیں تھی۔ ایک نرس اور چوکیدار کو ساتھ لیا اور چل پڑا۔ خبروں کے مطابق ان تینوں کو ان کی گاڑی سمیت جلایا گیا تھا۔ سڑکوں پر سائرن اور سرکاری بوٹ دھمک پیدا کررہے تھے۔ راستوں کے دونوں جانب جلے ہوئے دکان اور مکان ماتم کناں اور متحیر کھڑے تھے۔ چاروں طرف پھیلے دھوئیں کے بیچ جابجا جلی ہوئی گاڑیاں کسی ہالی ووڈ کے فلمی سیٹ کے مشابہ لگ رہی تھیں۔ رحمت نگر ناکے پر مجھے دور ہی سے باقر کی گاڑی کا جھلسا ہوا ڈھانچہ نظر آنے لگا۔ گاڑی سے اب بھی یہاں وہاں دھواں نکل رہا تھا۔ پاس ہی کچھ لوگ ایک گول دائرے کی شکل میں جمع کھڑے تھے۔ دائرے کے بیچوں بیچ ایک چادر پر تین جسم اوپر تھلے رکھے ہوئے تھے۔ یا شاید پڑے ہوئے تھے۔ پاس کی گلیوں میں لگ رہے اللہ اکبر اور ہر ہر مہادیو کے نعرے ریڑھ کی ہڈی میں سرہن پیدا کرنے کے لئے کافی تھے۔ چادر پر پڑے کوئلے کے تینوں ڈھیر بالکل ساکت تھے۔ جلے ہوئے ان لوتھڑوں میں حیرت انگیز طور پر چہرے شناخت لائق بچے تھے۔ یہ ان لوگوں کا انجام تھا۔ جن کے بہی کھاتوں میں کئی زندگیوں کو بچانے کا ثواب درج تھا۔ باقر اور بشارت کی حیرت زدہ کھلی ہوئی آنکھیں منجمد ہوچکی تھیں۔ کچھ ان کہی باتیں، کچھ ان سنی سچائیوں کا عکس وہاں پتھر بن کر قید تھا۔ لیکن سلیم کی آنکھوں میں زندگی کی رمق ابھی باقی تھی۔ وہاں ایک ڈراؤنی فلم تھی جو وہ پوری دنیا کو بتانا چاہتا تھا۔ اگر میں ٹیلی پیتھی کا ماہر ہوتا تو شاید وہ کہانیاں چرالیتا۔ اس کی آنکھوں میں اداسی کے ساتھ ایک امید بھی تھی۔ شاید کوئی آئے گا اور جادو کی چھڑی گھمائے گا۔ جیسے وہ گھمایا کرتے تھے۔

وہ میرے دوست تھے۔ میں اپنی ساری قابلیت، اثر و رسوخ، سرکاری طاقت اور اسٹاف کے ساتھ مل کر بھی ان کے لئے کچھ کر نہیں پایا۔ اسّی فیصد جھلسے ہوئے جسم کو دوا کی نہیں دعا کی ضرورت ہوتی ہے۔ سلیم کی آنکھوں میں امید کی روشنی مند ہوتے ہوتے بجھنے لگی۔ میری آنکھوں کی بے بسی کو شاید اس نے پڑھ لیا تھا۔ یہاں الفاظ کا کوئی کام بھی نہیں تھا۔ وہ بول نہیں سکتا تھا۔ میری بولتی بند تھی۔ اس اُداس سناٹے میں صرف اس کی اکھڑتی ہوئی سانسیں ہی گویا تھیں۔ میرے ہاتھوں پیا گیا پانی اس کا آخری گھونٹ ثابت ہوا۔ ایک ہچکی۔۔۔ اور تخلیہ۔ زمین کی بھوک بھی کمال کی چیز ہوتی ہے۔ نامعلوم کتنے آسمانوں کو کھا چکی تھی۔ میں اپنے دوستوں کی یادوں کو تتلیوں کی صورت سنبھال کر وہاں سے اٹھا۔ جو میری ذات پر بے بسی کے گہرے رنگ چھوڑتے جارہے تھے۔

آدھی رات سے پہلے میں واپس اپنے ہسپتال پہنچ چکا تھا۔ اس رات میں ڈیوٹی کے اختتام تک کافی مصروف اور مغموم رہا۔ میری شفٹ کا اختتام ہونے کو تھا۔ آج کی نو زائدہ نرم دھوپ بھی سہمی سہمی سی لگ رہی تھی۔ پرندے حمد و ثنا کے بجائے عزہ داری پر لگے ہوئے تھے۔ آج پہلے جیسا سکون نہیں تھا۔ نا ہسپتال میں، نا شہر میں، نا دماغ میں۔ ایمرجنسی وارڈ سے لے کر مردہ گھر اور شعبہ پوسٹ مارٹم تک ہاری ہوئی فوج کے بیس کیمپ لگ رہے تھے۔ بھاپ اڑاتی چائے میں پہلے والا ذائقہ بھی نہیں تھا۔ نا دماغ کا فارمیٹ ہوا نا سافٹ ویر بدل سکا۔ چائے سے گرا تو اخبار میں اٹکا۔ کہیں آگ زنی تو کہیں چھرے بازی کی خبریں تھیں۔ کسی مندر پر حملہ تو کسی مسجد پر پتھراؤ کے قصے تھے۔ آگے پڑھ نا پایا۔ الفاظ چاقو، چھرے، بشارت، باقر اور سلیم کی شکل میں گڈمڈ ہوکر ناچنے لگے۔ اخبار بند کرکے میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ معمول کے میرے وارڈ کے آخری چکر سے پہلے ایک منظر نے میرے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی۔ وہاں اسی وقت میرے دوستوں کی لاشیں اسپتال کے کمپاؤنڈ میں لائی جارہی تھی۔ اب ان کی کاغذی کارروائیاں اور پوسٹ مارٹم کا سلسلہ شروع ہونے کو تھا۔ مزید رکنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔ میں ٹوٹے دل اور بھاری قدموں کے ساتھ گھر کی طرف چلدیا۔ سارا دن ڈسٹرب رہا۔ نا بیوی سے سیدھی بات ہو پائی، نا بچے کے ساتھ کھیل پایا۔ کھانا۔۔۔ کھانے کو آرہا تھا۔ سونا، سونے سے زیادہ بیش قیمت ہوچکا تھا۔ شام تک بستر پر پڑا اینڈھتا رہا۔

کام کا دباؤ، شہر کے حالات، ایسے میں ڈیوٹی کے اوقات بھی بڑھ چکے تھے۔ جو رات کے بجائے شام ہی سے شروع ہورہی تھی۔ مغرب کے بعد جب کام پر آیا تو تینوں دوستوں کے والدین اور عزیزوں کو پوسٹ مارٹم سینٹر کے باہر روتے ہوئے پایا۔ والدین کے لئے جوان موت سے بڑا کوئی صدمہ نہیں ہوتا۔

قسمت کا یہ رنگ بھی عجیب تھا جب تک تینوں زندہ رہے۔ ساتھ میں رہے۔ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا۔ سونا جاگنا یہاں تک کے مرنا بھی ساتھ ہی رہا۔ لیکن پوسٹ مارٹم نے ان کی دوستی کا بھی پوسٹ مارٹم کردیا تھا۔ بشارت کے جسد خاکی کو احمدیوں کے قبرستان میں پیوند خاک کیا گیا۔ باقر شیعہ شہر خاموشاں میں جا کر سوگیا۔ مگر سلیم کا جنازہ سنّی مقبرے میں ایک نئے تنازعے کا سبب بن رہا تھا۔ میت میں شامل ایک جماعت فاتحہ خوانی پر مصر تھی۔ تو دوسری جماعت اسے بدعت قرار دے رہی تھی۔ کیونکہ ان کے مطابق مرحوم جب سے خلیج میں رہنے لگا تھا رفع یدین کرنے لگا تھا۔

نفسیاتی مریض

مریض (نفسیاتی معالج سے): خوشی مجھ سے روٹھ گئی ہے۔ ہر وقت افسردگی طاری رہتی ہے۔ کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ زندگی بے معنی نظر آتی ہے۔

معالج: آدمی کے لیے سیر و تفریح بھی ضروری چیز ہے۔ ایک کام کرو، شہر میں روسی سرکس آیا ہوا ہے۔ سرکس کے ایک جوکر کا بہت شہرہ ہے۔ سنتے ہیں کہ اس کی مضحکہ خیز حرکتوں سے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ ہفتے میں ایک بار سرکس دیکھ لیا کرو۔

مریض: جی، وہ جوکر میں ہی ہوں۔

☆

لاک ڈاؤن

فرخندہ شمیم
(راولپنڈی)

دو ماہ ہونے کو آ چکے تھے اور ارمغان کی چڑ چڑاہٹ میں کوئی کمی واقع نہیں ہو رہی تھی۔۔۔لاک ڈاؤن کے پہلے دو ہفتے تو ایڈونچر سمجھ کر گزار دیئے تھے کہ چلو روز روز کالج جانے اور پروفیسروں کے لیکچر سننے سے تو ریلیکس ملا، گھر پر آن لائن کلاس لینے کا اپنا ہی لطف ہوتا ہے۔۔۔کچھ چہرے دیکھنے اور کچھ نا پسندیدہ لوگوں سے ہاتھ ملانے کی مجبوری بھی نہیں ہوتی۔۔۔روز روز ڈریسنگ کرنے، بیگ، لیب ٹاپ سمبھالنے اور ٹرانسپورٹ میں خواری کاٹنے سے بھی جان چھٹی رہتی ہے، لیکن جلد پتہ چل گیا کہ یہ ایڈونچر کسی مستقل کیف کا پیش خیمہ نہیں ہے۔۔۔یہ طویل چھٹیاں تو ملکہ ازابیلا کی طرح ہیں، جو دور سے ملکہ اور نزدیک سے کریہہ ہے۔۔۔میرے ملک کے بچوں کو اپنے بڑوں کی شاندار تاریخ پڑھنے سے دلچسپی نہیں ہے ورنہ انہیں بتایا جاتا کہ ہسپانوی سطوت کی بنیاد میں ان کے اسلاف کی شجاعت اور حکمت کا کیا شاندار حصہ رہا ہے؟

میرا بیٹا ارمغان اولیول کی تیاری کر رہا تھا جب پوری دنیا کو اسیری کا حکم ملا تھا۔۔۔اپنے اپنے گھر تک محدود رہنے کا۔۔۔سماجی رابطے توڑنے، نقاب میں چھپ جانے اور خود کو آتے جاتے سپرے اور سینسیٹایزڈ میں رکھنے کا۔۔۔یہ حکم دیکھا جائے تو کوئی نیا نہیں تھا۔۔۔غار حرا سے انسان کو حدود میں رہنے کی تاکید کی جاتی رہی ہے، حیا کی، حجاب کی، منہ سے تھوک اور بدبو نہ پھینکنے کی، لباس پورا پہننے کی، آنکھیں چھپا کر رکھنے کی۔۔۔یہ ڈر بھی سنا دیا کہ باز نہ آئے تو۔۔۔

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

میں اپنے بیٹے کو یہ داستانیں سنانا چاہتی تھی لیکن وہ میرے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔۔۔اس کی جھنجھلاہٹ وباء، لاک ڈاؤن اور قرنطینہ سے شروع ہو کر احتجاج پر ختم ہو رہی تھی۔۔۔مجھے تشویش ہوئی۔

بیٹا! یہ احتجاج کس کے ساتھ ہے آپ کا؟

وہ کچھ نہ بولا

کس کا قصور ہو سکتا ہے؟

پتہ نہیں

پھر بھی، کوئی تو مجرم ہوگا، جس نے یہ عذاب ڈال رکھا ہے۔۔۔

سسٹم، لوگ، حکمران؟

دوبارہ خاموشی

آپ کے پاس لاک ڈاؤن پیریڈ سے گزرنے کا ایک بہت اچھا شیڈول تھا ناں؟

ایک مہینے سے وہی تو کر رہا ہوں ماما۔۔۔پر کتنا کروں، بور ہو گیا ہوں ان سے۔۔۔ریگولر جم کرتا ہوں، آن لائن پڑھتا ہوں، گیمز بھی ساری کھیل لی ہیں، میچز دیکھ چکا ہوں ٹی وی پر۔۔۔اظہر الدین اور عمران خان کے کھیلے کرکٹ ٹیسٹ میچز تک یوٹیوب پر دیکھ چکا ہوں۔۔۔محلے کے لڑکوں کے ساتھ لان اور ٹیبل ٹینس بھی کھیلتے آپ نے مجھے دیکھا ہے۔۔۔ارمغان بتاتا گیا اور بیٹا، اولیولز کے پرچوں کی تیاری؟

لاک ڈاؤن میں، میں نے صرف یہی تو کیا ہے۔۔۔اپ پیپرز سے پہلے ریفریش کر لوں گا سٹڈی۔۔۔میرا بیٹا کافی مطمئن تھا۔

بہت اچھے۔۔۔تو پھر میں۔۔۔آج میں اپنے بیٹے کی بوریت دور کرنے کے لیے کچھ نیا بیک کروں؟۔۔۔مجھے واقعی ارمغان پر بہت پیار آ رہا تھا۔۔۔

مما۔۔۔مجھے سٹرابیری پیزا کھانا ہے۔۔۔ابھی لو۔۔۔بس ذرا نماز پڑھ لوں۔۔۔عصر کا وقت نکلا جا رہا ہے۔۔۔میں نے الماری میں سے جائے نماز نکالی اور زمین پر بچھا دی۔۔۔ارمغان مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔

نماز پڑھ کر میں بیکنگ میں لگ گئی۔۔۔ارمغان نے بہت دلچسپی کے ساتھ پیزا کھایا۔۔۔کافی دنوں بعد اس کے چہرے پر شفق پھوٹی تھی۔۔۔اس کے مرحوم والد بھی کبھی کبھار ایسے ہی سرشار ہو جاتے تھے۔میری والہیت دیکھ کر۔۔۔میری پلکیں گیلی پڑنے لگیں۔ارمغان رات سکون سے سو گیا لیکن دوسرے روز صبح سے پھر وحشت اس پر سوار تھی۔

مما۔۔۔خدا کیلئے بتائیں یہ لاک ڈاؤن کب ختم ہوگا؟

جب ہم سب درست ہو جائیں گے تب؟

درست؟ کیا ہم درست نہیں ہیں ابھی؟

نہیں۔۔۔پچانوے فیصد دنیا درست نہیں ہے

وہ کیسے؟

کیونکہ وہ انسان کو انسان نہیں سمجھتی۔۔۔وہ مٹی کو پاؤں تلے رگڑ ڈالتی ہے۔۔۔جس مٹی سے گھر اور قبر بناتی ہے اسی پر اکڑ کے چلتی ہے۔۔۔ڈرون سے ڈرتی ہے لیکن فرعون کی ناک میں گھس کر اسے مار ڈالنے والے مچھر کو حقیر سمجھتی ہے، وباء سے مرنے کو شہادت کہتی ہے لیکن وباء سے مرنے کو تیار نہیں ہے۔۔۔میں بولتی گئی کوئی کرب گویا میرے اندر سے پھوٹ نکلا تھا۔۔۔ارمغان سٹپٹا کر مجھے دیکھنے لگا۔

ماما۔۔۔دنیا میں کیا کبھی بھی اس وباء کے خلاف ویکسین نہیں بنے گی؟

کیوں نہیں۔۔۔ہر بیماری اور ہر وباء کا علاج آسمان سے زمین پر اتارا گیا ہے۔

ماما۔۔۔کیا یہ واقعی دنیا کو ختم کرنے اور اکیلی راجدھانی بنانے کی سازشیں ہیں؟

دنیا کو کوئی ختم نہیں کرسکتا ما سوا کہ جس نے اسے بنایا۔پوری راجدھانی اکیلے اسی کی ہے جو اس کا مالک ہے۔۔۔ان دیکھے اور ان بنائے معبود پر ایمان میں جو مزا ہے ناں۔۔۔وہ پتھر کے صنم میں نہیں۔خود، اپنے ہاتھ سے پتھر کا جسم اور نشانیاں تراشنا اور تراش کر ان کی تابعداریاں کرنا بھی کوئی عبادت ہے؟ یہ تو ایسے ہی ہے برخوردار کہ اپنے ہاتھ سے الٹا سیدھا پیزا، بنا لیا اور پھر خود ہی اسے دیوانگی میں چاٹنا شروع کر دیا۔

ارمغان سنتا رہا۔۔۔خوب غور سے۔۔۔لیکن ابھی علامتی کہانی سمجھنے کے قابل نہیں تھا وہ اسے ایک بیانیہ داستان سنانے کی ضرورت تھی۔

ارمغان۔۔۔ایک بات سنو۔۔۔ وباء کے دنوں میں اچھا وقت گزارنے کے لیے ایسے کام کرو جو ہمیشہ تمہاری پینڈنگ میں پڑے رہے اور تمہیں وقت نہیں ملا انہیں کرنے کا مثلاً کتابیں پڑھنے کا۔۔۔بہت سی ایسی کتابیں گھر میں موجود ہیں۔۔۔جنہیں آپ تعلیمی مصروفیت کے دوران نہیں پڑھ سکے تھے۔۔۔ ان میں تاریخ، لٹریچر، سائنس، دینیات وغیرہ۔۔۔سب کتابیں موجود ہیں۔بیٹے کی آنکھوں میں چمک سی ابھری۔

میں بھی آپ کے ساتھ بیٹھ کر پڑھوں گی، لیکن پہلے ذرا نماز پڑھ لوں۔میں نے اس کے سامنے فرش پر مصلہ بچھا لیا تھا اور وہ مجھے چپ چاپ دیکھ رہا تھا۔

ارمغان کو گھر کے کتب خانے سے دلچسپی پیدا ہو رہی تھی اور اب اس نے لاک ڈاؤن کی شکایت کرنا کم کر دی تھی، بس کبھی کبھی دوستوں کی کمپنی یاد کر کے ایک سرد آہ بھرتا، جیسے بوڑھے اپنی بیتی جوانی کو یاد کر کے گریہ کرتے ہیں۔۔۔ لیکن میں اسے ایسے ہی سمبھال لیتی جیسے بزرگوں کو ان کے سعادت مند بچے سمبھال لیتے ہیں۔

حیرت انگیز طور پر ارمغان نے لائبریری کی قریبا ساری کتابیں چند دنوں میں پڑھ ڈالیں۔۔۔مجھے فکر دامن گیر ہوئی، مزید کتب کہاں سے لاؤں گی۔۔۔ارمغان تو بہت سرعت پسند ہے۔۔۔تحمل تو اس میں ہے ہی نہیں۔۔۔ لاک ڈاؤن نے ہر طرف قفل لگا رکھے ہیں۔۔۔کیسے باہر جاؤں گی۔لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔۔۔۔چھوٹے شیلف کی آخری کتاب مکمل کرتے ہی ارمغان نے مجھ سے کہا۔

مما۔۔۔میں نے بہت سی کتابیں پڑھ ڈالی ہیں جو ختم ہو جاتی ہیں لیکن۔۔۔آج سے میں ایک ایسی کتاب پڑھنا شروع کروں گا، جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔۔۔چاہے اسے کتنی ہی بار پڑھ لیا جائے۔۔۔نہ اس کے سبق ختم ہوتے ہیں اور نہ اس کا امتحان سیمسٹرز میں ہوتا ہے۔۔۔میں نے اس کتاب کو اس سے پہلے پڑھا تو تھا لیکن سمجھ کر نہیں پڑھا تھا۔۔۔اب میں اس کتاب پر غور کروں گا۔سمجھ کر پڑھوں گا۔۔۔اس کے اتنے زیادہ ٹاپکس ہیں کہ ہزاروں لاک ڈاؤن آجائیں، کتاب پڑھنے والا کبھی بور نہیں ہوتا۔

مما۔۔۔لاک ڈاؤن تو ایک نعمت ہے جس نے ہمیں سالوں پرانے بھولے ہوئے سبق یاد دلا دیے ہیں۔

میں تعجب سے اپنے بیٹے کی صورت دیکھ رہی تھی۔

اس کی باتیں سمجھنے کے باوجود بولی۔

" کون سا سبق؟

اس نے کلام اللہ پر ملایمت کے ساتھ اپنا ہاتھ رکھ دیا

" یہ مما، جسے آپ روز پڑھتی ہیں اور میں کبھی نہ پڑھ سکا۔شاید لاک ڈاؤن کے انتظار میں۔۔۔وہ طنز اور تاسف سے بولا۔۔۔اب مجھے وہ سارے ملتوی کام کرنا ہوں گے، جو تا زندگی کرنے کے لئے ہیں اور جس میں کوئی لاک ڈاؤن نہیں ہوتا ہے

مما۔۔۔مجھے بھی اپنے ساتھ فجر کی نماز کے وقت اٹھا دیجیئے گا۔۔۔"

- بقیہ -

وقت کی آواز

ہم سب اپنا ملک چھوڑ کر دوسرے ملک جاتے ہیں تو اپنوں کو چھوڑنے کا کوئی مقصد ہوتا ہے ایک امید کے ساتھ انسان نکلتا ہے ۔''کوئی قرآن اور بائیبل لے کر اپنے ساتھ چلتا ہے تو کوئی اچھی زندگی کے خواب لے کر چلتا ہے''۔''کچھ اپنے بچوں کا مستقبل اپنی آنکھوں میں سجا کر چلتے ہیں تو کچھ محض مغربی دنیا کی چکا چوند سے متاثر رہتے ہیں''۔''دھیرے دھیرے ہم بہت کچھ حاصل کر لیتے ہیں اور جب ہمارا خواب پورا ہو جاتا ہے تو ہم واپس جانا چاہتے ہیں۔اس وقت کی طرف جو بیت گیا تا کہ جو نہ ملا ہوں وہ مل جائے۔جو خواہش رہ جائے اسے پورا کر لیں۔مگر ایسا ہوتا نہیں وقت کو پکڑنا اتنا آسان نہیں ہوتا''۔وہ عزم سے بولے''۔چلیں ہم آنے والے وقت کو صحیح استعمال کریں دیکھتے ہیں ہمارا وقت اور ہمار تجربہ ہمیں کس راہ لے جاتا ہے''۔انہوں نے آسمان کی وسعتوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔سونیا نے ان کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے سوچا کوئی بھی بیتے ہوئے وقت کو واپس نہیں لا سکتا مگر جو لوگ ابھی راستے میں ہیں انہیں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کے اُس آواز کو ضرور سنیں جو دل کی آواز ہے اور جو زادِ راہ آپ اپنے ساتھ لائے ہیں انہیں وقت گزرنے کے بعد کھول کر نہ دیکھیں۔

"شب کے اندھیرے"

محسن نقوی

(۵۔مئی ۱۹۴۷ء تا ۱۵۔جنوری ۱۹۹۶ء)

کب تلک شب کے اندھیرے میں شہر کو ترسے
وہ مسافر جو بھرے شہر میں گھر کو ترسے

آنکھ ٹھہرے ہوئے پانی سے بھی کتراتی ہے
دل وہ راہرُو کہ سمندر کے سفر کو ترسے

مجھ کو اس قحط کے موسم سے بچا ربِ سخن
جب کوئی اہلِ ہُنر عرضِ ہُنر کو ترسے

اب کے اس طور مسلط ہوا اندھیرا ہر سُو
ہجر کی رات میرے دیدۂ تر کو ترسے

عمر اتنی تو میرے فن کو عطا کر خالق
میرا دشمن میرے مرنے کی خبر کو ترسے

اس کو پا کر بھی اسے ڈھونڈ رہی ہیں آنکھیں
جیسے پانی میں کوئی سیپ گُہر کو ترسے

ناشناسائی کے موسم کا اثر تو دیکھو
آئینہ خال و خدِ آئینہ گر کو ترسے

ایک دنیا ہے کہ بستی ہے تری آنکھوں میں
وہ تو ہم تھے جو تری ایک نظر کو ترسے

شورِ صرصر میں جو سرسبز رہی ہے محسن
موسمِ گُل میں وہی شاخ ثمر کو ترسے

○

سلیم کوثر (کراچی)

کچھ بھی تھا سچ کے طرف دار ہُوا کرتے تھے
تم کبھی صاحبِ کردار ہُوا کرتے تھے

سنتے ہیں ایسا زمانہ بھی کبھی گزرا ہے
حق اُنہیں ملتا جو حق دار ہُوا کرتے تھے

تجھ کو بھی زعم سا رہتا تھا مسیحائی کا
اور ہم بھی ترے بیمار ہُوا کرتے تھے

اِک نظر روز کہیں جال بچھائے رکھتی
اور ہم روز گرفتار ہُوا کرتے تھے

ہم کو معلوم تھا آنا تو نہیں تجھ کو مگر
تیرے آنے کے تو آثار ہُوا کرتے تھے

عشق کرتے تھے فقط پاسِ وفا رکھنے کو
لوگ سچ مچ کے وفادار ہُوا کرتے تھے

آئینہ خود بھی سنورتا تھا ہماری خاطر
ہم ترے واسطے تیار ہُوا کرتے تھے

ہم گلِ خواب سجاتے تھے دکانِ دل میں
اور پھر خود ہی خریدار ہُوا کرتے تھے

کوچۂ میرؔ کی جانب نکل آتے تھے سبھی
وہ جو غالب کے طرف دار ہوا کرتے تھے

جن سے آوارگیٔ شب کا بھرم تھا وہ لوگ
اِس بھرے شہر میں دو چار ہُوا کرتے تھے

یہ جو زنداں میں تمہیں سائے نظر آتے ہیں
یہ کبھی رونقِ دربار ہُوا کرتے تھے

میں سرِ دشتِ وفا اب ہوں اکیلا ورنہ
میرے ہم راہ مرے یار ہُوا کرتے تھے

وقت رک رک کے جنہیں دیکھتا رہتا ہے سلیمؔ
یہ کبھی وقت کی رفتار ہُوا کرتے تھے

اشفاق حسین
(کینیڈا)

دل میں بسا ہوا کوئی ڈر جاگتا رہا
میں جاگتا رہا مرا گھر جاگتا رہا

اک شخص کے خیال نے دیں تھپکیاں بہت
آنکھوں میں ایک شہر مگر جاگتا رہا

اتنا تو اپنے آپ میں تنہا نہیں تھا میں
پھر کیوں اکیلے پن کا نگر جاگتا رہا

دہلیز پر سجی ہوئی آہٹ کے ساتھ ساتھ
سایا بھی میرا آٹھ پہر جاگتا رہا

میری ضرورتوں کا نہ کھل جائے اس پہ راز
سویا ہوا وہ شخص اگر جاگتا رہا

بارش کی چند بوندوں نے دی اس کو زندگی
پتھر میں کونپلوں کا جگر جاگتا رہا

اشفاق دل پہ گزری ہوئی واردات سے
لفظوں میں شاعری کا ہنر جاگتا رہا

○

نسیم سحر
(راولپنڈی)

اب یہ عالم ہے مرے شہر کی ویرانی کا
کوچے کوچے میں ہے نظّارہ بیابانی کا

میری بستی میں تو ہے تیرگیوں کا ڈیرہ !
فائدہ کیا مہ و خورشید کی تابانی کا

مُجھ میں تو پہلے ہی رہتے ہیں خرابے اتنے !
''حکم ہے مجھ کو خرابوں کی نگہبانی کا''

پوچھنا ہے جو تُجھے، اُس کے خدوخال سے پوچھ
ماجرا پوچھ نہ مُجھ سے مری حیرانی کا

اپنے اندر کا سفر کر نہیں پائے اب تک
جن کو ہے زعم بہت اپنی جہاں بانی کا

اپنے انداز میں کہتا ہوں مَیں اشعار نسیمؔ
مِیر کا لہجہ نہیں، رنگ نہیں فانیؔ کا

○

واصف حسین واصف

(نیویارک)

خود ہی تباہیوں کی سبیلیں نکال لیں
آباد دل سے ساری اُمیدیں نکال لیں

سفاکیت میں طاق تھے ایسے ستم شعار
شیشے سے عکس اور شبیہیں نکال لیں

سیلاب سارے خواب چرا کر چلا گیا
اور جاتے جاتے آنکھ سے نیندیں نکال لیں

اک لمس دے کے اس نے کمالِ ہنر کے ساتھ
ہاتھوں سے میرے ساری لکیریں نکال لیں

ٹوٹے چراغ، خوابوں کی رنگین کرچیاں
ملبے سے ہم نے کام کی چیزیں نکال لیں

تب سے ہی میرے ساتھ ہیں تسبیح شماریاں
زاہد نے جب ثواب کی رسمیں نکال لیں

طغیانیوں کا زور تھا سو احتیاط سے
آنکھوں نے دل سے درد کی لہریں نکال لیں

کیا دشمنی تھی ایسی مکین کو مکان سے
بنیاد جس پہ تھی وہ اینٹیں نکال لیں

○

نذیر قیصر

(لاہور)

شاخ میں سبزہ دھوپ میں سایا واپس آیا
رات کو چھو کر دن کا جھونکا واپس آیا

لہر نے کسے صدا دی دوری کے ساحل سے
کشتی واپس آئی ۔۔۔ دریا واپس آیا

بوند گری تھی جلتے موسم کے ہونٹوں پر
آنکھ میں آنسو، دل میں شعلہ واپس آیا

کتنے دنوں کے بعد شجر نے چھتری کھولی
کتنے دنوں میں دن بارش کا واپس آیا

آنکھیں رکھ دیں اُس نے گھر کے دروازے پر
شام ہوئی اور خالی رستہ واپس آیا

ہاتھ میں دِیا لیے وہ چھت پر واپس آئی
اس کے ساتھ ہوا کا جھونکا واپس آیا

کھڑکی کھول کے میں نے اُسے پکارا قیصر
ایک پرندہ ایک ستارا واپس آیا

○

زبیر فاروق

(دبئی)

وفاؤں کی عداوت سے محبت مر بھی سکتی ہے
جفاؤں کی سخاوت سے محبت مر بھی سکتی ہے

نہیں ہے درمیاں جب تک کوئی اچھا ہی اچھا ہے
دلوں میں آئی نفرت سے محبت مر بھی سکتی ہے

اگر "میں" کو نہ مارا تو ہمیں برباد کر دے گی
اناؤں کی ملامت سے محبت مر بھی سکتی ہے

کسی اِک کی کوئی غلطی ہمیں برباد کر دے گی
کسی کی اِک حماقت سے محبت مر بھی سکتی ہے

اگر دونوں ہی طے کر لیں اکٹھا اَب نہیں رہنا
تو دونوں کی اجازت سے محبت مر بھی سکتی ہے

اشرف جاوید

(لاہور)

اقرار کی خو اُس کو ودیعت بھی نہیں ہے
ایسا بھی نہیں ہے کہ محبت بھی نہیں ہے

زخموں کو بھرے دیتا ہے اب وقت کا مرہم
لگتا ہے مسیحا کی ضرورت بھی نہیں ہے

مانگے کے چراغوں سے چراغاں نہیں ہوتا
اور اپنا جلانے کی سہولت بھی نہیں ہے

عشّاق ہیں، پھرتے ہیں فقط دید کی خاطر
کشکول کے لب پر کوئی حاجت بھی نہیں ہے

دہلیز پہ آ بیٹھا کوئی بھیس بدل کر!
جو دیکھ رہے ہو، وہ حقیقت بھی نہیں ہے

یادوں کے تسلّط میں بھی نیند آنے لگی ہے
اب آگ میں شدّت بھی، اذیّت بھی نہیں ہے

تحسین کریں کیسے ترے ظلم و کرم کی!
دامن میں گلِ سنگِ ملامت بھی نہیں ہے

کیا جانیے، کس واسطے پھرتا ہے زباں سے!
پہلے تو کوئی ایسی روایت بھی نہیں ہے

میں اپنی وفاؤں کی سزا کاٹ رہا ہوں
سر فخر سے اونچا ہے، ندامت بھی نہیں ہے

عظیم بخت
(بکر)

ربّ کو دینی ہے کہاں کیسے صدا جانتے ہیں
اتنے کافر بھی نہیں حمد و ثنا جانتے ہیں

آپ لوگوں کی کسی بات پہ مت کان دھریں
آپ تو مجھ سے بھلا میرا لکھا جانتے ہیں

ایک وہ لوگ جو ذرّے میں خدا کو دیکھیں
ایک وہ لوگ جو لوگوں کو خدا جانتے ہیں

مرنے والے کی برائی نہیں سنتا کوئی
مارنے والے کو سب لوگ برا جانتے ہیں

ان سے پردے میں سہی کوئی ملاقات تو ہو
میں بھی دیکھوں کہ مرے بارے میں کیا جانتے ہیں

میں نے دیکھا تھا مرے باپ کی صورت جیسا
ایک برگد تھا یہاں پہلے گھنا جانتے ہیں

رزق بٹتا ہے کہاں کوئی بتاتا ہی نہیں
دربدر ڈھونڈتا پھرتا ہے گدا جانتے ہیں

○

ڈاکٹر ریاض احمد
(پشاور)

ہم تیری بزم سے کیوں نکلے ذرا یاد تو کر
میں نے اک روز کہا تھا نظر انداز نہ کر

اب نہیں لوٹ کے آ سکتے وہ بیتے لمحے
ہے یہی ریت زمانے کی ذرا یاد تو کر

گرچہ ہم خود بھی پریشاں تھے چلے آنے پر
اپنے الفاظ کو لہجے کو کبھی یاد تو کر

ناز و انداز سہے جاتے ہیں الفت میں مگر
حد گزر جائے تو چبھتے ہیں یہ کانٹا بن کر

کون سمجھائے تمہیں الفت کے رموز و اسرار
چوٹ کھا کر ہی سمجھ آتی ہے سب کو آخر

میں نے سوچا تھا کہ تم ساتھ رہو گے ہر دم
راہ میں چھوڑ کے کیوں چل دیئے انجان بن کر

یوں بھی ہوتی ہے کبھی خواب کی اُلٹی تعبیر
میں نے دیکھا تھا تمہیں مہر و وفا کا پیکر

گر وفاؤں کے طلبگار ہو ہر رشتہ میں
با وفا کو کبھی اِک لمحہ بھی ناشاد نہ کر

زیست کی راہ پہ چلتے ہوئے سیکھا ہے ریاضؔ
بیوفا سے کوئی شکوہ کبھی فریاد نہ کر

○

یہ کیسے رشتے۔۔۔؟

وحشی سعید
(سرگودھا)

آج وہ اکہتر سال کا ہوگیا اور پچھلے ایک سال سے خود کو بہت کمزور اور لاغر محسوس کر رہا ہے۔ ایک سال پہلے ایسی بات نہیں تھی۔ وہ نہ کمزور تھا اور نہ لاغر۔ ایک ہی سال میں ایسا ہوگیا۔ ایک سال پہلے وہ علی الصبح جاگتا تھا اور غسل خانے سے فارغ ہوکر چہل قدمی کے لئے نکلتا تھا۔ چہل قدمی کرتے کرتے وہ اپنی کالونی کی پاس والی پارک میں پہنچ جاتا تھا۔ وہاں اُس کو ایک خوبصورت کتا ملتا ۔ وہ کتا اُس کو اپنا دوست بنانا چاہتا تھا۔ لیکن اُس کو کتوں کے ساتھ سخت نفرت تھی، حالانکہ وہ جانتا تھا کہ کتا سب سے وفادار جانور ہوتا ہے۔ کتوں سے اُس کی نفرت کی وجہ یہ تھی کہ بچپن میں ایک پاگل کتے نے اُسے کاٹا تھا اور اُسے چودہ انجکشن لگانے پڑے تھے۔ وہ کافی دنوں تک بیمار رہا تھا۔ وہ واقعہ اُسے اب تک یاد ہے۔

وہ ہر دن پارک کے اردگرد چکر لگاتا تھا اور پھر وہاں پہ لگے ہوئے ایک بینچ پر بیٹھ جاتا۔ کالونی میں چہل قدمی کرنے والے دوسرے لوگ اس کی خیریت وغیرہ پوچھتے تھے۔ یہ سب ایک سال پہلے کی بات ہے۔ پارک میں چہل قدمی کے بعد وہ اپنے فلیٹ میں واپس آتا تھا۔ اُس کی بیوی ڈائننگ ٹیبل سجانے میں مصروف ہوتی تھی۔ آملیٹ، روٹی، چائے سب کچھ ٹیبل پر لگا ہوتا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ جاتا۔ پھر دونوں اکٹھے صبح کا ناشتہ کرتے تھے۔ یہ سلسلہ پچھلے بیس سال سے چلا آرہا تھا، جب سے وہ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوا تھا۔ اس سے پہلے نوکری کی بھاگ دوڑ کے سبب وہ اتنے آرام سے ناشتہ نہیں کرتا تھا، لیکن اب تو آرام ہی آرام تھا۔

نیلما پینسٹھ سال کی ہوگئی تھی۔ اب وہ بوڑھی اور ضعیف دِکھ رہی تھی۔

اُس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا :

''پارک میں سوم ناتھ تو نہیں ملا۔۔۔؟ اپنے کسی آدمی کو بھیجتا، غسل خانے کی ایک پائپ لیک ہوگئی ہے''

اُس نے مزید کہا:

''آج کی رات بھی آرام سے نہیں کٹی۔ معدے میں اب پہلے سے زیادہ درد محسوس ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر کے پاس جانا ہوگا''

''نیلما!۔۔۔تم کچھ زیادہ ہی فکرمند ہوگئی ہو۔ کبھی کبھی گیس کی وجہ سے بھی معدے میں درد ہوتا ہے۔ آج ایم آر آئی کی رپورٹ آرہی ہے۔ کل ڈاکٹر سے ملنے جائیں گے''

نیلما نے کہا :

''ٹھیک ہے۔ لاجونتی ابھی تک نہیں آئی۔ میں بہت کمزوری محسوس کر رہی ہوں۔ ڈاکٹر کو اس کے بارے میں ضرور بتانا ہوگا''

یہ سب ایک سال پہلے ہوا تھا۔

وہ واپس اپنے فلیٹ میں پہنچ گیا۔ آج بھی فلیٹ میں سب کچھ ویسے ہی تھا۔ ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر تھی۔ ٹیبل اپنی جگہ پر تھا، کرسیاں بھی اپنی جگہ پر تھیں۔ کتابیں سلیقے سے ریک میں رکھی گئی تھیں۔ ٹی وی بھی اپنی جگہ پر تھا۔ فلیٹ کی اندورنی سجاوٹ بھی پہلے ہی جیسے تھی۔ نیلما نے جس انداز سے چیزوں کو رکھا تھا، سب کچھ ویسے ہی تھا۔ اب کچن کی صفائی مطلوب تھی۔ لاجونتی کے آنے کی دیر تھی تاکہ وہ کچن صاف کرے اور کھانا پکا کر فرج میں رکھے۔

کمل نے ایک کپڑا ہاتھ میں لیا اور نیلما کی کرسی جو کہ پہلے ہی سے صاف تھی، اُسے مزید صاف کرنے لگا۔ یہی ایک کام وہ خود کرتا تھا۔ یہ کام کرنے کے بعد وہ رام اور سیتا کی مورتی کے سامنے کھڑا ہوتا تھا۔ اگربتی اور دیا جلاتا تھا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر اور آنکھیں بند کرکے پوجا کرتا تھا۔ لاجونتی آگئی۔ اُس نے کمل سے کہا :

''بابو جی! آپ ٹھیک ہیں۔۔۔؟''

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔ ایک چائے کا کپ دے دو''

لاجونتی بولی:

''بابو جی! ڈاکٹر صاحب کے پاس چیک اپ کے لئے جایئے''

کمل نے لاجونتی کی طرف دیکھا اور بڑی نرم آواز میں کہا :

''جاؤں گا''

سوا سال پہلے کی بات تھی، منگل کا دن تھا اور دن کے دو بجے تھے۔ کمل کا موبائل بج اُٹھا۔ فون ڈاکٹر موہن کا تھا۔ وہ کمل سے کہہ رہے تھے:

''کمل ! آپ کو دن کے چار بجے مجھ سے ملنا ہے، اکیلے آیئے گا۔ نیلما بھابی کے آنے کی ضرورت نہیں ہے''

منگل کا دن تھا اور سہ پہر کے چار بجنے والے تھے۔ کمل کو محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی بھیانک زلزلہ آنے والا ہے۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے زمین گھوم رہی ہے۔ اُس کو اپنا یقین ڈگمگاتا ہوا لگ رہا تھا۔ ان ہی حالات میں ڈاکٹر موہن کمل سے نہایت ہی مایوسی کے ساتھ مخاطب ہوا :

''کمل! ۔ ۔ نیلما بھابی کے معدے میں کینسر ہے''

کمل نے چیخ کر کہا :

''Oh No ڈاکٹر۔۔۔!''

اُس نے مزید کہا :

''ڈاکٹر صاحب! کیا کوئی اُمید ہے۔۔۔؟''

ڈاکٹر موہن بولے :

''کینسر ایڈوانس اسٹیج میں ہے۔ صرف تین چار مہینے کی فرصت ہے''

کمل بڑی افسردہ حالت میں فلیٹ پہنچا۔ نیلما نے پانی کا گلاس اُس کے سامنے رکھا۔ کمل نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا:

''ڈاکٹر نے کہا، سب کچھ ٹھیک ہے۔ ہاں کچھ دوائیاں لکھ دی ہیں''

تین مہینے پہلے اُن دونوں نے اپنے بیٹے اکھلیش کے ساتھ فون پر بات کی تھی۔ کمل نے اپنے آپ سے کہا:

''اکھلیش کو سب کچھ بتانا پڑے گا''

اُس نے دیر رات گئے پریشانی کی حالت میں شکاگو امریکہ فون ملایا۔

اکھلیش نے فون اُٹھایا :

''ارے بابو جی! میں آپ کو فون کرنے ہی والا تھا۔ آپ کے لئے خوشخبری ہے۔ میں نے ڈائلیسس سینٹر کھولا ہے۔ انڈین کمیونٹی کے بہت سے لوگ آئے تھے۔ ہمارے علاقے کا میئر بھی آیا تھا۔۔۔''

اکھلیش بولے جا رہا تھا۔ پھر اچانک اکھلیش رُک گیا اور بولنے لگا:

''بابو جی!۔۔۔ آپ نے کیسے فون کیا؟ اماں کیسی ہیں؟۔۔۔ ذرا اُنہیں فون دیجئے''

کمل نے اپنی آواز میں ضبط لاتے ہوئے کہا :

''بیٹا!۔۔۔ تمہاری ماں سو گئی۔ میں صبح اُس کو خوشخبری دوں گا۔ بہو اور بچے کیسے ہیں؟''

اکھلیش نے اپنے باپ کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا:

''بابو جی! اماں اور آپ شکاگو آیئے۔ وہاں کیا رکھا ہے؟''

کمل نے کہا :

''بیٹا! تمہاری اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے''

اکھلیش نے جواب دیا :

''آپ آجایئے۔ یہاں اماں کا اچھے سے اچھے اسپتال میں علاج کرائیں گے''

کمل کچھ کہہ نہ پایا۔ وہ صرف اتنا بول سکا :

''اکھلیش تمہاری زندگی کا اہم دن ہے۔ کل بات کریں گے''

فون ڈراپ ہو گیا یا ہینگ ہو گیا یا کاٹا گیا۔

آج کمل زندگی کے دشوار کن حالات سے گزر رہا تھا۔ اچانک وہ اکھلیش کے بچپن میں چلا گیا۔ اکھلیش اُن کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ بچپن میں شرارتی تھا، لیکن پڑھنے لکھنے میں قابل تھا۔ ہمیشہ اپنے کلاس میں اوّل آتا تھا۔ اُسے میڈیکل کے مضامین میں خاصا لگاؤ تھا۔ اس وجہ سے اُس نے بارہویں جماعت میں نوے فیصد نمبرات لے کر شاندار کامیابی حاصل کی۔ وہ ڈاکٹری کے انٹرنس ٹیسٹ میں بڑی آسانی سے کامیاب ہوا۔

پانچ سال کے بعد اُس نے ایم بی بی ایس کا امتحان امتیازی نمبر کے ساتھ پاس کیا۔ اُسے شکاگو یونیورسٹی سے ایک خط موصول ہوا، جس میں اُسے وہاں ایم ایس کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے دعوت دی گئی تھی۔ اُس جیسے قابل طلباء کے لئے یونیورسٹی کی طرف سے وظیفہ بھی مقرر تھا۔ پھر بھی وہاں جانے اور رہنے کے لئے بہت پیسوں کی ضرورت تھی۔

کمل نے اپنا سنگل بیڈروم والا فلیٹ بینک کے پاس گروی رکھا۔ اُس کی ماں نے اپنے سارے سونے کے زیورات بیچ دیے اور اس طرح اکھلیش شکاگو پہنچ گیا۔

شکاگو اکھلیش کو راس آ گیا۔ وہ وہاں کی زندگی اور کلچر میں گھل مل گیا۔ ایم ایس کی پڑھائی کا آخری سال تھا۔ ایک دن اُس نے اپنی ماں کو فون کیا :

''اماں!۔۔۔ مجھے ہندوستانی فیملی کی ایک خوبصورت لڑکی ملی''

نیلما نے پوچھا :

''ٹھیک ہے۔ شادی کرنے کا ارادہ کب ہے۔۔۔؟''

اکھلیش نے جواب دیا :

''شادی ہو گئی۔۔۔! میں شادی کی ویڈیو بھیج رہا ہوں۔ بابو جی کو بھی دکھانا''

اُس دن کمل اور نیلما کا دل ٹوٹ گیا۔ اکھلیش کے ماں باپ ہر دوسرے دن اُس کو فون کیا کرتے تھے۔ اُس دن سے دونوں کئی کئی دنوں بعد اُسے فون کرتے تھے اور آہستہ آہستہ فون پر ملاقاتوں کا سلسلہ کافی کم ہو گیا۔

نیلما کو جب معلوم ہوا کہ اُس کی زندگی کے دن اب گنتی کے رہ گئے ہیں۔ آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اُس نے کمل سے سوال کیا :

''کیا اکھلیش آئے گا۔۔۔؟''

کمل نے جواب دیا :

''اکھلیش نے ڈائلیسس سینٹر کھولا ہے۔ وہ اب کافی مصروف رہتا ہے''

نیلما غم ناک آواز میں بولی:

''ماں تو ماں ہوتی ہے۔۔۔!''

کمل نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا:

''میں رات کے دس بجے اکھلیش کو فون لگاؤں گا''

اُس رات جب کمل نے اکھلیش کو فون ملایا تو اُس نے بہت دیر کے بعد فون اُٹھایا۔

''بابو جی نمسکار!۔ میں نے اور پریتما نے اپنے جان پہچان والوں اور دوستوں کو ڈائلیسس سینٹر کھولنے کی خوشی میں ایک دعوت رکھی ہے۔ اماں کو میرا نمسکار کہنا''

یہ کہہ کر اُس نے فون رکھ دیا۔

اُس دن کے بعد کمل نے اکھلیش کو کبھی فون نہیں کیا اور نہ ہی نیلما نے اکھلیش کے ساتھ بات کرنے کی ضد کی۔

وہ رات بہت لمبی تھی۔اُس رات کی صبح کا سورج بادلوں میں چھپ گیا تھا۔نیلما چلی گئی۔اب نیلما کو گئے ایک سال ہوگیا تھا۔لاجونتی گھر کی صفائی کرتی تھی۔کھانا تیار کر کے اپنے گھر کو چلی جاتی تھی۔اور کمل حسب معمول اپنے کمزور جسم کو کھینچتے ہوئے کالونی کے پارک میں چلا جاتا تھا۔کچھ دیر کے لئے وہاں کے سیمنٹ کے بینچ پر بیٹھتا تھا۔وہ سفید رنگ کا خوبصورت کتا اُس کے سامنے بیٹھتا تھا۔کمل کے دل میں کتوں کے لئے جو نفرت تھی،اب وہ ہمدردی میں بدل گئی تھی ۔اب وہ ہر دن اپنے ہاتھ میں بسکٹ لاتا تھا اور اس خوبصورت کتے کو کھلا دیتا تھا۔ کتا اُس کے پاؤں اور ٹانگوں کو چاٹتا تھا۔اب وہ کتا اُس کا دوست بن گیا تھا۔یہ روز کا معمول تھا۔لیکن اچانک وہ کتا غائب ہوگیا۔اُس نے پارک کے چوکیدار سے پوچھا :

''وہ کتا کہاں گیا۔۔۔؟''

چوکی دار بولا :

''کتا پارک میں آنے والوں کو تنگ کرتا تھا۔میونسپلٹی والوں نے اُس کو ڈاگ یارڈ میں جمع کر دیا ہے''

کمل چوکیدار پر برس پڑا۔

چوکیدار بھی واپس بولا:

''آپ مجھ پر کیوں برس رہے ہیں ۔کتے کے ساتھ اگر اتنی محبت ہے تو آپ ڈاگ یارڈ جا کر اُس کو لے آیئے اور اپنے گھر میں رکھئے۔۔۔!''

کمل نے اُسی وقت گاڑی لی اور ڈاگ یارڈ چلا گیا۔وہاں کے انچارج سے بولا۔

''آپ نے ہماری کالونی سے ایک کتا اُٹھایا ہے۔وہ آپ مجھے دے دیجئے۔میں اُسے پالنا چاہتا ہوں''

انچارج کچھ دیر کے لئے کمل کو تکتے رہ گیا۔پھر سرد آواز میں بولا۔

''سر وہ کتا کل رات دیر تک روتا رہا اور پھر اچانک زور زور سے بھونکنے لگا۔صبح ہوتے ہوتے ہمیشہ کے لئے سو گیا''

کمل نے اپنے آپ سے کہا:

''کتا بھی چلا گیا''

کتے کی موت کے دوسرے دن شہر بھر میں موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔لاجونتی فلیٹ دیر سے پہنچی۔جب اُس نے فلیٹ کے تالے میں چابی لگائی اور دروازہ کھولا تو ٹی وی آن تھا۔کمل ٹی وی کے سامنے والی کرسی پر بیٹھا تھا۔اُس کا چہرہ پرسکون تھا۔لاجونتی چیخ پڑی۔

''بابو جی۔۔۔!''

کمل خاموش ہوگیا تھا۔وہ اپنے واحد دوست کے بچھڑنے کا غم برداشت نہ کر سکا۔

☆

Mario de Andrade

(San Paolo 1893-1945)

MY SOUL HAS A HAT I counted my years & realized that I have Less time to live by,Than I have lived so far.I feel like a child who won a pack of candies: at first he ate them with pleasure, But when he realized that there was little left, he began to taste them intensely.I have no time for endless meetings where the statutes, rules, procedures & internal regulations are discussed, knowing that nothing will be done.I no longer have the patience To stand absurd people who,despite their chronological age, have not grown up.My time is too short: I want the essence, my spirit is in a hurry. I do not have much candyIn the package anymore.I want to live next to humans, very realistic people who knowHow to laugh at their mistakes,Who are not inflated by their own triumphs & who take responsibility for their actions.In this way, human dignity is defended and we live in truth and honesty.It is the essentials that make life useful.I want to surround myself with peoplewho know how to touch the hearts of those whom hard strokes of lifehave learned to grow, with sweet touches of the soul.Yes, I'm in a hurry.I'm in a hurry to live with the intensity that only maturity can give.I do not intend to waste any of the remaining desserts.I am sure they will be exquisite, much more than those eaten so far.My goal is to reach the end satisfied and at peace with my loved ones and my conscience.We have two lives& the second begins when you realize you only have one.

''تہی دامن۔۔۔۔!!''

ناہید طاہر
(ریاض، سعودی عرب)

''سائنس دانوں نے ہر چیز ایجاد کی ہے صرف ایک چیز نہیں!!!!!'' فاطمہ جھلائی ہوئی اسٹو صاف کررہی تھی جس پر شیر خرما ابل کر پھیلا ہوا اس کی جھنجھلاہٹ پر تبسم بکھیر رہا تھا۔

عبداللہ بیوی کی جھلاہٹ سے محظوظ ہوتا ہوا کچن میں داخل ہوا اور اس کی بکھری ہوئی زلفوں کو پیار سے نہارتا ہوا استفسار کیا۔ ''وہ کیا چیز ہے۔۔۔؟''

''دودھ اس وقت ہی کیوں ابلتا ہے؟ جب بندہ ایک سکنڈ کو اپنی نگاہ اوجھل کرلے یا کچھ کام سے رخ پھیر لے۔۔۔؟'' یہ سن کر عبداللہ بے اختیار مسکرایا۔

''آپ ہنس رہے ہیں۔۔۔؟'' وہ غصے سے سرخ ہوتی ہوئی شوہر کو دیکھنے لگی۔ عبداللہ پیار سے اس کی ناک کو چھوتا ہوا گویا ہوا۔ ''تمام سائنٹسٹ کورونا کی ریسرچ میں مصروف ہیں۔۔۔ جب فارغ ہوجائیں گے تو تمھاری اس پرابلم پر ضرور غور فرمائیں گے۔''

''ہمم۔۔۔ایک اور پرابلم بھی ہے۔۔۔!''

''ارشاد۔۔۔!!''

''بریانی کی پیاز ہمیشہ آخری پل میں ہی کیوں جلتی ہے؟ جبکہ ہم خواتین بیس منٹ اس پر نظریں جمائے ہاتھ چلاتی رہتی ہیں۔ ذرا دھیان ہٹا نہیں کہ پیاز سیاہ۔۔۔!!!!!'' یہ سن کر عبداللہ زور سے ہنستا ہوا گویا ہوا۔

''محترمہ! یہ بھی بہت بڑا مسئلہ ہے۔۔!!''

''بس یہی تو چاہتی تھی کہ میرے سرتاج کا رخِ روشن خوبصورت مسکراہٹ سے کِھل اٹھے۔ صبح سے غور کررہی ہوں بہت خاموش اور پریشان دکھائی دے رہے ہیں؟ اس کی وجہ جان سکتی ہوں؟''

''کچھ خاص نہیں۔۔۔ویسے آج کھانے میں اس قدر اہتمام کیوں ہورہا ہے۔۔۔؟''

''کیونکہ آپ کے چھوٹے بھائی گھر تشریف لائے ہیں''

''رب العالمین اس گھر کی خوشیوں کو سلامت رکھے۔۔۔!!''۔

عبداللہ دعا دیتا ہوا اپنے گلے کی خراش سے پریشان کچن سے نکل گیا۔

فاطمہ نے ساس کے حکم اور خواہش کے مطابق کھانے میں چکن سوپ، گوشت کا قورمہ، کباب، لچھا پراٹھا اور کاجو رئیس بنایا تھا۔ آخر میں شیر خرما رہ گیا تھا۔ آج گھر کا سب سے چھوٹا بیٹا کلیم بنگلور سے آیا تھا۔ جب لاک ڈوان شروع ہوا تو وہ بے چارہ بنگلور میں پھنس گیا تھا۔ کلیم کی آمد پر گھر میں ایک بہار سی چھائی ہوئی تھی لیکن عبداللہ کافی پریشان تھا۔ صبح سے وہ اندر ہی اندر ڈپریشن کا شکار تھا۔ طبیعت کچھ ناساز تھی۔ ہلکا سا بخار محسوس ہورہا تھا۔ جسم ٹوٹ رہا تھا اور گاہے گاہے کھانسی بھی آرہی تھی۔ وہ اپنی خواب گاہ میں چلا آیا اور آرام کرنے کے ارادے سے بیڈ پر لیٹ گیا۔ فاطمہ پریشانی کے عالم میں اس کے پیچھے چلی آئی۔

''کیا ہوا۔۔۔؟ سب ٹھیک تو ہے۔۔۔؟ چھوٹو گھر آیا ہے اور آپ کمرے میں بند ہیں؟''

''فاطمہ! طبیعت بہت بوجھل ہے۔۔۔کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔''

موسم بھی کافی ناخوشگوار تھا۔۔۔بارش کے آثار دکھائی دے رہے تھے آسمان پر کالی گھٹاؤں نے ڈیرہ جمارکھا تھا اور سرد ہوائیں بھی الگ سے پریشان کررہی تھیں۔ عبداللہ کے دل و دماغ میں ایک طوفان برپا تھا۔ ڈر وخوف کا طوفان۔۔۔اندیشوں اور وسوسوں کا طوفان۔۔۔ان طوفانی سوچوں نے دل ودماغ میں تباہی مچا رکھی تھی اور دماغ کی نسوں کو جیسے نوچ رہی تھیں۔ دستر خوان لگ چکا تھا۔ فاطمہ، عبداللہ کو آواز دیتی ہوئی دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی۔ ''آپ ابھی تک لیٹے ہیں؟ دستر خوان لگ چکا ہے اماں بابا آپ کا انتظار کررہے ہیں۔''

''فاطم! بستر سے اٹھا بھی نہیں جارہا ہے'' فاطمہ کو وہ ہمیشہ پیار سے فاطم کہتا۔

''خیریت تو ہے۔۔۔؟'' فاطمہ شوہر کے قریب آئی، تھکن زدہ چہرے کو تشویش بھری نگاہوں سے دیکھا اور اپنی ہتھیلی عبداللہ کی پیشانی پر رکھ دی۔ ماتھے پر تپش محسوس نہ ہوئی۔ ''بخار نہیں ہے۔۔۔!'' فاطمہ پرسکون انداز میں سانس لیتی ہوئی شوہر کو دیکھنے لگی۔

''شاید اندر ہو۔۔۔کیونکہ پورا بدن درد کررہا ہے گلے میں ہلکی سی خراش بھی محسوس کررہا ہوں''

''آپ نے کل لیموں پانی کثیر مقدار میں پی لیا تھا حالانکہ میں نے منع بھی کیا لیکن آپ سنتے کہاں ہیں۔''

''فاطم! میرے لیے چائے بناؤ''

''آپ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے۔'' فاطمہ تشویش کا اظہار کرتی ہوئی رسوئی میں گئی اور چکن سوپ لے آئی، عبداللہ کو زبردستی سوپ پلایا۔ کام نپٹا کر فاطمہ دوبارہ دوائی اور پانی کا گلاس تھامے کمرے میں داخل ہوئی۔

''گولی کھا لیجیے۔۔۔ان شاء اللہ رات تک افاقہ ہوجائے گا'' عبداللہ نے گولی کھانے سے انکار کیا اور فکر مند لہجے میں گویا ہوا۔ ''فاطم! مجھے اسپتال جاکر ٹسٹ کروانا ہوگا۔''

''کیا مطلب۔۔؟''

''فکر مند ہوں یار۔۔۔کہیں مجھ پر اس وباء نے حملہ تو نہیں کیا؟''

''یا اللہ خیر۔۔۔آپ کو نہ تو بخار ہے اور نا ہی کھانسی۔''

''تم نہیں سمجھو گی۔۔۔میرا ہسپتال جانا نہایت ضروری ہے۔۔۔ تاکہ وقت پر بیماری کا پتا چل سکے۔۔۔جس سے میرا کنبہ بھی محفوظ رہے گا۔۔۔تم سب کی حفاظت میرا اولین فرض اور ذمہ داری ہے'' عبداللہ نے فکر ظاہر کرتے ہوئے سکوٹی کی چابی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔ کچھ ساعتوں بعد وہ دوبارہ کمرے میں

داخل ہوتا ہوا ہدایت دینے لگا۔

''سنو۔۔۔! میں نے مریم کی سکول فیس ادا کردی ہے کلیم کی فیس کے لئے ایس بی آئی بینک میں کچھ رقم جمع کیا ہوں۔۔۔ اگر خدانخواستہ کلیم نے NEET میں نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی تو تم اس کا داخلہ فل پے منٹ سے کروادینا۔''

''یہ کیا بچپنا ہے۔۔۔؟ کیا آپ محاذ پر جارہے ہیں۔۔۔؟'' فاطمہ غم اور غصے تلے چلائی۔ اس کی آواز میں کرب صاف عیاں تھا۔ عبداللہ اداسی سے مسکراتا ہوا کمرے سے جانے لگا۔

''سنیں! سکوٹی پر نہ جائیں۔۔۔ برسات کے آثار نمایاں ہیں۔۔۔ آپ بھیگ جائیں گے۔۔۔ کیا بک کرلیں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ بیس منٹ کے اندر اسپتال پہنچ جاؤں گا۔۔۔ جلد ہی لوٹ آؤں گا''

شام کی تاریکی سے پہلے وہ گھر لوٹنا چاہتا تھا لیکن ہسپتال کے باہر کھڑی ایک لمبی قطار نے اس کے حوصلوں کو پست کردیا۔ اس نے گھبرا کر ماتھے کا پسینہ خشک کیا۔ لوگ کئی گھنٹوں سے کھڑے بدحال نظر آرہے تھے ڈھائی گھنٹہ بعد اس کی باری آئی۔ تین نرس اور دو ڈاکٹرز تھے جنھوں نے ماسک اور مکمل حفاظتی ڈریس پہن رکھا تھا۔ عبداللہ کو ان کی سرخ آنکھیں دکھائی دی۔ پتا نہیں کیوں اس کے وجود پر خوف کے بادل چھانے لگے۔ ایک نرس نے عبداللہ کا ٹمپریچر چیک کرنے کے بعد ڈاکٹر کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارہ کیا۔ ڈاکٹر تیزی سے اٹھا۔۔۔ اس کے قریب پہنچ کر سرگوشی کی۔ ''آپ پر کورونا کے اثرات پائے گئے ہیں۔ آپ کو ہسپتال میں بھرتی کیا جائے گا۔''

یہ سن کر عبداللہ کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں اور بدن میں ہلکی سی کپکپاہٹ طاری ہونے لگی۔ انجانے اندیشوں نے حقیقت کا روپ دھار لیا تھا۔۔۔ لمحہ بہ لمحہ موت کا خوف اس کے حواس پر طاری ہونے لگا۔ نرس نے اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔۔۔ جس کمرے میں عبداللہ کو رکھا جانے والا تھا وہ بہت ہی ویران اور گندگی سے پُر تھا۔ یہاں عجیب قسم کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ بیڈ بھی بہت خستہ حال نظر آیا جس کی چادر پتا نہیں کتنے دنوں سے تبدیل نہیں کی گئی تھی۔ عبداللہ کو متلی ہونے لگی اس نے بڑی بے بسی سے نرس کو دیکھا اور آگے بڑھ کر بیڈ پر جا بیٹھا۔ نرس کمرے سے چلی گئی تو وہ دوبارہ کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ دل کی بے قراری نے دماغی سکون چھین رکھا تھا کمرے میں ایک چھوٹی سی کھڑکی نظر آئی وہ دھیرے سے اٹھا کھڑکی کے قریب پہنچ کر پردہ ہٹایا اور باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ راستہ دور تک سنسان پڑا تھا۔۔۔ افق پر تاریکی سمٹ رہی تھی۔ عبداللہ کو چہار سو اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیا۔۔۔ ہوسکتا ہے اس کے وجود کے اندر پھیلی ویرانی جیسے باہر کے موسم پر چھاتی ہوئی محسوس ہوئی ہو۔ برگد کا ایک بوڑھا درخت جس کے نیچے کتے کا ایک پلا ٹھٹھرتا ہوا جو اپنی کمزور آواز میں شدید کرب سے بلکتا نظر آیا۔ سورج پر ابر کی سیاہ چادر گہری ہوئی تو آسمان پر چھائے ابر آلود سائے پھٹ پڑے۔ بادلوں کی گرج، بجلیوں کی کڑک اور ہواؤں کی سنسناہٹ کے ساتھ ہی موسلا دھار بارش شروع ہوئی۔ اس طوفانی بارش سے عبداللہ کے وجود میں پھیلے خوف کے سائے اور زیادہ وسیع ہونے لگے اس نے ایک جھرجھری سی لی اور آنکھیں بھینچ لی۔۔۔ دوبارہ جب آنکھیں وا کیں تو اس کتے کے بچے کو دیکھا جو سہما ہوا اب بلند آواز میں رو رہا تھا، شاید وہ اپنوں سے بچھڑ گیا تھا۔۔۔ بچھڑنے کا غم اور اس کا احساس، اس وقت عبداللہ سے بہتر کون جان سکتا تھا۔ برسات بھی جو کبھی اس کے لیے رومان خیز موسم ہوا کرتا تھا آج اس نے دل کا سکون چھین رکھا تھا آج اس بات کا بھی احساس ہوا تھا کہ بارشیں ہر کسی کو لطف نہیں دیتیں!!!! اس نے دوبارہ جھرجھری لی۔ کمرے کی نیم تاریکی میں ایک سایہ سا ابھرا وہ نرس تھی جو دوا کی ٹرے اور انجکشن کے ساتھ نمودار ہوئی تھی۔ اس نے چہرے کو مکمل ڈھانپ رکھا تھا۔ کمرے میں اس قدر سکوت تھا جس میں صرف اس کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ ''سنو! اگر تم چاہو تو اپنے گھر بات کرکے اطلاع دے سکتے ہو۔۔۔ کیونکہ انجکشن اور دوائی کے اثرات تم پر غنودگی پیدا کرسکتے ہیں، جس کی وجہ سے بات کرنا مشکل ہوجائے گا۔''

''جی، بہتر۔۔۔!!'' اس نے جیب سے موبائل نکالا اور گھر اطلاع دی۔

'' فاطم ! رپورٹ پازیٹیو آئی ہے یار۔۔۔ میں یہاں ایڈمٹ ہوں۔۔!!''

''یا اللہ خیر۔۔۔ آپ کے اندیشے سچ ثابت ہوئے۔'' فاطمہ پریشانی سے حواس باختہ لرز اٹھی۔

''گھبرانا نہیں۔۔۔'' جواب میں فاطمہ کی سسکیاں سنائی دی۔

''میرے لیے دعا کرنا کہ میں جلد سے جلد لوٹ آؤں''

''عبداللہ اپنا خیال رکھنا۔۔۔'' فاطمہ کی آواز میں ہجر کا نوحہ پوشیدہ تھا۔ عبداللہ نے اداسی سے مسکراتے ہوئے فون بند کیا۔

نرس نے انجکشن لگایا تو چند ہی لمحوں بعد اس پر غنودگی سی طاری ہوئی اور وہ سوگیا۔ پتا نہیں رات کا کون سا پہر تھا کہ کمرے میں آہٹ سی محسوس ہوئی۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں لیکن کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ غنودگی کچھ ساعت بعد کم ہوئی۔ باہر برسات میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔۔۔ خنکی اب اس کے وجود پر کپکپی طاری کیے جارہی تھی۔۔۔ اس نے میلی چادر کو غنیمت جانا اور اسے جسم پر پھیلا لیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے موت بالکل پاس کھڑی دستک لگائے جارہی ہو۔۔۔ بھیگتی رات بہت لمبی تھی۔۔۔ صبح پتا نہیں ہوگی بھی یا نہیں؟ اس نے بیچارگی سے سوچا۔ اس کے حواس مکمل بیدار ہوچکے تھے وہ بہت دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور چلی گئی تھی۔ ہلکی سی آہٹ بھی اسے ڈرانے کو کافی تھی۔ صبح صادق دوسائے دوبارہ کمرے میں داخل ہوئے۔ ''مجھے بھوک لگی ہے۔'' عبداللہ نے کمزور لہجے میں کہا۔

''بیٹا! یہ کوئی ریستوران نہیں۔'' اس سایہ نے کافی سرد مہری سے جواب دیا تھا۔

''مجھے کھانے کے لئے کچھ دیں۔۔۔۔ بہت بھوکا ہوں'' خوراک میں کمی کے باعث اس کی قوتِ مدافعت بھی دھیرے دھیرے کم ہوتی جارہی تھی۔ اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ ''میں اپنے گھر سے ناشتہ منگوانا چاہتا ہوں۔۔۔ میرا فون کہاں ہے۔۔۔؟''

''چہارسُو''

''یہ رہا تمھارا فون۔'' وہ شخص موبائل اس کے سامنے لہرایا۔اس شخص کا چہرہ ہر تاثر سے عاری تھا۔عبداللہ نے تڑپ کر ہاتھ بڑھایا۔

''نو۔۔۔!'' اس شخص نے غراہٹ بھری۔کچھ ساعت بعد خود ہی گویا ہوا۔

''فیملی سے بات کرنا چاہتے ہو۔۔۔؟'' callrecent فاطمہ کی تھی جو وائف کے نام سے سیو تھی۔عبداللہ کی آنکھوں میں چمک عود آئی۔

''ہیلو! اسپتال سے بات کر رہا ہوں۔۔۔نہایت افسوس کے ساتھ آپ کو یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ صبح صبح عبداللہ کی موت واقع ہوئی ہے۔۔۔!!!'' یہ سن کر عبداللہ کی آنکھیں پھٹنے کی حد تک پھیل گئیں اور ریڈھ کی ہڈی پر سنسناہٹ سی محسوس ہوئی۔سینے میں مدفن سانسیں خود کی گمشدگی کا اعلان کرنے لگیں۔''آپ نو بجے کے اندر باڈی کلیکٹ کر سکتے ہیں۔۔۔نعش ایمبولنس میں قبرستان پہنچادی جائے گی۔۔۔رشتے دار جو کوئی ہوں صرف تین یا چار افراد کے علاوہ کسی کو اجازت نہیں۔۔۔یاد رکھیں نعش کو اوپن کرنے، دیکھنے یا پھر چھونے کی بالکل اجازت نہیں'' عبداللہ خوف سے چلایا۔

''یہ کیا مذاق ہے۔۔۔؟ اتنا بڑا جھوٹ۔۔۔؟'' اس شخص نے کافی سرد نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا اور کمرے سے چلا گیا۔کچھ دیر بعد کمرے میں آہٹ ہوئی تو وہ جلدی سے بیڈ کے نیچے جا چھپا۔

''جہاں چاہے چھپ جاؤ۔۔۔لیکن فرار حاصل نہیں۔۔۔۔!'' وہ دو نرسیں تھیں ایک نے مضحکہ اڑاتی ہنسی کے درمیان کہا تو وہ بڑی بے بسی کے عالم میں باہر نکل آیا۔

''میرے ساتھ یہ کیسا سلوک کیوں کیا جا رہا ہے۔۔۔؟''

''۔۔۔!!!'' جواب ندارد۔کچھ دیر بعد انھوں نے اسے ویل چیئر پر بٹھایا۔

''مجھے کہاں لے جایا جا رہا ہے؟''

''آپ کی فیملی آنے والی ہے۔۔۔!'' یہ سن کر عبداللہ خوش ہوا لیکن دوسرے ہی پل گزری ساعتوں کی اذیت ناک گوش گراں یاد آئی۔

تاریکی میں ڈوبا کمرہ ،جہاں نرسیں اسے چھوڑ کر کہیں غائب ہوئیں۔۔۔عبداللہ کے جسم میں کمزوری بہت بڑھ گئی تھی لیکن وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو پا رہا تھا اس نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے دیواریں ٹٹولیں۔۔۔چاہتا تھا فرار کی کوئی راہ نکل آئے۔افسوس ایک ہی دروازہ تھا جہاں سے وہ اندر داخل ہوا تھا شاید اسے باہر سے لاک کیا گیا تھا۔۔۔اس نے دروازے پر جنونی انداز میں ضربیں لگائیں۔۔۔ایک جانب دیوار پر سفید رنگ کا پردہ نظر آیا عبداللہ ہزیانی انداز میں اسے کھینچا تو دیکھا وہ ایک صاف شفاف شیشے کی دیوار تھی جس کے باہر وہ دیکھ سکتا تھا لیکن باہر کسی کو وہ نظر نہیں آ سکتا تھا۔یہاں سے لاؤنج نظر آ رہا تھا۔۔۔ہسپتال کا تمام عملہ حفاظتی ڈریس میں نظر آیا۔۔۔اس نے دیکھا والدین کے علاوہ بھائی کلیم ،فاطمہ اور سات سالہ بیٹی مریم کھڑی تھیں۔۔۔غم کا پہاڑ اور درد کی شدت ان کے چہروں سے عیاں تھی۔وہ سب زار و قطار رو رہے تھے۔عبداللہ کو اپنی حیات کی کشتی اپنوں کے ان آنسوؤں میں ہچکولے کھاتی ہوئی محسوس ہوئی۔انھیں حفاظتی کوچ دیا گیا تو وہ لوگ وہیں کھڑے کھڑے تیزی سے اسے جسم پر چڑھانے لگے۔ ''فاطم۔۔۔۔!'' اس نے زور سے چلایا لیکن آواز کمرے میں گونج کر رہ گئی کچھ دیر بعد ایک سٹریچر پر پلاسٹک سے مکمل طور سے پیک شدہ لاش نظر آئی۔۔۔لاش کو دیکھ کر فاطمہ نے ایک دلخراش چیخ ماری اور لہرا کر زمین پر گر گئی۔شاید وہ بیہوش ہو گئی تھی۔ضعیف والدین بکھرے پتوں کی طرح لرزتے ہوئے نظر آئے۔

''بابا۔۔۔امی۔۔۔میں زندہ ہوں۔۔۔!!'' عبداللہ نے غم و یاس کے گہرے کنویں سے صدا بلند کی لیکن افسوس اس کی آواز اس کی اپنی سماعت سے ٹکرا کر دم توڑ گئی۔غم کی شدید لہریں عبداللہ کے رگ و پے میں پھیلتی چلی گئیں۔دل ڈوبا جا رہا تھا بدن کانپ رہا تھا۔وہ دل ہی دل میں رب العالمین سے گڑگڑا کر منت سماجت کرنے لگا کہ اس مصیبت سے نجات حاصل ہو۔مریم روتی ہوئی اپنی ماں کو جھنجھوڑ رہی تھی۔عبداللہ بڑی بے بسی سے اپنوں کو درد و غم کے سمندر میں غوطہ زن دیکھتا رہا۔۔۔وہ جب درد کی شدت سے چلاتے تو اس کا وجود تنکوں کی مانند بکھرنے لگتا۔اپنوں کا یہ درد اور زخم اس کی روح کو چھلنی کر رہا تھا۔۔ان اذیتوں تلے وہ نڈھال ہو گیا۔بدن سے روح رخصت ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔۔۔زندگی کے تار جو اپنوں سے جڑے تھے اب وہ رفتہ رفتہ ٹوٹتے نظر آئے۔"خدایا رحم۔۔۔'' اس نے بڑی بے بسی سے بال نوچے اور شیشے پر گھونسا مارا۔۔۔وہ ٹوٹ کر بکھر گیا لیکن شیشے کی دیوار پر کچھ اثر نہیں ہوا۔اس کی موت اس کے آگے یوں پیش کی جا رہی تھی جیسے وہ کوئی خوفناک خواب دیکھ رہا ہو۔اس نے کسی مفکر سے سن رکھا تھا کہ مندر اور عبادت گاہیں بند ہیں کیونکہ بھگوان، ایشور اسپتالوں میں زندگی بچانے میں مصروف ہیں۔۔۔!!!!

غلط۔۔۔بالکل غلط۔۔۔۔بلکہ یوں کہنا درست ہوگا کہ بھگوان تو موت کا فرشتہ بنے زندگیوں کو چھیننے کا کھیل، کھیل رہے تھے اگر ان بھگوانوں کی اصلیت دنیا پر منکشف ہو جائے تو کیا ہوگا؟ شاید کہ ایک اور طوفان چھا جائے گا۔۔۔اعتبار کھونے کا طوفان۔۔۔!!

'' کاش کہ میں ہسپتال کا رخ ہی نہیں کرتا۔۔۔!!!'' اس نے بڑی بے بسی سے بال نوچے اور سر کو شیشے کی دیوار پر مارنے لگا۔پیچھے سے وہی نرسیں آ کر اسے تھام لی۔

'' مجھے چھوڑ دو۔۔۔میں ان لاشوں کے سوداگروں کا خون پی جاؤں گا''

''پہلے یہ دوا پی لو۔۔۔۔!!!'' نرس اس کے منھ میں زبردستی کوئی سیال شئے ڈالتی ہوئی سپاٹ لہجے میں گویا تھی۔وہ دوبارہ ہوش کھونے لگا۔دوسری صبح عبداللہ بھی کسی پلاسٹک میں قید اجنبی سسکیوں کے درمیان آخری سفر کو نکل پڑا۔۔۔افسوس اس بات کا تھا کہ آخری سفر پر وہ بالکل تہی دامن تھا۔۔۔رشتوں سے۔۔۔روح سے اور۔۔۔!!!!!

جیکٹ کے داغ

فیصل عظیم
(کینیڈا)

''کیا خیال ہے، کافی لیں؟'' برابر بیٹھے دوست نے گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

کافی کے نام کی گرمی نے ٹھنڈ کا احساس کچھ اور کم کر دیا تو میں نے جیکٹ کے بے رنگ ہوتے بٹن کو چھپاتے ہوئے اپنے اُونی دستانے جیب میں رکھ لیے اور اُس شخص کے کھلے ہاتھوں کے بارے میں دوبارہ سوچنے لگا کہ اچھا ہوتا اگر میں اُسے اپنے دستانے دے ہی دیتا۔ دستانے تو میرے پاس اور بھی تھے مگر میں زیادہ تر یہی اُونی دستانے پہنا کرتا تھا، جو اماں نے میرے لیے خود بُنے تھے۔

''اماں کے ہاتھ کے بُنے دستانے اُسے دے دیتا۔۔۔!''

''ویسے دے دیتا تو وہ خوش ہی ہوتیں''

''مجبوری تھی! کاش آج میں کوئی اور دستانے پہنے ہوتا یا کم سے کم ایک اور جوڑا ہی جیب میں رکھا ہوتا جو بعض اوقات رکھا ہوتا ہے''

خود کلامی کے سرد، گرم جھونکے، گاڑی کی گرم ہوا کا مزہ کرکرا کیے جاتے اور میں راستے میں برف کے ڈھیر دیکھ کر خود سے کہتا جاتا۔ ''میں بے حس نہیں ہوں ورنہ کھانا بانٹنے کیوں آتا بلکہ میں نے تو اُس سے کہا بھی تھا کہ بہت سردی ہے، احتیاط کرو''

''اُس آدمی کو دیکھا تھا؟'' میں نے اپنے جیکٹ پہ لگے داغ کو ہاتھوں سے چھپاتے ہوئے دوست سے پوچھا۔ ''نہ جیکٹ، نہ دستانے، بغیر آستین کی قمیض۔ دیکھنے میں تو جوان آدمی لگ رہا تھا، لیکن پھر بھی اتنی سردی میں۔۔۔''

''جی، میں نے دیکھا تھا، بیچارا۔ ہمارے پاس کچھ تھا نہیں ورنہ اُسے دے دیتے۔ ویسے ہمیں کچھ گرم کپڑے ساتھ رکھنے چاہئیں''۔ میرے دوست کے لہجے میں جھرجھری تھی۔ ہماری دوستی میں اتنا تکلّف تھا کہ ایک دوسرے کو ''آپ'' کہہ کر مخاطب کیا کرتے۔ خاص گوروں کے غریب علاقے میں مرکزی پارک کے کنارے ہر اتوار کی طرح کھانا بانٹنے کے بعد ہمارے دوسرے ساتھی اپنی اپنی گاڑیوں میں چل دیے تھے اور ہم دونوں ایک گاڑی میں اپنے گھر کی جانب رواں تھے۔ پھر اُس متوقع میئر کا قصّہ چھڑ گیا جس نے ایک دن ہمیں کھانا بانٹتے دیکھ کر ہمارے ساتھ تصویر کھنچوائی تھی۔

''اِس جگہ سے شہر کے سبھی بڑے لوگ گزرتے ہوں گے، سیاستدان، کونسلر، بیوروکریٹ وغیرہ، مگر کسی کو یہ بھوک اور غربت نظر نہیں آتی؟ دنیا جسے اتنا ترقّی یافتہ ملک سمجھتی ہے، یہاں بھی عام آدمی کے لیے کوئی کچھ نہیں کرتا یا شاید کرنا نہیں چاہتا'' میں نے کہا تو دوست نے میری بات کو آگے بڑھایا، ''غریبوں کی کسی کو پروا نہیں ہوتی''۔ پھر ٹیکس کا ذکر چھڑ گیا اور ہم اُس گورے کو بھول گئے جو منفی تیس ڈگری ٹھنڈ میں بھی محض ٹی شرٹ اور جینز پہنے، سینے پر ہاتھ باندھے، کھلے آسمان تلے ہمارے پاس سُوپ لینے چلا آیا تھا۔

''کچھ لوگوں کی عادت بھی ہو جاتی ہے، کام نہ کرنے کی''۔ دوست کی اِس بات پر میں نے بھی لقمہ دیا ''جی، اور جو کام کرنا چاہتے ہیں، وہ بھی ان کی وجہ سے بدنام ہو جاتے ہیں''

''ویسے ایک بات ہے، بدنام ہم زیادہ ہیں۔ حالانکہ ٹیکس بھی دیتے ہیں جو آخر انہی لوگوں تک پہنچتا ہے، مگر پھر بھی گورے اپنے مسائل کی وجہ باہر سے آنے والوں ہی کو سمجھتے ہیں۔ بدا چھا، بدنام برا'' میں بولتا چلا گیا۔ ''آپ کو پتہ ہے ٹیکس بچانے میں بھی گورے کسی سے پیچھے نہیں ہیں، مگر بس ان کے علاوہ سب برے ہیں''۔

میں نے اپنے تجربات کی تلخی اُنڈیلی تو دوست نے بھی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا ''صحیح کہہ رہے ہیں آپ، عجیب حال ہے۔ آمدنی نہ ہو مگر عیش کرنے ہیں۔ فون بہترین، گاڑی اچھی والی مگر حکومت سے امداد بھی لینا ہے۔ یا شاید انھیں پتہ ہی نہیں ہوتا کہ کرنا کیا چاہیے۔ یہ بیچارے تو خود اپنے ساتھ بھی کچھ اچھا نہیں کرتے، الا بلا کھاتے ہیں جبھی تو بیمار رہتے ہیں۔ یہ غربت بڑی خطرناک چیز ہے''

''وہ لڑکیاں اور ان کے دوست یاد ہیں، کیسے ویلفیئر کا پیسہ اڑاتے تھے؟ نشہ، پارٹی، پیسے کا ضیاع، فراڈ اور جب ان کی رپورٹ ہوئی تو بھی پولیس نے انہیں کا ساتھ دیا۔ آخر گورے جو تھے''۔ میں نے ایک واقعہ یاد دلاتے ہوئے کہا تو مجھے اس گورے کی مسکراتی آنکھیں اور گوری چمڑی پھر سے یاد آ گئی۔ ''اُسے کیا ویلفیئر والوں نے نہیں دیکھا ہوگا'' میں نے کہا۔

''جی یاد ہے۔ سب ایک سے نہیں ہوتے، اچھے برے ہر جگہ ہوتے ہیں۔ ویسے ویلفیئر والوں کا بھی کیا قصور، لوگ ناجائز فائدہ بھی تو اٹھاتے ہیں، ہمارے لوگوں کو موقع ملے تو وہ بھی کب چھوڑتے ہیں۔ ان بیچاروں کو ہی دیکھ لیں جو پارک میں آتے ہیں۔ ان کے پاس گاڑی تو کیا، شاید رہنے کی جگہ بھی نہ ہو''۔ دوست نے کہا۔

گاڑی کے نام پہ مجھ پر خیالوں کی برف پھر سے گرنے لگی ''ڈگی میں کمبل رکھا ہوتا ہے، آج اپنی گاڑی لایا ہوتا تو اس آدمی کو کمبل ہی دے دیتا۔۔۔ جس سردی میں گرم کپڑوں میں بھی رنگ اُڑ جاتا ہے، جانے وہ کیسے برداشت کر رہا تھا۔۔۔ پتہ نہیں زندہ کیسے تھا۔۔۔ جب میں نے کہا کہ تم ایسے کیسے اتنی سردی میں باہر آ گئے ہو تو کیسے خوش دلی سے مسکرا کر بولا تھا۔۔۔ یہ بیک پیک ہے نا۔۔۔ عجیب آدمی تھا''۔

اُس شخص نے اپنا پُھٹارہ بیٹھ کے بجائے سینے پہ باندھ رکھا تھا تاکہ سینہ ہوا سے بچا رہے۔ تب میں نے اپنی اُونی ٹوپی کو کانوں کی لَو تک کھینچ کر کہا تھا ''سردی بہت زیادہ ہے اور آج کے لیے تو موسمیات والوں نے خاص تنبیہ کی ہے۔ مگر تمھارے پاس نہ جیکٹ ہے، نہ دستانے، تمھارے تو بازو بھی کھُلے ہیں''۔ مگر وہ بس ''میں ٹھیک ہوں'' کہہ کر مسکراتا ہوا، برف کے ڈھیر سے بچتا بچاتا، پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے لائن میں جا کھڑا ہوا تھا۔

''کافی کون سی؟'' دوست نے پوچھا۔ کافی لے کر ہم رُکے نہیں،

راستے میں پیتے رہے اور گتے کے کپ سے ہاتھ سینکتے رہے۔

''پلاسٹک یا اسٹائروفوم کی جگہ یہ کپ تو ٹھنڈے ہاتھوں کے لیے بھی اچھے ہیں۔ پلاسٹک تو گلنے میں بھی ہزار سال لگا دیتا ہے''۔ یہ کہتے ہوئے میری نظر جیکٹ کے مڑے ہوئے کنارے پر لگے ایک اور داغ پہ پڑی تو میں پھر خیالوں میں کھو گیا۔

''یہ جیکٹ اتنے سال بعد بھی خراب نہیں ہوئی، کتنی گرم اور اچھی حالت میں ہے۔ جتنا ہو سکا اسے چلا کر دکھاؤں گا۔ ریکارڈ بھی رہے گا اور یاد بھی۔ ایک بٹن کا رنگ اُڑ گیا تو کیا ہوا، داغ تو صاف ہو جاتے ہیں۔۔۔ کراچی میں سردی ہوتی ہی کتنی ہے مگر وہاں کی جیکٹ، اتنی اچھی اور سستی، کینڈا میں تو ایسی جیکٹ بہت مہنگی ملتی ہے!'' خیالوں کی اس بھاپ سے میرے اندر ایک نامعلوم تفاخر کا احساس جاگا اور ساتھ ہی اس عجیب جذباتی وابستگی نے گرم تھپکی دی۔

''میں نے اگر اپنی جیکٹ اُسے نہیں دی تو مجبوری تھی، لیکن کیا کوئی بھی نہیں دے سکتا تھا!'' میں نے جیکٹ پہ پڑے ایک اور دھبّے سے نظر چراتے ہوئے سوچا۔ ''لیکن میں دیتا بھی کیسے، خود کیا کرتا؟ یا شاید گاڑی میں بیٹھ جاتا، کام کرنے کے لیے تو اور لوگ بھی تھے؟ ہاں لیکن یہ جیکٹ! خیر اپنی جیکٹ اُتار کر نہیں دی تو اتنی بڑی بات تو نہیں، گرم سُوپ تو پلا دیا نا۔ کئی سال چلائی ہے، کئی سال اور چلانی ہے''۔

سوچتے سوچتے میں نے ایک دم سوال داغا ''وہ آدمی تیس کا تو ہوگا؟''

''ہاں، شاید ہوگا'' دوست نے جواب دیا۔

گھر آنے والا تھا، سو میں نے جیب سے دستانے نکال لیے جن میں دو چھوٹے چھوٹے سوراخ ہو گئے تھے۔ ''اسے ٹھیک کروا لینا چاہیے''۔ شاید ہم میں سے کسی نے کہا تو میں چونک اٹھا، ہم اپنی گلی میں مڑ چکے تھے۔

''جیکٹ دھولوں ورنہ یہ داغ ہمیشہ کے لیے رہ نہ جائیں''۔ میں نے ٹوپی کھینچ کر اپنے کان پورے بند کرتے ہوئے سوچا۔ گھر کے سامنے گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تو کپ کے ڈھکنے سے جھولتا ہوا کافی کا ایک قطرہ ہار مان کر ٹپک گیا اور جیکٹ پہ ایک اور داغ نمایاں ہو گیا۔

Ordering a Pizza in 2022

CALLER: Is this Pizza Hut?

GOOGLE: No sir, it's Google Pizza.

CALLER:I must have dialed a wrong number, sorry.

GOOGLE: No sir, Google bought Pizza Hut last month.

CALLER: OK. I would like to order a pizza.

GOOGLE: Do you want your usual, sir?

CALLER: My usual? You know me?

GOOGLE:According to our caller ID data sheet, the last 12 times you called you ordered an extra-large pizza with three cheeses, sausage, pepperoni, mushrooms and meatballs on a thick crust.

CALLER: Super! That's what I'll have.

GOOGLE:May I suggest that this time you order a pizza with ricotta, arugula, sun-dried tomatoes and olives on a whole wheat gluten-free thin crust?

CALLER: What? I don't want a vegetarian pizza!

GOOGLE: Your cholesterol is not good, sir.

CALLER: How the hell do you know that?

GOOGLE:Well, we cross-referenced your home phone number with your medical records. We have the result of your blood tests for the last 7 years.

CALLER:Okay, but I do not want your rotten vegetarian pizza! I already take medication for my cholesterol.

GOOGLE:Excuse me sir, but you have not taken your medication regularly. According to our database, you purchased only a box of 30 cholesterol tablets once at Lloyds Pharmacy, 4 months ago.

CALLER: I bought more from another Pharmacy.

GOOGLE: That doesn't show on your credit card statement.

CALLER: I paid in cash.

GOOGLE: But you did not withdraw enough cash according to your bank statement.

CALLER: I have other sources of cash.

GOOGLE:That doesn't show on your latest tax returns, unless you bought them using an undeclared income source, which is against the law!

CALLER: WHAT THE HELL!

GOOGLE: I'm sorry sir, we use such information only with the sole intention of helping you.

CALLER: Enough already! I'm sick to death of Google, Facebook, Twitter, WhatsApp and all the others. I'm going to an island without the internet, TV, where there is no phone service and no one to watch me or spy on me.

GOOGLE:I understand sir, but you need to renew your passport first. It expired 6 weeks ago...Welcome to the future

وقت کی آواز

رعنا کوثر
(نیویارک)

سونیا وقار احمد نے اپنا ڈریس تبدیل کر کے ساڑھی اور بلاؤز پہنا اور آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو وہ کچھ دیر اپنے آپ کو پہچان نہیں سکیں۔ مشرقی عورت کا یہ روپ وہ بہت پیچھے چھوڑ آئیں تھیں۔ ان کی بیٹی کی آواز نے انہیں چونکا دیا ''امی چلیں'' وہ بولی پھر وہ ان کے کپڑوں کو دیکھ کر حیران ہوئی ''آپ نے بہت عرصے بعد ساڑھی پہنی ہے''۔ وہ بولی ہاں انہوں نے آہستہ سے سر ہلایا اور باہر نکل آئیں۔ ان کے بیٹے نے باپ کو سہارا دے کر گاڑی میں بٹھایا سامان پہلے ہی گاڑی میں رکھا جا چکا تھا گاڑی تیزی سے سڑکوں پہ دوڑتی ہوئی ائیر پورٹ کے راستے پے گامزن تھی۔ کار میں مکمل خاموشی تھی ہر شخص اپنی سوچ میں گم تھا۔ خوبصورت صاف ستھری سڑکیں چمکتی ہوئی گاڑیاں۔ سجے سجائے گھر ہر چیز پیچھے کی طرف جا رہی تھی اور وہ آگے سب سے آگے۔ سونیا سوچ رہی تھی آج سے بہت سال پہلے جب وہ پاکستان سے آئی تھیں تو ان کی گاڑی ائیر پورٹ سے نکل کر گھر کی طرف رواں دواں تھی۔ یہ گھر یہ شہر یہ ملک جہاں وہ پہلی دفعہ آئیں تھیں وہ حیرت سے راستے میں گزرتے درختوں سڑکوں اور گھروں کو دیکھ رہی تھی۔ جب گاڑی ان کے گھر کے آگے رکی تو خوشی سے ان کے قدم زمین پر نہ پڑ رہے تھے۔ وقار صاحب نے جب اپنے چھوٹے سے گھر کا دروازہ کھولا تو وہ اس میں کھو کر رہ گئی جو عمدہ دبیز قالین اور عمدہ فرنیچر سے مزین تھا۔ انہوں نے الماری کھولی تو وہاں خوبصورت سوٹ لٹکے تھے۔ ان کے شوہر جو ایک اچھی فرم میں ملازم تھے انہوں نے کہا ہم یہاں غیر ملک میں آباد ہیں۔ اردگرد کوئی اپنا بھی نہیں ہے تم بہتر ہے کے یہاں کے رنگ میں ڈھل جاؤ۔ سونیا کی عمر انیس سال تھی وہ ایک سیدھی سادھی باہر کی دنیا کے خواب دیکھنے والی لڑکی تھی۔ وہ بہت خوش ہوئیں۔

زندگی اپنی رنگینیوں کے ساتھ گزرتی رہی۔ سونیا نے بھی ایک جاب شروع کر دی پانچ دن وہ لوگ مصروف رہتے اور چھٹی کا دن۔ چھٹی کا دن دوستوں میں گزارتے وقار صاحب آزادی پسند انسان تھے۔ دونوں مغربی معاشرے میں اپنے آپ کو اس کی اچھائی برائی سمیت اپنا چکے تھے۔ سونیا نے اپنے شوہر کی ہر بات مانی تھی۔ وہ ان کے ساتھ کلب بھی جاتی۔ ڈرنگ بھی کرتی ان کے دو بچے تھے ایک بیٹا اور بیٹی بچوں کی پیدائش کے بعد ان کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا وہ بچوں کو بے بی سینٹر چھوڑتے مگر کلب ضرور جاتے۔ حالانکہ بچوں کی پیدائش کے بعد سونیا نے جاب چھوڑ دی تھی اور مکمل طور پر ان کی دیکھ بھال میں لگ گئی تھی۔ بچے بہت ذہین تھے اسکول سے کبھی ان کی شکایت نہیں آئی۔ ان کی ہر ممکن کوشش تھی کہ بچے اچھے شہری بنیں اور پڑھائی میں بہترین ثابت ہوں۔ دونوں ہی اسکول میں مقبول تھے۔ بہت اچھا پڑھتے تھے دونوں نے کالج کی دنیا میں قدم رکھا تو اس وقت تک سونیا بھی کافی باشعور ہو چکی تھی۔ اب کچھ اپنے لوگ بھی آ گئے تھے مسجدیں بھی کھل گئی تھیں۔ نئے دیسی پروگرام ہوتے۔ ان کا دل بھی مغربی انداز سے کچھ بھر گیا تھا وہ بہت ساری چیزوں سے توبہ کر چکی تھیں۔ اب وہ اکثر سوچا کرتی تھیں جب وہ یہاں پر نئی آئی تھی تو کتنی ناسمجھ تھی۔ ایک دفعہ بھی برائی کے خلاف سینہ سپر نہ ہوئیں۔ ایک دفعہ بھی وقار صاحب کو اس دلدل سے نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ وہ دونوں ہی شریف خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ پھر کیوں عیاشی میں ڈوب گئے تھے۔ کیا ایک ساتھی کا فرض نہیں وہ دوسرے کا ہاتھ کھینچ کر باہر نکالے۔ انہوں نے اپنے بچوں پر بھرپور توجہ دی تھی بہترین اسکولوں میں پڑھایا مہنگے سے مہنگے شوق پورے کیے مگر اپنی تہذیب اپنے مذہب سے دور رکھا۔

بچے آہستہ آہستہ بڑے ہو گئے اپنے پروفیشن میں ماہر ہو گئے۔ وقار صاحب بیمار رہنے لگے وہ ان کی بہت خدمت کرتی تھیں۔ بچے بھی ہر ہفتے گھر آتے۔ مگر وقار صاحب ٹوٹ گئے تھے، وہ کافی تنہائی محسوس کرتے تھے، آخر دونوں نے فیصلہ کیا پاکستان چلے جائیں۔ شاید تبدیلی سے ان کی صحت پر اثر پڑے اور آج ان کی واپسی کا دن تھا۔ بچے بہت اداس تھے مگر وہ پاکستان جا کر آباد نہیں ہو سکتے تھے ہاں ہر سال آنے کا وعدہ ضرور کیا تھا۔

''مما ائیر پورٹ آ گیا'' ان کی بیٹی کی آواز انہیں سوچوں کی دنیا سے واپس لے آئی۔ دونوں میاں بیوی گاڑی سے اترے بچوں کو گلے لگایا ان کے بیٹے نے آگے بڑھ کر انہیں محبت سے دیکھا۔

پھر اپنے گلے میں پڑی ہوئی کراس صلیب نکال کر باپ کو دی'' ڈیڈی اسے پہن لیں سسٹر لارا کہتی ہیں یہ دنیاوی مصیبتوں سے بچاتی ہے''۔ وقار صاحب نے اسے واپس کرتے ہوئے کہا ''بیٹا تم نے ہمارا مذہب چھوڑ دیا تم نے کرسچن مذہب کو اپنایا'' پھر انہوں نے اپنی بیٹی کو دیکھا جو اپنے بوائے فرینڈ رچرڈ سے شادی کرنے والی تھی ''تم دونوں کو ہم سنبھال نہیں پائے مگر میرے باپ نے جب میں وہاں سے چلا تھا۔ ایک چھوٹا سا قرآن شریف کا لاکٹ مجھے دیا تھا جو میں مصروفیات میں کبھی کھول کر نہیں دیکھ سکا تھا۔ مگر آج پہن کر واپس جا رہا ہوں'' وہ بولے ''ہم سب جب یہاں آتے ہیں تو اپنی زندگی کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں''۔ انہوں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا ان کے اندر کا مذہب انگڑائیاں لے کے کھڑا ہو رہا تھا۔ ان کی تہذیب ان کا کلچر ان کے اندر نئے بچے کی طرح حمک رہا تھا۔ انہوں نے اپنی بیوی سونیا کی طرف دیکھا یوں لگا جیسے وہ کچھ کہہ رہی ہوں'' کاش ہم وقت کو پکڑ لیتے۔ کاش یہ دونوں آج پیدا ہوئے ہوتے''۔ یہ کاش کا خلاء اب زندگی بھر ان دونوں کی زندگی میں رہے گا۔ وقت کی بازگشت تو سنائی دیتی ہے اسے آپ پکڑ تو نہیں سکتے سونیا یہ سوچتے ہوئے جہاز میں بیٹھ گئیں۔ ان کے بچے اور وہ دیس پیچھے رہ گیا تھا۔ وقار صاحب نے سونیا کی طرف دیکھا اور اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ کر تسلی دینے والے انداز میں بولے۔

باقی صفحہ ۴۷ پر ملاحظہ کیجیے

صحرا میں اذان

گلزار جاوید
(راولپنڈی)

سیڑھیوں کی رنگت' چوڑائی' موٹائی اور تعداد پہلے جیسی تھی۔ ہمیشہ کی مانند روشنی کی مقدار بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ جس طرح پہلے یہاں ویرانی برستی تھی اُسی طرح آج بھی اُلّو بول رہے تھے۔ سیڑھیوں کا فاصلہ اور ماحول' بہت مانوس تھے۔ اُس کی زندگی کے بہت سے خوبصورت' سنہری ایام کی یادیں انہیں سیڑھیوں سے وابستہ تھیں۔ سیڑھیوں پر چڑھنے اور اُترنے کی اُسے اتنی عادت ہو گئی تھی کہ آنکھوں پر پٹی باندھ کر بھی وہ ایک ردھم اور مخصوص وقت میں سیڑھیوں کا فاصلہ طے کر سکتا تھا۔ آج! جس سرعت اور پھرتی سے اس نے سیڑھیوں کا فاصلہ طے کیا تھا اس سے چہرے کا رنگ سرخ اور دل کی دھونکنی کافی تیز ہو گئی تھی مگر چہرہ پر تکلیف کے آثار نظر آنے کے بجائے جوش اور ولولہ کی کیفیت نمایاں تھی۔

وقت سے پہلے کسی تقریب میں پہنچنے کا اس کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ جس کے باعث' یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ خوشی کی کیفیت سے دوچار ہے یا گھبراہٹ کے زیر اثر یہ حادثہ سرزد ہو گیا ہے۔ خلاف توقع' بال سلیقہ سے بنے ہوئے' تازہ خضاب کی سیاہی اور چمبیلی کے تیل کے ساتھ بھینی بھینی خوشبو بھی اُس کے چاروں اُور پھیلی ہوئی تھی۔ چھاتی کے سفید بالوں سے عمر کا اندازہ لگانا ممکن نہ تھا۔ گریبان کے بٹن' جیل کے پھاٹک کی مانند سختی سے بند تھے اور پہرے دار کی شکل میں اُس پر کلغائی کی حکمرانی تھی۔ چوں چراں کی میوزیکل آواز کے حامل کوہاٹی سینڈل کی جگہ' لش لش کرتی نئی گرگابی نے دونوں پیروں کو' موچی کے جمبور کی مانند گرفت میں لیا ہوا تھا جس کے باعث' اس کی چال میں اٹھک' بیٹھک والا ردھم ندارد تھا۔ سنبھل سنبھل کر' سوچ سوچ کر قدم بڑھاتا اور چہرہ پر مصنوعی' مسکراہٹ سجا کر اُس تکلیف کو چھپانے کی کوشش کرتا جو پیروں کو نئے جوتے کی تنگی کے باعث برداشت کرنا پڑ رہی تھی۔

ہال میں داخل ہو کر وہ کچھ ٹھٹکا۔ ہال کی فضا' کچھ بدلی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ گردوپیش پر نظر ڈال کر' اُس نے تسلی کرنا چاہی' سب کچھ اپنی جگہ ویسا ہی تھا جیسا ہر تقریب سے قبل ہوا کرتا تھا۔ چاروں کونوں کا طواف کرتی نگاہ' سامنے لگی کرسیوں کی قطار پر ٹھہر گئی۔ خاص مہمانوں کے لئے' اگلی رو میں پڑے صوفوں کے علاوہ کل پانچ قطاریں تھیں۔ ہر قطار میں' دس کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ انگلیوں کو گھما کر' کرسیوں کی تعداد شمار کرنے کے بعد' گنتی پچاس پر جا کر ٹھہر گئی۔ چہرہ پر بدمزگی کے آثار نمایاں ہوئے' بل زدہ پیشانی پر چند سلوٹیں اور نمایاں ہو گئیں۔ بے چینی' بے قراری کی کیفیت میں' کلائی پر بندھی' ویسٹ اینڈ واچ کو غور سے دیکھ کر وقت کا اندازہ لگایا۔ مقررہ وقت سے نصف گھنٹہ اوپر ہو چکا تھا اور وہ' مہمانوں کی صورت کو اس طرح ترس رہا تھا جس طرح جوانی کے ایام میں' ایک کپ چائے یا سگریٹ کے ایک کش کو ترستا تھا۔

یکا یک! خیالات کا دھارا پریس فوٹو گرافر کی جانب' گھوم گیا۔

گزشتہ ایک ہفتہ سے' نہ جانے کتنی بار' اُس کے گھر کے چکّر لگا کر تقریب کے دن' وقت اور مقام کی بابت یاددہانی کرائی تھی۔ ہر بار اُس نے مقررہ وقت پر پہنچنے کا پکا یقین دلایا تھا۔ کمبخت کہیں کا! تصویر نہیں کھینچنی تھی' بیشک! نہ کھینچتا' کم از کم کیمرہ تو گھما جاتا' بھلے ہی رِیل کے بغیر عین' انور حسرت اور محمود کی طرح' جب انہوں نے ایامِ شباب میں اُس کے فلمی جنون کو دیکھتے ہوئے' بھرے بازار میں خالی کیمرہ گھما کر' ہیرو بنانے کے عوض' اُسے دونوں ہاتھوں سے لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ جس کے بعد' دوستوں اور رشتہ داروں میں بھرم برقرار رکھنے کے لئے اُس نے ذاتی فلم شروع کر ڈالی تھی جہاں' ہارون شاہ کے بھیس میں' انور حسرت اور محمود' پہلے سے موجود تھے۔

انور حسرت اور محمود کے واقعے نے' پریس فوٹو گرافر کی گلوخلاصی کر دی تھی۔ اُس کی جگہ' مایوسی نے غلبہ پا لیا تھا جس کے زیر اثر' ایک ایک کر کے اُن دوستوں اور بہی خواہوں کی شبیہیں اُبھرنا شروع ہو گئیں۔ جنہیں' اُس نے خود جا کر دعوت نامے دیئے۔ پُرانے تعلق اور اپنی خدمات کے عوض تقریب میں آنے کی تاکید بلکہ درخواست کی تھی۔ اُن کی غیر حاضری کی صورت میں ناراضگی کی دھمکی دینا بھی نہ بھولا تھا۔

ایک بار پھر' اُس کے چہرے کی کیفیت بدلی۔ اِس بار' اُس کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی جس میں خوشی کی نسبت حقارت کا عنصر نمایاں تھا۔ غیر ارادی طور پر' دایاں ہاتھ پتلون کی سائیڈ پاکٹ میں کچھ تلاش کرنے لگا۔ تھوڑی کوشش کے بعد سگریٹ کی بیش قیمت ڈبی برآمد ہو گئی جس کے اندر' اُس کے مخصوص اور کڑک برانڈ کے سگریٹ' بے ترتیبی سے ٹھنسے ہوئے تھے۔ ایک سگریٹ نکال کر' سگریٹ کی ڈبی پر فلٹر والی سائیڈ اور تمباکو والی طرف سے سگریٹ کو بار بار ٹھونک بجا کر' تمباکو والی سمت کو زبان پر پھیرتے ہوئے گیلا کیا اور جب فلٹر والے سرے کو ہونٹوں میں دبا کر پتلون کی بائیں جیب سے ہاتھ باہر نکالا تو چم چم کرتا' سگریٹ لائٹر اُس کے ہاتھوں میں تھا جس کے تیز اور روشن فلیم سے سگریٹ سُلگا کر' دھوئیں کے گاڑھے' لچھے دار مرغولے فضا میں بکھیرنے لگا۔

کہنیوں کے بل' پیچھے کھلنے والی کھڑکی میں منہ لٹکائے' باہر کا نظارا بہت بھلا لگ رہا تھا۔ سگریٹ کے دھوئیں سے پھیپھڑوں میں ہونے والی سوزش' تازہ ہوا کے ذریعے' کسی قدر کم ہو رہی تھی اور طبیعت میں ٹھہراؤ آ رہا تھا۔ وقت' دبے پاؤں مخالف سمت گامزن ہو گیا۔

''نہیں' نہیں کل کیوں؟ میں آج ہی سنوں گا بلکہ ابھی سنوں گا۔ آپ روز' کل پر ٹال دیتی ہیں''۔ پانچ سے چھ سال کی عمر کا' سرخ سپید' گول مٹول بچہ اپنی دادی کی گود میں بیٹھا' لال پری کی کہانی سننے کی ضد کر رہا تھا۔ پہلی بار!

''چہارسُو''

دادی نے اُسے لال پری کی کہانی سنائی تو اُسے' اتنی اچھی لگی کہ وہ ہر روز لال پری کی کہانی سننے کی ضد کرنے لگا۔ دادی کو لال پری کی صرف ایک کہانی یاد تھی۔ وہ' روز روز کہاں سے' بچے کی ضد پر لال پری کے نئے قصے ڈھونڈ کر لاتیں۔

لال پری' ہر رات شہزادے کو آسمانوں کی سیر پر لے جاتی' خوبصورت محلوں' باغوں' دریاؤں' آبشاروں کی سیر کراتی۔ طرح طرح کے میوے کھلاتی اور گھنٹوں اپنی حسین ہمجولیوں کے ہمراہ طرح طرح کے کھیل کھلاتی۔ لال پری کی سہیلیاں اکثر شہزادے کی بابت لال پری سے دریافت کرتیں تو لال پری شہزادے کی جانب دیکھ کر' شرما جاتی۔ کھلکھلا کر ہنسنے کے سوا کوئی جواب نہ دیتی۔ شہزادہ صبح سو کر اٹھتا تو اس کا اپنی مملکت میں دل نہ لگتا۔ محل کی شہزادیاں' کنیزیں اور خادمائیں اُسے بھونڈی اور بدصورت نظر آتیں۔ لال پری اور اُس کی سہیلیوں کے حسین و دلکش چہرے دن بھر اُس کا احاطہ کئے رکھتے۔ شہزادہ بے چینی' بے قراری سے رات کا انتظار شروع کر دیتا اور لال پری سے ملاقات کی آرزو میں سرِ شام ہی سونے کے کمرے میں چلا جاتا جہاں سکون ہی سکون' اطمینان ہی اطمینان اور راحت ہی راحت اُس کے منتظر ہوا کرتے تھے۔

ایک دن' بچے کو شرارت سوجھی اور اُس نے دادی کو آزمائش میں مبتلا کر دیا۔ ''آپ روز' روز جنوں اور پریوں کی کہانی کیوں سناتی ہیں؟ انسانوں کی کہانیاں' آپ کو نہیں آتیں کیا؟''

''نا میرے لال نا! خدا میری زندگی میں وہ دن کبھی نہ لائے کہ میں' اس کے بندوں کی بدخوئی کروں؟''

''بدخوئی کیا ہوتی ہے دادی؟''

''پیٹھ پیچھے انسانوں کی برائی کو' بدخوئی کہتے ہیں۔''

''آپ! برائی نہ کریں نا! اچھی اچھی کہانیاں سنائیں!''

''آ ۔۔۔ ہا۔۔۔ بیٹا! اب میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں' اچھے انسانوں کا' کال ہونے کی وجہ سے اچھی باتیں اور سچے قصے ناپید ہو گئے ہیں۔''

''چھوڑیں دادی! آپ اچھے بُرے کے چکر میں کیوں پڑتی ہیں۔ بس مجھے کہانی سنائیں۔''

''توبہ' توبہ کرو بیٹا! اللہ میاں سے توبہ کرو۔ پتہ ہے! پرانے وقتوں کے لوگ بھی اسی طرح کی باتیں کیا کرتے تھے' انہیں اللہ میاں نے بہت سخت سزا دی تھی۔''

پُرسکون و پُر لطف تصوراتی سلسلہ' قدموں کی دھم دھم سے منقطع ہو گیا۔ مہمانوں کی آمد کے خیال سے' ادھ جلا سگریٹ' زمین پر پھینک کر' پیر سے مسلتے ہوئے' دونوں ہاتھوں سے سر کے بال درست اور چہرہ پر مسکراہٹ سجائے ہوئے' استقبالی انداز میں قدم بڑھائے۔ سنا ہے! پہلے مہمان کا قدم' مبارک ہوتا ہے۔ جس طرح سیڑھیوں کی دھمک عارضی تھی اُسی طرح اُس کی خوشی بھی عارضی ثابت ہوئی۔ جس شخص کو مہمان سمجھ کر' اُس کا دل بلیوں اُچھلنے لگا تھا وہ متعلقہ محکمہ کا ملازم! دفتر ہذا کا چپڑاسی تھا شکل سے بیمار اور زمانے کا ستایا لگتا تھا۔

''سنو! کیا نام ہے تمہارا۔۔۔ ایک گلاس پانی مل جائے گا۔''

گرچہ پانی کی اُسے طلب نہ تھی مگر گلے میں چبھنے والی پھانسوں کا علاج بھی ضروری تھا۔ پانی کے چند گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد' طبیعت میں پائی جانے والی بے چینی دور ہونے لگی۔ چند ڈکاریں لینے کے بعد اُسے بشاشت کا احساس ہوا اور خود بخود' اُس کی زبان سے الفاظ تشکر ادا ہونے لگے۔

''اور تم اپنے رب کی' کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔''

روشنی کے بلب' بجلی کے پنکھے' روسٹرم اور صوفوں کا' پھر سے جائزہ لینے کے بعد اس کی توجہ کا مرکز' پانچ قطاروں میں لگی' پچاس کرسیاں تھیں۔ دس ضرب پانچ برابر پچاس۔ یہ تو بہت معمولی تعداد ہے۔ اخبارات میں تصاویر دیکھ کر' لوگ باگ ضرور' چہ میگوئیاں کریں گے۔ کچھ دیر یکسوئی سے سوچنے کے بعد ہر قطار میں سے تین کرسیاں الگ کر کے' پانچ کی تعداد کو سات تک پہنچا دیا' یعنی اب سات ستے انچاس' ایک لائن کے اضافہ کی' دل میں ابھی بھی خواہش تھی جبکہ کرسی ایک بچتی تھی۔ بچ رہنے والی کرسی کو آخری قطار میں لگا کر' کرسیوں کی جانب پشت کر کے اب وہ ڈھیلا کھڑا ہو گیا اور دائیں' بائیں دیکھتے ہوئے' پیر ہلا کر گنگنانے کی کوشش کرنے لگا۔ ہاتھ کی صفائی سے' چپڑاسی کو بے خبر رکھنا اُس کی مجبوری تھی۔ ایک بار پھر اُس کی توجہ کا مرکز پانی کا گلاس تھا جس میں ابھی پانی موجود تھا۔ باقی کا پانی پی کر' حسب عادت' بے خیالی میں' آستین سے ہونٹ خشک کئے اور سگریٹ سلگا کر پھر سے کھڑکی کے باہر کا نظارا کرنے لگا۔

''دادی جان! بتائیں نا' کیا سزا دی تھی اللہ میاں نے پُرانے لوگوں کو اور کیوں دی تھی؟''

''اچھا یہ بتاؤ! ہم لوگ انسان بننے سے پہلے' کیا تھے؟''

''ہم ۔۔۔ انسان بننے سے پہلے کیا تھے۔۔۔ ہم انسان بننے سے پہلے' حیوان تھے۔ ہماری مس نے ہمیں بتایا ہے کہ ہماری شکل' پہلے بندر اور لنگور کی طرح ہوتی تھی۔''

''شاباش! پہلے زمانے میں جب اچھے لوگوں کا' کال پڑنے لگا تو انہوں نے اپنے باپ' دادا' عزیز رشتہ داروں کی بہادری' شجاعت اور فیاضی کے جھوٹے قصے گھڑنا شروع کر دیئے جو ان کے مخالف تھے انہوں نے' ان سے بڑھ کر اپنے بزرگوں کی جھوٹی تعریفیں کرنا شروع کر دیں۔ اس طرح سے پہلے مقابلے پھر دشمنی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اب وہ لوگ' ایک دوسرے کے بزرگوں' دوستوں اور رشتہ داروں کی برائیاں بڑھا چڑھا کر بیان کرنے لگے اور طرح طرح کی بہتان تراشی کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ جب اُن لوگوں نے جھوٹ اور کذب بیانی کی انتہا کر دی تو اللہ تعالی نے اپنے نیک بندوں کے ذریعے انہیں اس عمل سے' باز رہنے کی تنبیہہ کی۔ ان لوگوں پر اللہ اور اس کے نیک بندوں کی ہدایت کا کوئی اثر نہ ہوا تو اللہ تعالی نے انہیں اپنے عذاب سے ڈرایا پھر بھی وہ لوگ باز نہ آئے تو' اللہ تعالی نے' انہیں بری باتوں سے روکنے کے لئے سامانِ عبرت بنا دیا۔

''کیا بنا دیا۔۔۔دادی؟''

''بھئی! اُن کی شکلیں بدل دیں۔جسم تو ان کے انسانوں کی طرح کے رہ گئے اور شکلیں پھر سے' بن مانس' چمپنزی' بندر' لنگور جیسی کر دی گئیں تا کہ انہیں دیکھ کر دوسرے لوگ عبرت حاصل کریں۔جھوٹ' کذب بیانی اور دروغ گوئی سے توبہ کرلیں۔''

''آہ۔۔۔ہا۔۔۔آج تو بڑے چمک رہے ہو میاں! کیا عقد ثانی کا ارادہ ہے؟'' یہ شہر کے سکہ بند' ادیب' شاعر اور نقاد تھے اور ایک ادبی دھڑے کی سربراہی کا بار بھی اٹھائے ہوئے تھے۔آج کی تقریب کے دولہا کی' تراش خراش اور ادبی قد' کاٹھ کا سہرا ان ہی کے سر باندھا جاتا ہے جس کے عوض گزشتہ تین دہائی سے' یہ بے چارہ' جب بھی قلم اٹھاتا بزرگ مذکور کی مدح سرائی کا قرض ضرور ادا کرتا ہے۔اس کے نزدیک' بزرگ سے بڑا ادیب' شاعر اور نقاد اس ملک میں تو کیا صفحۂ ہستی پر موجود نہیں اور بزرگ کی بدقسمتی کہ وہ اتنے بونے لوگوں کے درمیان پیدا ہو گئے وغیرہ وغیرہ۔

''بھئی معاف کرنا! ذرا تاخیر ہو گئی۔دراصل' دفتر میں بڑی اہم میٹنگ تھی۔فارن ڈیلی گیشن آیا ہوا ہے۔بڑی مشکل سے وقت نکال کر آیا ہوں۔پہلے مجھے پڑھوا دیجئے گا۔میں نے فارن ڈیلی گیشن کو پانچ ستارہ ہوٹل میں ڈنر دینا ہے۔'' یہ ایک سرکاری افسر تھے جن کی بابت مشہور تھا کہ انہیں دانشور کے ساتھ شاعر کہلانے کا بڑا شوق ہے اور آج کی تقریب کے میزبان نے انہیں کئی کتابیں' اپنے قلم سے تحریر کر کے دی ہیں جو افسر مذکور نے اپنے نام سے چھپوا کر' خوب پبلسٹی حاصل کی ہے۔ ہر کتاب کی تقریبِ رونمائی میں' میزبان موصوف نے' افسر صاحب کی شان میں وہ تمام الفاظ' القاب پڑھ ڈالے جو ڈکشنریوں اور لغتوں میں دستیاب ہیں۔سنا ہے موصوف کی نوکری انہیں افسر صاحب کے طفیل لگی تھی اور ترقیاں بھی ان ہی کی مرہونِ منت ہیں۔آج کل اپنے صاحبزادے کے لئے وظیفہ کے چکر میں ہیں تا کہ اُسے اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرون ملک بھیجا جا سکے۔

''اسلام علیکم۔۔۔اسلام علیکم۔۔۔معاف کیجئے گا ہمیں کچھ تاخیر ہو گئی۔وہ ذرا ہمارے گھر کچھ مہمان آ گئے تھے۔وزیر صاحب کا اصرار تھا کہ ہم اُن کے بیٹے کی دعوتِ ولیمہ میں ضرور شرکت کریں۔ہم نے بہت کوشش کی' بہت جان چھڑائی مگر وزیر صاحب اٹھنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔بس ایک ہی اصرار' ہمیں بلانے کا کئے جا رہے تھے۔۔۔چار و ناچار ہم نے وزیر صاحب کے بیٹے کے ولیمہ میں شرکت کی دعوت قبول کر ہی لی وگرنہ ہم آج کی تقریب سے محروم ہو جاتے۔'' ڈھلتی عمر میں بھی موصوفہ کو ننھی کا کی بننے کا بڑا شوق ہے بات بات پر اٹھلانا اور شرمانا کبھی نہیں بھولتیں۔شوہر سے علیحدگی کے بعد' شادی نہ کرنے کے وعدہ پر' عدالت نے تینوں بچے خاتون کی تحویل میں دے دیئے ہیں۔شوہر سے علیحدگی کے دس سالوں میں' آج کا میزبان' چوتھا شکار ہے جس کے ساتھ محترمہ کا نام غیر اعلانیہ طور پر نتھی کیا جاتا ہے۔محترمہ کی بلند آہنگی میں چاروں درویش کا برابر حصہ بتایا جاتا ہے۔ہر درویش نے پہلے کو چت کرنے کی غرض سے محترمہ کی شان میں ایسے ایسے قصیدے کہے اور بیان کئے ہیں کہ کانوں کو ہاتھ لگانے سے' توبہ پوری نہیں ہو سکتی۔

وعلیکم اسلام۔۔۔مہربانی۔۔۔شکر ہے جی خدا کا۔۔۔آپ کیسے ہیں؟ بس جی کیا سنائیں ہماری تو جان پر بنی ہوئی ہے۔عوام کیا' حکومت کیا' سرکاری افسر کیا' اور تو اور آپ ادیب' شاعر بھی ہمارے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ہر طرف کرپشن' کرپشن کا راگ الاپا جا رہا ہے۔کہاں ہے کرپشن۔۔۔ہمیں تو دکھائی نہیں دیتی۔۔۔آپ کو دکھائی دیتی ہے تو صرف سیاستدانوں میں؟ کبھی آپ نے ہمارے خرچے دیکھے ہیں؟ ہمارے ڈیروں کے روزمرّہ اخراجات کا تخمینہ لگایا ہے؟ الیکشن پر اُٹھنے والی رقم کی بابت غور کیا ہے؟ تحفوں اور نذرانوں کی مد میں جانے والی گڈیوں کو گنا ہے؟ میرے خیال میں اس وقت ہمارے ملک میں سب سے قابلِ رحم مخلوق سیاستدان ہیں۔'' ملک مہربان الیکشن میں ہار کا سارا غصہ آج ہی اتارنا چاہتے تھے۔انہیں آج کی تقریب کا مہمان خصوصی بنایا ہی اس لئے گیا تھا کہ وہ اپنی باری پر' ہر کس و ناکس کی خبر لیں گے اور جی کھول کر لیں گے۔ بقول اُن کے یہ اُن کی زندگی کا مہنگا ترین الیکشن تھا جو وہ اپنے ورکروں کی ناقص کارکردگی کے سبب ہار گئے۔ورکروں کی ناقص کارکردگی کا ذکر کر کے' ایک طرح سے ملک مہربان نے آج کی تقریب کے میزبان کی بھد بھی اُڑائی تھی کیونکہ وہ اُن کا پس پردہ' پروپیگنڈہ سیکریٹری اور تقریر نویس تھا۔نان میٹرک ملک مہربان کو قومی سطح کا سیاستدان' مدبر اور دانشور بنانے میں اُس نے اپنی تمام توانائیاں صرف کر دی تھیں۔ملک صاحب کا اشارہ بھلے ہی کسی اور طرف ہو مگر وہ' اپنے منہ پر گرم گرم چھینٹے محسوس کر رہا تھا جن کی شدت سے اُسے اپنا چہرہ جھلستا محسوس ہو رہا تھا۔

ملک مہربان کی آمد سے قبل تقریب کی جگہ بیوگی کا منظر پیش کر رہی تھی۔تقریب کا آغاز بہت دور لگتا تھا۔تھوڑی ہی دیر بعد ملک صاحب اور سرکاری افسر نے گھڑی گھڑی' گھڑی دیکھ کر بے چینی کا اظہار شروع کر دیا جس کے سبب تقریب کے منتظمین نے کونوں کھدروں میں کھڑے' گپ شپ میں مصروف احباب سے ہال میں تشریف رکھنے کی درخواست کی اور سٹیج سیکریٹری کو مہمان مقررین کی فہرست اور ترتیب سمجھاتے ہوئے تقریب کے آغاز کی ہدایت کی۔

تلاوتِ قرآن پاک سے تقریب کا آغاز کیا گیا۔قاری صاحب بڑے خوب رو اور مضبوط آواز کے مالک تھے۔ملک مہربان کے سیاسی جلسوں میں بڑی پاٹ دار آواز میں تلاوت کر کے اُس کا ترجمہ بھی بڑی نفاست سے کیا کرتے تھے۔جس آیات کی انہوں نے تلاوت کی اُس کا ترجمہ کچھ یوں تھا۔''اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقے میں نہ پڑو'' خاتون نعت خواں نے قاری صاحب کی شخصیت کا سحر چند ثانیوں میں توڑ دیا۔کم عمری کے باوجود' آواز' نین نقش اور لباس میں بڑی نفاست تھی۔تقریب کے تمام شرکا سانس روکے اور ٹکٹکی باندھے' بڑی توجہ اور انہماک سے نعت خواں کی جانب متوجہ تھے۔

باقی صفحہ ۱۰۱ پر ملاحظہ کیجیے

"صدائے شش جہات"

ڈاکٹر جنید آزر

(اسلام آباد)

میں زندگی کا حسن ہوں میں رنگِ کائنات ہوں
میں اِس جہاں کا جشن ہوں میں رونقِ حیات ہوں

وجودِ آدمی یہاں پہ ہے مرے وجود سے
میں اِس زمیں پہ ہر گھڑی خدا کا التفات ہوں

میں حوصلہ ہوں جوش ہوں میں عزم ہوں یقین ہوں
کوئی کرے نہ یہ گماں یہاں میں بے بساط ہوں

خدا نے ایسے گوندھ دی وفا مری سرشت میں
محبتوں کا عہد ہوں خلوص کا ثبات ہوں

اگر میں دل میں ٹھان لوں بدل دوں قسمتِ جہاں
تو پھر یقین کر کے میں صدائے شش جہات ہوں

میں آتے جاتے موسموں کے روزوشب سے آشنا
مسرتوں کا دن ہوں میں تو راحتوں کی رات ہوں

میں تیرے ہاتھ پر لکھا ہوا ترا نصیب ہوں
اے ہم سفر ترے لیے غموں سے میں نجات ہوں

تو جیسے چاہے گا تجھے ملوں گی ویسے ڈھنگ میں
میں وحشتوں کا دشت ہوں تو صبر کا فرات ہوں

میں چھاؤں ہوں میں دھوپ ہوں میں زندگی کا روپ ہوں
میں تیرے ساتھ ساتھ ہوں شریکِ مشکلات ہوں

کبھی تو اس پہ غور کر مرے بھی کچھ حقوق ہیں
کبھی تو مان لے مجھے کہ میں بھی ایک ذات ہوں

فیصل عظیم

(کینیڈا)

کبھی قطرہ، کبھی دریا، کبھی غرقاب ہوتا ہوں
کبھی اپنے لیے بھی میں بہت نایاب ہوتا ہوں

میں صحرا ہوں مگر تُو تو سمندر ہو کے پیاسا ہے
میں تو اپنے سرابوں سے بہت سیراب ہوتا ہوں

غنیمت ہے کہ ہاتھوں میں چھلکتا جام ہوں گویا
اگر آنکھوں میں آجاؤں تو پھر زہراب ہوتا ہوں

سرِ دشتِ غزل رہ رہ کے جو آنکھوں میں کٹتی ہے
میں اُس شب تجھ سے ملنے کو بہت بے تاب ہوتا ہوں

تلاشِ یار ڈھالے گی مجھے کس کس کے قالب میں
ابھی جلتا ہوا سورج، ابھی مہتاب ہوتا ہوں

قاسم جلال

(بہاولپور)

اُن سے جب عرضِ مدّعا ہو گا
دل میں ایک حشر سا بپا ہو گا

چشمِ قاتل سے اشک جاری ہیں
اس سے کیا بڑھ کے خوں بہا ہو گا

کیوں ہے پُرداغ سینۂ لالہ
آبِ شبنم سے جل گیا ہو گا

راہبر سے نہ رکھ اُمید کہ اب
شوقِ منزل ہی رہنما ہو گا

سوچ کیوں جتلائے کرب ہوئی؟
اب ہمیں یہ بھی سوچنا ہو گا

کس لیے اشک بار ہے شبنم
باغ میں کوئی گُل کِھلا ہو گا

تم بتاؤ کہ تم پہ کیا گزری
وہ تو جاں سے گزر گیا ہو گا

اے جلال اس کا اب تصوّر بھی
صورتِ آہِ نارسا ہو گا

نزہت شاہ

(نیویارک)

حسن و جمال کی ہے وہ تو جاں بنا ہوا
چہرے پہ تیرے جو ہے تبسم سجا ہوا

غربت سے تو مرے نہیں مرنا ہے پر ضرور
طعنہ ہی ایک کافی ہے تجھ سے سُنا ہوا

اب بھی اُمید نو پہ یہ جلتا ہے روز و شب
محراب دل میں دیپ ہے کب سے رکھا ہوا

پتھر دلوں کے دیس میں ہی آ بادہم ہوئے
اور اس پہ یہ کہ کانچ کا گھر بھی بنا ہوا

ہے کتنا منفرد اور خوب سے بھی خوب
آنکھوں میں تیر کش سا کاجل لگا ہوا

کیا راز اور نیاز تھے نشیب و فراز میں
امبر تھا جس گھڑی زمیں پہ جھکا ہوا

نزہت کا دل ہے صاحب پتھر نہیں ہے یہ
تم کو ملا ہو جیسے کہیں سر راہ پڑا ہوا

○

نسیم عزیزی

(کینیڈا)

جینے کے آثار کچھ نظر آئے
آپ جو سینے میں آگ بھر آئے

برف سُلگنے لگی مروّت کی
بھول گئے ہم کہ اپنے گھر آئے

پیرہنِ یار کا چھڑا قصّہ
آئینہ جسم میں اُتر آئے

دُور اندھیرا مگر نہیں ہوتا
لاکھ وہ خود کو چراغ کر آئے

بھیک اگر ہے حساب کیا لینا
آئے زیادہ کہ مختصر آئے

ایک وہ لمحہ تری جدائی کا
کتنی ہی صدیوں سے ہم گزر آئے

اس میں عجب کیا کہ تیری سرگوشی
عکس کی صورت ہمیں نظر آئے

خوب ہے ترے وصال کی لذت
جب کبھی ہم آئے چشمِ تر آئے

○

عمیر نجمی

(رحیم یار خان)

سب انتظار میں تھے، کب کوئی زبان کُھلے
پھر اُس کے ہونٹ کُھلے اور سب کے کان کُھلے

بھلے ہو لاکھ حسیں خواب، یاد رہتا نہیں
جب آنکھ درجنوں لوگوں کے درمیان کُھلے

بہت سا لیں گے کرایہ، ذرا سی دیں گے جگہ
یہاں کے لوگوں کے دل تنگ ہیں، مکان کُھلے!

گیا وہ شخص تو نظریں اٹھائیں لوگوں نے
ہوا تھمی تو جہازوں کے بادبان کُھلے

ہماری آنکھ میں کھدّر کے خواب پکتے تھے
تم آئے اور یہاں بوسکی کے تھان کُھلے

جگہ ہو اِس میں، کم از کم، مرے یقیں کے لیے
میں چاہتا ہوں کہ اتنا ترا گمان کُھلے

یہ کون بھول گیا اُن لبوں کا خاکہ یہاں؟
یہ کون چھوڑ گیا گُڑ کے مرتبان کُھلے؟

○

فرح کامران (نیویارک)

تیرا صدقہ اتار دیتی ہوں
لے، یہ میں یہ جان وار دیتی ہوں

کرچیاں چن کے خانہءدل سے
کانچ سارا نتھا دیتی ہوں

یہ محبت ہے تربیت میری
پیار لیتی ہوں، پیار دیتی ہوں

سانپ جیسے میں دوستوں کو بھی
آستیں کا حصار دیتی ہوں

شکر ہر حال میں ادا کر کے
جیسے تیسے گزار دیتی ہوں

میں محبت کے کھیل میں کیسے
خود کو ہر بار ہار دیتی ہوں

ایک دن ہجر کاٹ کر دیکھو
اپنا جیون ادھار دیتی ہوں

ضبطِ غم کے ہنر سے واقف ہوں
آنسوؤں کو وقار دیتی ہوں

محبوب خان اصغر (حیدرآباد، دکن)

کیا پتہ تھا کہ میری قوم بکھر جائے گی
کرب و آلام شب و روز سے مر جائے گی

جبکہ آلودہ بہت ہونے لگا ذوق طلب
شخصیت پھر تو یقیناً ہی بکھر جائے گی

روپ نیتا کا لئے سانپ نکل آتے ہیں
قوم کیا خاک کسی سانپ سے ڈر جائے گی

علم ناقص کی طلب چھوڑ کے چل حق کی طرف
صورتِ فکر بہرحال سنور جائے گی

کسی مطلوب کے قدموں میں پڑی ہوگی انا
لوٹ آئے گی سرشام کدھر جائے گی

برہنہ لگتی ہے جو کذب کے پیراہن میں
سچ کی چادر میں تو ہستی بھی نکھر جائے گی

نخوتوں کا یہ یقیں ہے کہ خودی ہے بے بس
یہ گماں ہے کہ انا جبر سے ڈر جائے گی

اس نے ہر سمت سے رکھا ہے ہمیں گھیرے میں
کیا پتہ اب یہ بلا کون سے گھر جائے گی

طاق میں کب سے ہے رکھا ہوا قرآں اصغر
اس کو پڑھتے رہو تقدیر سنور جائے گی

عبدالسلام عارف (ٹورنٹو)

افق کی سُرخیوں سے یا کہیں ڈوبے ستاروں سے
کبھی تم بھی نکل آؤ زمانے کے حصاروں سے

محبت ڈھونڈتی پھرتی ہے اپنی کھو چکی منزل
ہمارا پوچھتی ہو گی وفا کے رہ گزاروں سے

کوئی اک دو برس کا تذکرہ ہوتا تو کہہ دیتے
مرتب ہے یہاں تاریخ گم گشتہ بہاروں سے

کبھی بے بس تڑپتا ہے کبھی منہ زور رہتا ہے
بے جیون بر سرِ پیکار اپنے شہ سواروں سے

کرشمے حُسن کے دیکھو وہ جلوہ گر ہوئے ایسے
نہا کر اک پری نکلی ہو جیسے آبشاروں سے

وفا ہو، درد ہو، چاہے محبت ہو کہ وحشت ہو
مجھے ان سے نہیں مطلب، مری توبہ ہے چاروں سے

تگ و دو میں بہت عارف، بڑے ہلکان بیٹھے ہیں
بہت محدود ہے دنیا تو لاحاصل کناروں سے

نصرت بخاری

(اٹک)

دیارِ دل میں کسی کے وکیل ہوتے نہیں — یہاں جواز بھی ہوں تو دلیل ہوتے نہیں
کہ جس سے پیار کیا اُس پہ تہمتیں باندھیں — جو اہلِ دل ہیں وہ اتنے ذلیل ہوتے نہیں
کچھ ایسے زخم ہیں جن سے لہو نہیں بہتا — کچھ ایسی چوٹیں لگیں جن کے نیل ہوتے نہیں
اسی لیے تو یہ بھوکے کبھی نہیں سوئے — کہ جانور کبھی اتنے بخیل ہوتے نہیں
وہ کون دن ہے دُکھایا نہیں ہے دل جس نے — وہ کون رات ہے جب نین جھیل ہوتے نہیں
وہ جانتا ہے یہاں جس سے ہم مخاطب ہیں — ہمارے لفظ و معانی ثقیل ہوتے نہیں
یہ سحر کیا ہے کہ میرا عدو نہیں کوئی — یہ کیا طلسم ہے پھر بھی قلیل ہوتے نہیں

○

رفیع الدین ذکی قریشی اشرفی

(لاہور)

دامن بھیگا لگتا ہے — آج وہ رویا لگتا ہے
اُس کے دامن پر ساون — تازہ برسا لگتا ہے
پلکوں پہ ٹھہرا قطرہ — درد کا دریا لگتا ہے
تجھ سے بچھڑ کر سارا جہاں — سُونا سُونا لگتا ہے
سندر آنکھوں میں آنسو — کتنا اچھا لگتا ہے
شاید برکھا رت آئی — پتھر روتا لگتا ہے
جس کی آنکھیں ہوں نمناک — مجھ کو اپنا لگتا ہے
جس کا دل روتا ہو، اُسے — ہر اک روتا لگتا ہے
جب وہ خفا ہوتا ہے ذکیؔ! — اور بھی اچھا لگتا ہے

○

احمد نثار

(جھارکنڈ)

دیدنی ہو کوئی منظر نہیں رہنے دیتا — وہ کسی شے کو منوّر نہیں رہنے دیتا
پہلے امواج سے ٹکراؤ سنبھلنا سیکھو — خس و خاشاک سمندر نہیں رہنے دیتا
رہتے چڑیوں کی ہی چہکار سے جنگل روشن — سانپ بد ذات کبوتر نہیں رہنے دیتا
جانے کیا ملتا ہے اس کو مجھے رسوا کر کے — اوڑھنے کو کوئی چادر نہیں رہنے دیتا
ایک مزدور ہوں اس کا، ملی روزی ایسی — تاج سے خالی مرا سر نہیں رہنے دیتا
وہ عداوت کو محبت سے مٹاتا ہے نثارؔ — ہاتھ میں میرے جو پتھر نہیں رہنے دیتا

○

نوید سروش
(میرپورخاص)

جا کر وہ شہر بھی ہمیں کب بھول پائے گا
مجھ کو یقیں ہے گاؤں میں پھر لوٹ آئے گا

بے وجہ خاک پر نہ اُتارا گیا ہمیں
ہم کو بنانے والا ہمیں آزمائے گا

ایسا تو اپنی زیست میں ہونے نہ دوں گا
میں ہار جاؤں گا تو کیا وہ ہار جائے گا

دیکھوں گا جب بھی خواب میں کوئی ڈراؤنا
کوئی نہ کوئی دوست نظر مجھ کو آئے گا

جس نے تمام رشتے ہی تقسیم کر دیے
رشتے نئے سروشؔ وہ کیسے نبھائے گا

اُفق فرید
(میرٹھ)

یہ ظلم یہ نفرت یہ ستم تجھ کو مبارک
ہم لوگ محبت کے طلب گار ہیں ساقی

کل نغمہ سرا تھے تری محفل میں وہی لوگ
اب لاش پہ اپنوں کی عزاء دار ہیں ساقی

تم جرمِ بغاوت میں ہمیں پھانس رہے ہو
ہم لوگ وفادار وفادار ہیں ساقی

پیاسے ہیں مگر لب پہ شکایت تو نہیں ہے
میخانے کا معیار تھے معیار ہیں ساقی

کرتا ہے یہ میخانہ بھی ناز ان پہ ہمیشہ
کچھ لوگ جو مئے پی کے بھی ہشیار ہیں ساقی

آہوں سے ہلا سکتے ہیں ہم عرشِ بریں کو
تو دیکھ کے ہم کتنے اثر دار ہیں ساقی

میدان میں آجائیں تو خوں تھوکے گی دنیا
ہم مثلِ عمر صورتِ کرار ہیں ساقی

زنجیرِ قفس ہمکو ڈرائیگی کہاں تک
ہم زلفِ گرہ گیر کے بیمار ہیں ساقی

مقتل سے پکاریں گے وہ کل نام ہمارا
دربار میں ہم جرأتِ انکار ہیں ساقی

ہم صحرا نوردوں سے ہی آباد ہیں صحرا
زخموں سے ہر اک دشت میں گلزار ہیں ساقی

یوسف سا کوئی مصر کے بازار میں آئے
جاں دیکے بھی ہم اسکے خریدار ہیں ساقی

وہ جنگی قیادت پہ افق ہمکو یقیں تھا
حیرت ہے کہ اب زینتِ دربار ہیں ساقی

رئیس صدیقی
(دہلی)

شکایت کی باتیں ، محبت کی باتیں
سبھی ہو رہی ہیں، ضرورت کی باتیں

غرض اپنی اپنی، ہنر اپنا اپنا
قیادت کی باتیں، حماقت کی باتیں

ضرورت میں پکتے ہیں ایمان سب کے
سبھی سچ نہیں ہیں، عدالت کی باتیں

نہ مندر سے الفت، نہ مسجد سے رغبت
سیاست ہوئی ہیں، عبادت کی باتیں

رئیسؔ، ایک لڑکی نے ہم سے بھی کی تھیں
مُروت کی باتیں، محبت کی باتیں

برطانیہ سے جاپان

(سفر.....مشرق بعید کے)

یعقوب نظامی

قسط.....۳

امریکہ کا ڈوبتا سورج

ہو چی منہ کے ہوائی اڈے پر میں نے دیکھا.....!

درمیانے قد، زرد رنگت، پچکے گال، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں، منحنی ٹانگیں، دبلے پتلے ویت نامی ہنستے مسکراتے سیّاحوں کو اپنے دیس میں خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ان ناتواں جانوں کو دیکھ کر.....میں سوچتا رہا کہ کیا یہ ہیں وہ لوگ جنھوں نے دنیا کی سپر پاور امریکہ کو ناکوں چنے چبواتے ہوئے تاریخ عالم میں عبرت ناک شکست دی تھی۔

اہل ویت نام کو دیکھ کر میرا جی نہیں مان رہا تھا کہ یہ فاتح قوم ہے۔ ایسے میں مجھے ویت نام کی طویل جنگ اور پھر فتح والی کہانی من گھڑت محسوس ہوئی۔ چونکہ ہماری قومی سوچ کے مطابق .....!جنگ کے لئے مضبوط قد و کاٹھ کا ہونا ضروری ہے۔ جو زیادہ نہیں تو جنگی ساز و سامان تو اٹھا سکتا ہو۔لیکن یہ ٹیڑھی ٹانگوں والے تو بڑی مشکل سے پورا زور لگا کر خود چلتے تھے۔ بھلا یہ ناتواں ہتھیار کیسے اٹھا سکتے تھے یہ تو ہوا کے تیز جھونکے سے اڑ سکتے ہیں۔لیکن جوں جوں میں نے ان لوگوں کے درمیان وقت گزارا اور انھیں قریب سے دیکھنے اور ملنے کا موقع ملا تو میرے خیالات بدلے۔

اب مجھے یہ چھوٹے چھوٹے منحنی ٹانگوں والے لوگ بلند و بالا انسان نظر آنے لگے۔اور میں سوچنے لگا کہ.....زندگی جذبوں کا نام ہے سانس لینے کا نام زندگی نہیں.....!چونکہ دنیا کے کروڑوں انسان سانس لیتے اور چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔لیکن جذبوں سے خالی ایسے لوگ ہی زندہ لاشیں کہلاتے ہیں۔جن لوگوں کے اندر جذبے موجزن ہوتے ہیں اُن کو ہی ہم زندہ قوم کہتے ہیں۔ویت نام کے یہ منحنی ٹانگوں والے زندہ قوم کے عظیم لوگ ہیں۔جنھوں نے اپنے جذبوں سے یہ ثابت کیا کہ جنگ جیتنے کے لئے جدید اسلحہ، ہوائی جہاز، دراز قد اور جسمانی طور پر توانا ہونا لازمی نہیں بلکہ جذبوں کا جوان ہونا شرط ہے۔

ہو چی منہ، صدام اور قدافی

تاریخ بتاتی ہے کہ امریکہ نے سپر پاور کا تاج سر پر رکھتے ہی سب سے پہلے کوریا، تائیوان، ویت نام پھر جنوبی امریکی ممالک چلی، گوئٹے مالا کے بعد افغانستان، عراق اور لیبیا کے خلاف طاقت کا استعمال کیا۔کوریا نے کم ال سنگ، ویت نامیوں نے ہو چی منہ، عراق نے صدام اور لیبیا نے معمر قدافی کی قیادت میں امریکہ کا سامنا کیا جبکہ چلی نے آلندے کی قیادت میں امریکہ کو للکارا جبکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو چی منہ نے بھوکے ننگے لنگوٹ باندھ کر گوریلا جنگ لڑی اور امریکہ کو عبرت نام شکست سے دوچار کیا۔

ویت نام کے مقابلے میں لیبیا اور عراق کے چھ چھ بلکہ سات سات فٹ کے گھبرو جوان مجھے بالکل پست ہمت اور بونے نظر آئے۔ جب عراق پر امریکہ نے حملہ کیا تو بھاری قد و کاٹھ کے گھبرو جوان صدام نے عراقی قوم کی قیادت سنبھالنے کی بجائے رات کے اندھیرے میں بغداد سے بھاگ کر اپنے آبائی علاقہ میں ایک قبر نما خندق میں پناہ لی جہاں خوف و ہراس میں عرصہ تک چھپا رہا۔ آخر اپنوں کی مخبری پر امریکی فوج نے اسے گرفتار کیا۔مقدمہ چلا کر پھانسی کی سزا دی۔اسی طرح قدافی بھی اپنے محل سے بھاگا اور صحرا میں ایک پائپ میں جا چھپا جہاں سے امریکی فوج نے اسے نکال کر قتل کیا تھا۔

صدام اور قدافی کی مخبری اپنے لوگوں نے کی تا کہ امریکہ کی آشیر باد حاصل ہو سکے۔اپنے ملک سے نمک حرامی کے صلے میں امریکہ نے ممکن ہے انھیں چند سو ڈالر اور امریکی ویزے دے کر خوش کر دیا ہو۔لیکن اس کے عوض عراقی اور لیبیائی لوگ در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہوئے۔آج ان ممالک کے ایک ہی خاندان کے لوگ بکھر کر دنیا کے کونے کونے میں پناہ لینے پر مجبور ہیں۔اس وقت بھی لیبیا کے ہزاروں لوگ امن کی تلاش میں یورپ پہنچنے سے قبل بحیرہ روم میں ڈوب کر اگلے جہاں پہنچ رہے ہیں۔

یہ سلسلہ جاری ہے۔لیبیا اور عراق کے چھ چھ فٹ لمبے لوگ اگر ویت نام کے منحنی ٹانگوں، ناتواں اور درمیانے قد والوں کی طرح امریکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سامنا کرتے اور پھر ان کے لیڈر قدافی اور صدام چھپنے کی بجائے ہو چی منہ کی طرح گوریلا جنگ پر اُتر آتے تو امریکہ کو ایک اور شکست ہوتی۔اسی تناظر میں ہم علامہ اقبال کی طرح صدام اور قدافی پر افسوس ہی کر سکتے ہیں کہ:

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تُو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات!
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات!

امریکی مظالم کا عجائب گھر

امریکہ ویت نام جنگ میوزیم ہمارے ہوٹل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ابھی ہم دو تین گلیاں ہی چل پائے تھے کہ سامنے ایک سادہ لیکن پر وقار عمارت نظر آئی یہی میوزیم تھا۔ہمیں عمارت کے احاطہ میں ہیلی کاپٹر، جنگی جہاز، ٹینک، توپیں اور دیگر جنگی ساز و سامان اس طرح نظر آیا جیسے یہ کوئی ائرفورس کا ہوائی اڈہ یا پھر میدان جنگ ہو۔ یہ منظر اس قدر جاذب النظر تھا کہ ہم نے سب سے پہلے میوزیم کے اندر جانے کی بجائے کھلی فضاؤں میں ترتیب سے رکھے ہوئے حربی سامان کا رخ کیا۔قریب جا کر دیکھا تو معلوم ہوا یہ وہی جنگی ساز و سامان تھا جسے امریکہ نے دوران جنگ استعمال کرتے ہوئے ویت نام کے لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ہم ہر چیز کو غور سے دیکھتے آگے بڑھتے رہے۔ ہماری

طرح کے دوسرے سیّاح جن میں امریکی بھی شامل تھے وہ بھی منظر دیکھتے اور تصاویر اُتار رہے تھے۔

جنگی ساز وسامان کے ساتھ ایک تہہ خانہ تھا۔ یہ تہہ خانہ جنگی قیدیوں کی حالت زار کی عکاسی کر رہا تھا۔ اس میں چھوٹی چھوٹی کوٹھڑی نما سیل دکھائے گئے تھے جن میں صرف بیٹھنے کی جگہ تھی وہاں بیڑیاں پہنے ویت نامی قیدی بڑی بے رحمی کے ساتھ رکھے جاتے تھے۔ ان پر تشدد کرنے کے طریقے اور پھر انھیں زندگی سے نجات دینے کے لئے وہ مشین بھی رکھی گئی تھی جس کے ذریعے بے گناہوں کے سرتن سے جدا کیے جاتے تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ مجرم کو ایک تختے کے اوپر لٹا کر اُسے تختے کے ساتھ باندھ دیا جاتا۔ اور پھر عین گردن کے اوپر ایک تیز دھار تلوار نما آلہ آ کر اس تیزی سے گرتا کہ سیکنڈ میں سرتن سے جدا ہو جاتا۔ اس مشین نے ہزاروں بے گناہ لوگوں کے سرتن سے جدا کیے تھے۔

اس مقام سے عجیب قسم کی بد بو اور وحشت آتی تھی۔ میں حیران و پریشان ان مناظر کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ امریکی سیّاح بھی سر جھکائے نظر آئے..... ممکن ہے انھیں اپنے اجداد کے کردار کا عکس یہاں دکھائی دے رہا تھا..... امریکیوں کے برعکس..... مقامی باشندے جن کے اجداد کو اس مشین کے ذریعے قتل کیا جاتا تھا..... وہ اس مقتل گاہ میں بڑے فخر اور تن کر چلتے نظر آئے تو مجھے فیض احمد فیض یاد آئے:

جو ہم پہ گذری سو گذری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے
مقام ، فیض ، کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

زنداں خانہ سے نکلے تو ہم میوزیم کی بڑی عمارت میں داخل ہوئے۔ یہ تین منزلہ عمارت تھی۔ جس کی ہر منزل پر سیّاحوں کے لئے مختلف امور پر معلومات موجود تھی۔ ایک جگہ ویت نام جنگ کے بارے میں حقائق، دوسری جگہ دستاویزات اور تیسری منزل پر جنگ سے متاثرین کی تصویری جھلکیاں تھی۔ اس سے پہلے میوزیم کی تفصیلی سیر کرتا میں نے جنگ کے بارے میں حقائق معلوم کرنے کا پروگرام بنایا چونکہ تمام حقائق آپ کے سامنے ہوں تو پھر باقی معلومات سمجھنے میں آسانی رہتی ہے۔

سنڈوں (سانڈوں) کی لڑائی

میوزیم کے جس کمرے میں جنگی دستاویزات موجود تھیں ہم وہاں گئے تو دیکھا سیّاحوں کو جنگ سے متعلقہ فلمیں دکھائی جا رہیں تھیں۔ یہ فلمیں مختصر دستاویری صورت میں تھیں۔ جس میں بتایا گیا تھا کہ اس جنگ میں شمالی ویت نام اور اس کے اتحادیوں بشمول چین کی کل گیارہ لاکھ 77 ہزار 446 انسانی زندگیاں ختم ہوئیں جبکہ چھ لاکھ چار ہزار زخمی ہوئے۔ فوج کے علاوہ بیس لاکھ شہری بھی ہلاک ہوئے ۔ جبکہ جنوبی ویت نام اور اتحادیوں کی تین لاکھ پندرہ ہزار 831 زندگیاں جبکہ چودہ لاکھ نوے ہزار زخمی ہوئے۔ جنگ میں اٹھاون ہزار 159 امریکی بھی زندگیوں سے محروم ہوئے اور بھاری تعداد مفلوج ہوئی۔ فوجیوں کے علاوہ پندرہ لاکھ 81 ہزار شہری باشندے بھی مارے گئے۔ ویت نام کے پڑوسی ملک کمبوڈیا کے سات لاکھ اور لاؤس کے پچاس ہزار شہری بھی اس جنگ میں کام آئے۔ مجموعی طور پر ویت نام کی نصف آبادی اس جنگ کی نظر ہوئی۔ اتنی قربانیوں کے بعد ویت نام کے لوگوں کو آزادی نصیب ہوئی۔ ایسے میں یہ لوگ اگر حسرت موہانی کی طرح اس بات کا دعویٰ کریں تو بجا ہے کہ:

ہم نے خیرات میں یہ پھول نہیں پائے ہیں
خون جگر صرف کیا ہے تو بہار آئی ہے

دستاویزات کے مطالعہ اور ڈاکومنٹری فلم دیکھنے کے بعد میرے ذہن میں اپنے گاؤں کا نقشہ ابھرا جہاں کے رہائشی اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے سنڈے (سانڈ) Buffalo پالتے اور پھر طاقت آزمائی کے لئے ایک کھلے میدان میں سنڈے اُتار کر زور آزمائی کرتے ہوئے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی جدوجہد کیا کرتے تھے۔ گاؤں کے لوگ دو گروپ میں تقسیم ہو جاتے جو اپنے اپنے گروپ کے سنڈے کی حمایت میں تالیاں بجاتے، ڈھول بجاتے اور شور غل کرتے تھے۔ اس لڑائی میں میدان جنگ کی ہر چیز تباہ و برباد ہو جاتی فصلیں تباہ، پھول بوٹے، پیڑ سب کچھ اُن کی لپیٹ میں آ کر برباد ہو جاتے۔ اس جنگ وجدل اور خون خرابے کے بعد آخر کار تھک ہار کر ایک سنڈا بھاگ جاتا..... تو جیتنے والے آوازیں کستے اور ہارنے والوں کو غیرت دلاتے جس کے جواب میں ہارنے والا بدلا لینے کے لئے پھر کسی اور مقام پر طاقت کا مظاہرہ کرنے کا چیلنج دے کر چلا جاتا..... کچھ عرصہ بعد اُسی طرح کا اکھاڑا پھر سجتا اور تباہی کے وہی مناظر دہرائے جاتے..... ہار جیت کے فیصلے ہوتے۔ اس لڑائی میں سب سے زیادہ فائدہ گاؤں کے مٹھائی فروش کا ہوتا۔ جہاں سے جیتنے والے مٹھائی خریدتے اور اپنے دل خوش کرتے تھے۔

جنگ عظیم دوم کے بعد دنیا ایک گاؤں کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ گاؤں کا چوہدری ایک ہی ہوتا ہے۔ اس عہدہ جلیلیہ کے لئے آئے دن لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں۔ جاپان پر ایٹم بم برسانے کے بعد جب جنگ عظیم دوم اختتام پذیر ہوئی تو جیتنے والوں نے دنیا کی بندر بانٹ شروع کر دی۔ بڑی طاقتوں نے اپنے اپنے حصے لیے۔ جس میں سب سے زیادہ نقصان برطانیہ کا ہوا جو بظاہر جنگ جیت گیا تھا لیکن عملی لحاظ سے جنگ ہارا تھا۔ اس ہار میں اسے برصغیر کو آزادی دینی پڑی۔ اور پھر برطانیہ کو دنیا کی سپر طاقت اور دنیا کی لیڈر شپ کے اعزاز سے بھی محروم ہونا پڑا۔

جنگ کے بعد یورپ اور مغرب کا نیا لیڈر امریکہ بہادر بن بیٹھا۔ جاپان ایٹم بم کے زخم چاٹتا ہوا اپنے زیر قبضہ مقبوضات سے دستبردار ہوا۔ اس عمل میں ویت نام کو بھی آزادی ملی۔ جس پر طویل عرصہ فرانس قبضہ کر کے ان کا خون چوستا رہا اور پھر جنگ عظیم دوم کے دوران اس پر جاپان نے قبضہ کر لیا تھا لیکن ہر دو طاقتوں کو آخر کار ویت نام کو آزادی دینی پڑی۔ مغربی ممالک نے امریکہ بہادر کو گاؤں کا چوہدری تسلیم کر کے اُس کی مالش شروع کر دی تا کہ اُس کے پٹھے اس قدر مضبوط ہو جائیں کہ وہ دشمن کو شکست دے سکے۔

دوسری جانب روس ہم خیال ممالک کو اپنے ساتھ ملا کر ایک نیا اتحاد قائم کر کے مغرب خصوصاً سرمایہ دار ممالک کا راستے روکنے لگا۔ سرمایہ دار بہت چالاک ہوتا ہے۔ چنانچہ اشتراکیت کے نام پر جو محاذ قائم ہوا تھا اُسے نیچا دکھانے کے لئے سرمایہ دار متحد ہو گئے .....امریکہ اور روس..... ہر دو طاقت ور سنڈوں کو اپنی جوانی پر غرور تھا۔ چنانچہ طاقت کے نشہ میں سرشار دونوں نے میدان سجایا..... یہ میدان زمانہ قدیم کے گاؤں کی طرح جدید دور کے گلوبل ولیج میں طاقت آزمائی کے لئے منتخب کیا گیا۔ اس میدان کا نام تھا..... ویت نام۔ ویت نام کے میدان میں زمانہ قدیم کے دو سنڈوں کی طرح دور جدید کی دو طاقتوں .....سرمایہ دار اور اشتراکی سنڈوں نے زور آزمائی شروع کی۔

جنگ کا آغاز یکم نومبر 1955ء کو ہوا جو مسلسل 19 سال پانچ ماہ اور ایک دن لڑی جاتی رہی اور آخر کار 30 اپریل 1975ء کو جب اشتراکی فوجیں سائیگون پر قابض ہوئیں تو اس جنگ کا خاتمہ ہوا۔

ویت نام جنگ میں امریکہ پہلے پیسے، ہتھیار، ٹریننگ اور دوسرے ذرائع سے مدد کرتا رہا لیکن خاطر خواہ کامیابی نہ ملی تو ساٹھ کی دھائی میں اسے اپنی فوجیں ویت نام میں اُتارنی پڑیں۔ جس کی دنیا بھر میں مذمت کی گئی۔ خود امریکی لوگ اس جنگ کے خلاف تھے۔ نامور عظیم باکسر محمد علی کو جب اس جنگ میں شامل ہونے کے لئے کہا گیا تو اس نے کہا:

''میری ویت نام کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں''

اس انکار پر 1967ء میں اسے باکسنگ کے ہیوی ویٹ ورلڈ ٹائٹل سے محروم کر دیا گیا لیکن محمد علی نے ایک غیر قانونی جنگ کا ساتھ نہیں دیا۔ دو بڑی طاقتوں نے ویت نام کو شمال اور جنوب میں تقسیم کر کے میدان جنگ کی شکل دی۔ جنوبی علاقہ کے شہر سائیگو ان کو امریکہ نے اپنا مرکز بنایا جبکہ شمالی علاقہ پر اشتراکیوں نے قبضہ جمائے رکھا اور ہو چی منہ جو ویت نام کا لیڈر تھا کو مکمل حمایت کے ساتھ میدان جنگ میں اُتارا۔ اس طرح دونوں سنڈوں نے تباہ کن جنگ لڑی۔ کوئی بھی ہار ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ویت نام کی سرزمین خاک در خاک ہوئی۔ امریکہ نے بارش کی طرح بم برسائے، کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال کیا جس سے ویت نام کے بوڑھے، عورتیں، مرد اور بچے نصف آبادی سے زیادہ لقمہ اجل بن گئے۔ زندہ بچ جانے والوں کی اکثریت کیمیائی ہتھیاروں کے استعمال سے ہمیشہ کے لئے معذور ہو گئی لیکن اس ظلم کے سامنے مٹھی ٹانگوں اور پچکے ہوئے گالوں والی کمزور و ناتواں قوم سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئی اور آخر کار ایک ظالم ہٹا کٹا سنڈا میدان جنگ سے بھاگ کر واپس امریکہ چلا گیا اور جاتے جاتے اشتراکیوں کو خبردار کرتا گیا کہ یہ پہلا راؤنڈ تھا..... ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں میں جلد ہی گاؤں کے کسی اور میدان میں آ کر پھر زور آزمائی کرتے ہوئے تمہاری خوشیوں کو غم میں بدل دوں گا۔

وہ دن اور آج کا دن یہ سنڈے آئے دن کبھی افغانستان کبھی عراق کبھی لیبیا اور کبھی شام میں پنجہ آزمائی کرتے نظر آتے ہیں۔ گاؤں کے مٹھائی فروش کی طرح اگر کسی کا فائدہ ہے تو وہ اسلحہ تیار کرنے والی امریکی کمپنیوں کا جو جنگ کے لئے دھڑا دھڑ اسلحہ تیار کر کے اور دولت بنا رہے ہیں۔ اور نقصان اشرف المخلوق کا ہے۔ جو بے گناہ اس جنگ کا ایندھن بنتی ہے۔ یہ سلسلہ جاری ہے۔ جب دور جدید کے دو سنڈوں.....امریکہ اور روس کے اصل چہروں سے پردہ اٹھا تو مجھے افغانستان کی جنگ کے پس منظر سے آگاہی ہوئی۔ ورنہ میں تو اسے اسلام اور اشتراکیت کی جنگ سمجھتا رہا۔ ممکن ہے میری طرح لاکھوں بلکہ کروڑوں مسلمان بھی اسے اسلامی جنگ سمجھتے رہے ہوں جس کے لئے لاکھوں مسلمان شہید اور اس سے زیادہ معذور ہوئے۔ چونکہ بڑی طاقتوں نے اصل حقائق پر پردہ ڈال کر بڑی مکّاری کے ساتھ مسلمانوں کو اس جنگ میں دھکیلا.....مغربی طاقتیں اس بات سے واقف تھیں کہ مسلمان جہاد کے نام پر جان دینے کے لئے تیار رہتے ہیں چنانچہ مسلمانوں کے جذبہ جہاد، سعودی عرب سمیت مسلم ممالک کی دولت اور امریکی اسلحہ سے افغانستان سے روسی سنڈا بالکل اُسی طرح بھاگا جس طرح امریکی سنڈا ویت نام سے بھاگا تھا۔ جب امریکہ روس سے بدلا لے چکا۔ تو پھر جن مسلمانوں کے زور بازو سے اس نے یہ کامیابی حاصل کی تھی اُس سے خود بھی خوفزدہ ہو کر بڑی مکاری کے ساتھ انھیں دہشت گرد کا خطاب دیا۔

دور جدید کے چنگیزیوں نے مسلم امت پر اس قدر ظلم ڈھائے کہ اُس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ یہ ظلم دوستی کے پردے میں چھپ کر ڈھائے گئے۔ سادہ دل مسلمان ہمیشہ کی طرح اس بار بھی دھوکا کھا کر ان پر اعتبار کر بیٹھا..... چونکہ یورپ کے رندے انتہائی تیز ہیں.....ان کے ظلم وستم کے نتیجہ میں ایک پر امن امت آج دہشت گرد اور دہشت گردی کی زد میں ہے۔ آج مسلمان دنیا کے کونے کونے میں پناہ لینے پر مجبور ہیں۔

مسلمانوں کے ساتھ اہل مغرب نے منافقت کا ثبوت دیتے ہوئے اس قدر دروغ گوئی سے کام لیا کہ ابلیس بھی ان کے سامنے اپنی مکّاریوں میں ہیچ نظر آتا ہے۔ علامہ اقبال جنھیں مشرقی اور مغربی علوم پر دسترس حاصل تھا نے یہ بات بہت پہلے بھانپ لی تھی جس کا اظہار ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کے ایک منظر نامہ میں یوں بیان کیا:

دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا عرب و شرق
میں نے جب گرما دیا اقوام یورپ کا لہو
کیا امامانِ سیاست، کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو!
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہو
ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو

جنگ کی تصویری جھلکیاں

ویت نام جنگ کے بارے میں دستاویزات اور ڈاکومنٹری فلموں

کے ذریعے علم میں اضافے کے بعد میں جنگی میوزیم کا تفصیلی جائزہ لینے کے لئے چل پڑا۔ یوں تو اس میوزیم کی ایک ایک چیز دیکھ کر انسان دکھی ہو جاتا ہے لیکن سب سے زیادہ دکھ مجھے اس وقت ہوا جب میں نے امریکی ظلم کی داستانوں کو تصویری شکل میں دیکھا۔ اس فلور پر کوئی بھی ایسا انسان نہ تھا جو آب دیدہ نہ ہو۔ آب دیدہ ہو بھی کیوں ناں.....! جب کوئی درد دل رکھنے والا انسان یہ دیکھتا ہے کہ امریکی فوجیوں نے معصوم بچوں کو ٹانگوں سے پکڑ کر الٹا لٹکایا ہوا ہے..... بچہ رحم کی اپیل کر رہا ہے.....لیکن امریکی فوجی اُس معصوم پر رحم کرنے کی بجائے اُسے بندوق کی گولیوں سے چھلنی کر کے اُس کی زندگی گل کر دیتے ہیں۔

کچھ تصاویر میں خواتین پر مظالم کے پہاڑ ڈھائے جا رہے ہیں۔ ایک خاتون کو دکھایا گیا جو پانی کی دلدل میں چھپ کر اپنے معصوم بچوں کو امریکی درندوں سے بچانے کی جدوجہد کر رہی ہے۔ خوف و ہراس اور بیچارگی عورت اور اُس کے بچوں کے چہرے سے بالکل نمایاں تھی۔ یہ تصاویر دیکھ کر میوزیم میں موجود بہت سی عورتوں کو میں نے اپنے معصوم بچوں کو گلے لگا کر روتے دیکھا۔ ایک تصویر میں ایک بوڑھی اور ناتواں بے بس ویت نامی عورت جو شہر سے دور ایک پسماندہ گاؤں میں رہتی تھی۔ اُسے جب معلوم ہوا کہ امریکی فوجی گاؤں گاؤں جا کر لوگوں کو قتل کر رہے ہیں تو اُس نے اپنے معصوم پوتے تنور میں چھپا دیے اور انھیں ہدایت دی کہ جب امریکی مجھے قتل کر کے چلے جائیں تو پھر یہاں سے نکل کر کسی محفوظ جگہ چلے جانا۔ ان کے والدین پہلے ہی قتل کر دیئے گئے تھے۔ لیکن جب ظالم امریکی فوج اُس گاؤں میں پہنچی تو انھوں نے اُس عمر رسیدہ ناتواں عورت کے گھر کو چھان مارا لیکن کوئی زندہ انسان نہ ملا..... آخر جاتے جاتے انھیں تنور میں سے بچے ملے جنھیں وہاں سے نکال کر ضعیف دادی کے سامنے قتل کر دیا۔

یہ منظر دیکھ کر دادی بھی غش کھا کر گری اور مر گئی۔ کچھ تصاویر میں ویت نام کے بوڑھوں، معذوروں اور ناتواں لوگوں کو دکھایا گیا ہے جنھیں امریکی فوجی مار رہے ہیں۔ اُنھیں خون میں لت پت دیکھ کر امریکی فوجی ترس کھانے کی بجائے اُن پر قہقہے لگا رہے تھے۔ امریکی ظلم و ستم میں جان کی بازی ہارنے والوں کو اجتماعی قبروں میں پھینک کر دفناتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ کچھ تصاویر میں ویت نام کے فطرتی حسن کو دکھایا گیا۔ لیکن ساتھ ہی اُن فطرتی مناظر کو خاکستر ہوتے بھی دکھایا گیا تھا۔ چونکہ امریکی فوج کو شک تھا کہ ویت نامی جنگجوان جنگلوں میں پناہ گزین ہیں چنانچہ انھوں نے اُن سرسبز گھنے جنگلوں میں اسی ملین لیٹر سے زیادہ ''ڈائی اوکسین ایجنٹ اورنج'' نامی گیس کی سپرے کی جس سے ہر چیز جل گئی۔ جبکہ اس کے اثرات قرب و جوار کی آبادیوں تک پھیلے تو اُن علاقوں میں آج بھی معذور بچے پیدا ہو رہے ہیں۔ میں نے ایک بچے کی تصویر دیکھی جس کی عمر آٹھ دس سال کی تھی ''ایجنٹ اورنج گیس'' کی وجہ سے اُس کا چہرہ باہر نکل آیا اور وہ انسانی بچے کی بجائے ہاتھی یا کسی اور جانور کا بچہ نظر آ رہا تھا۔ ہزاروں بچے چلنے پھرنے سے محروم ہوئے۔

ایک تصویر میں کچھ بچے بندروں کی مانند چل رہے تھے۔ اُن کی کمر کی ہڈی مڑ کر کمان کی طرح ہو گئی تھی۔ وہ اپنے بازوؤں اور ٹانگوں کے سہارے چوپایہ ..... جانوروں کی طرح چلتے تھے۔ ایک تصویر میں ایک بچے کا سر زہریلی گیس کی وجہ سے پھول کر اس قدر بڑا ہو گیا تھا جیسے ڈھول ہو۔ اُس کی آنکھیں باہر کو نکلیں ہوئیں تھیں۔ کچھ بچوں کی تصاویر میں وہ ٹانگوں سے محروم تھے۔ اور ہاتھوں کی مدد سے زمین پر رینگتے چلتے تھے۔ ان تمام تر مظالم کے باوجود ویت نام کے لوگوں نے ہمت نہ ہاری اور وہ حبیب جالب کے اس شعر کی زندہ مثال بن کر سامنے آتے اور موت کو گلے لگاتے رہے۔

میں بھی خائف نہیں تختہ دار سے
میں بھی منصور ہوں کہہ دو اغیار سے
کیوں ڈراتے ہو زنداں کی دیوار سے
ظلم کی بات کو جہل کی رات کو
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا

میوزیم میں موجود ایک گائیڈ نے بتایا کہ امریکہ نے ایجنٹ اورنج نامی گیس ہو چی من سٹی کے قریب بین ہوا Bien Hoa نامی جس ہوائی اڈہ پر محفوظ کر رکھی تھی وہ علاقہ ابھی تک زہر آلود ہے۔ بلکہ یہ گیس زمین میں جذب ہو کر قریبی دریاؤں میں حلول ہو چکی ہے۔ گائیڈ نے ہمیں بتایا کہ اس گیس سے تیس لاکھ لوگ متاثر ہوئے جن میں ڈیڑھ لاکھ بچے بھی تھے۔ امریکہ اب اپنے گناہوں کو دھونے کے لئے مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہوئے آیا اور اُس آلودگی کو صاف کرنے میں مصروف ہے جس پر 183 ملین ڈالر خرچ آئے گا۔ بھلا ہو برطانوی فوٹوگرافر ٹم پیج Tim Page اور جرمن فوٹوگرافر ہرسٹ فاس Horst Faas کا جنھوں نے کیمرے کی آنکھ میں امریکی ظلم و بربریت کے مناظر آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ کر دیئے۔ ہم خوشی خوشی جس میوزیم کو دیکھنے گئے تھے اُسے دیکھ کر انتہائی رنجیدہ ہوئے۔

بیگم اور بیٹی کی آنکھیں مسلسل تر رہیں۔ بلکہ میوزیم کی تصاویر جب کچھ احباب کو وٹس اپ WhatsApp پر بھیجیں تو انھوں نے بھی شدید غم کے عالم میں مجھے لکھا.....اس ظلم کو ہم مزید نہیں دیکھ سکتے..... براہ کرم ظلم کی مزید تصویر ہمیں نہ بھیجیں ورنہ انسانیت سے ہمارا ایمان اٹھ جائے گا۔ ان تصاویر کا دوسرا رخ.....امریکہ بہادر کی یہ سوچ بھی ہے جس کی عکاسی حبیب جالب نے کچھ اس طرح کی ہے:

لوگ اس منظر جانکاہ کو جب دیکھیں گے
اور بڑھ جائے گا کچھ سطوتِ شاہی کا جلال
تیرے انجام سے ہر شخص کو عبرت ہوگی
سر اٹھانے کا رعایا کو نہ آئے گا خیال
طبع شاہانہ پہ جو لوگ گراں ہوتے ہیں
ہاں انھیں زہر جام دیا جاتا ہے

☆

مارفین کی دنیا

تابش خانزادہ
(نیویارک)

افیون (Heroin) کے پودے (Opium Poppy) کی تاریخ بھنگ کے پودے سے کئی صدیاں پرانی ہے۔ پوپی کے پھولوں کے ڈوڈے کو چیر کر رَس اکٹھا کیا جاتا ہے۔ اس رَس کے کیمیائی مادے سے قانونی طور پر زیادہ تر طبی مقاصد کے لیے مارفین (Morphine) حاصل کی جاتی ہے غیر قانونی طور پر افیون بھی اسی رَس سے تیار کی جاتی ہے جو نہایت آسان ہے۔ افیون کھانے اور پینے کے ساتھ ساتھ انجیکٹ بھی کی جاتی ہے۔ جن لوگوں کی رگیں افیون کی کثرت استعمال سے ناکارہ ہو کر انجکشن کے قابل نہیں رہتیں وہ اسے آنکھوں میں قطرہ قطرہ کر کے ڈالتے ہیں۔ انسانوں میں افیون کا استعمال اتنا پرانا ہے کہ مصر کے کئی ہزار سالہ پرانی میموں کے بالوں میں افیون پائی گئی۔ قدیم روم، یونان اور فارس (موجودہ ایران) میں بھی اس کے استعمال کے شواہد ملے ہیں لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آیا پرانی تہذیبوں کے لوگ اسے طبی مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے یا نشے کے لیے۔

یورپ کے بعض تاریخ دانوں نے نئی دنیا میں نشے کے طور پر افیون سے متعارف کرانے کا ملزم مسلمانوں کو گردانا ہے۔ اُن کے بقول اسلامی قانون نے شراب کو ممنوع کر دیا تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں نے شراب کے متبادل باقی منشیات کو استعمال کیا۔ انہوں نے سلطنتِ بنوعباس اور عثمانیہ کے تاجداران کے بعد مغل بادشاہوں کا نام لے کر ثبوت کے طور پر پیش کر کے بتایا ہے کہ فلاں فلاں مسلمان تاجداران افیون کا کثرت سے استعمال کرتے تھے۔ ان کے ادوار میں افیون کا استعمال عیاشی اور امارت کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ اُن تاریخ دانوں کے بقول افیون کے نشے کے زیر اثر مسلمان صوفی لوگ خدا کی جستجو میں رہا کرتے تھے، مسلمان سپاہی بہادری کے جوہر دکھایا کرتے تھے، مسلمان امرا زندگی کے مزے لوٹتے تھے، اور غربا اپنے غم غلط کرتے تھے۔

یہ تاریخی سچائی ہے کہ بھنگ، چرس اور افیون کے نشے کو مسلمانوں نے باقی دنیا سے طب کے راستے متعارف کرایا تھا۔ مثال کے طور پر معروف مسلمان ڈاکٹر رازی اور ڈاکٹر ابن قاسم نے انسانی جراہی کی تاریخ میں سب سے زیادہ افیون کا استعمال سرجری کے دوران مریضوں کو درد سے بچاؤ کے لیے کیا تھا۔ جس کو مثال بنا کر آج تک مریضوں کو سرجری سے پہلے نشہ دے کر سُلایا جاتا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے مریضوں کی سرجری ان کے ہوش وحواس کے دوران کی جاتی تھی جس کے نتیجے میں کئی مریض درد کی تاب نہ لا کر مر جاتے تھے۔ امریکہ کی کئی ریاستوں کے عجائب خانوں میں آج تک ایسے اوزار پائے جاتے ہیں جن سے مریضوں کو جکڑ کر زبردستی جراہی کا عمل کیا جاتا تھا۔

طب کی دنیا میں ابنِ سینا کی معروف کتاب The Canono of Medicince نے اپنے دور میں طب کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اس کتاب کے تراجم دنیا کی تمام زبانوں میں ہوئے اور اسے کئی ممالک میں باقاعدہ میڈیکل کے کورس میں شامل کی گیا تھا۔ یورپ میں بوعلی سینا کی یہ کتاب کئی صدیوں تک میڈیکل کالجوں میں پڑھائی گئی۔ گینس ورلڈ ریکارڈ میں اس کتاب کو طبی دنیا میں سب سے زیادہ عرصے تک پڑھائی جانے والی واحد کتاب کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ اس کتاب میں افیون کے علاوہ کئی دوسرے نشہ آور پودوں کے استعمال کے طبی فوائد درج ہیں۔ اس کتاب نے یورپ کو باقی نشہ آور پودوں کے ساتھ افیون کے طبی فوائد سے متعارف کرایا تھا نہ کہ نشے کے طور پر۔ میں اپنی اس تحریر میں مسلمانوں کی وکالت نہیں کر رہا ہوں بلکہ یہ سب کچھ تاریخی حوالوں سے لکھ رہا ہوں کہ یورپ کی طرح افریقہ اور چین میں بھی ابنِ سینا کی اس کتاب کا ترجمہ میڈیکل کالجوں میں پڑھایا جاتا رہا جہاں سے لوگ افیون سے متعارف ہوئے۔ اس سچائی کے پیش نظر مسلمانوں نے دنیائے طب میں افیون اور باقی نشہ آور پودوں کا استعمال بنی نوع انسان کی فلاح کے لیے کیا تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ غلط ہاتھوں اور غلط ذہنوں میں پہنچ کر نشے کے طور پر استعمال ہونے لگا۔

موجودہ تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ برطانیہ نے افیون کو چین پر زبردستی مسلط کیا تھا۔ 1839-1729 کے درمیان برطانوی تاجروں نے چین میں افیون بیچ کر ایک سو دس سال تک خوب دولت کمائی۔ جس کی وجہ سے چین کی ایک چوتھائی سے زیادہ آبادی افیون کی عادی ہو گئی۔ اس قاتل وبا کو روکنے کے لیے جب 1839 میں تو ینگ خاندان کے بادشاہ ینگ ژینگ نے چین میں افیون کی درآمد کو نشہ آور پودوں کی انسانی تاریخ میں پہلی بار، غیر قانونی قرار دیا تو برطانیہ کی معاشی حالت ایسی دگرگوں ہوئی جیسے آج کل امریکہ کی ہے۔ برطانیہ کو اپنی معاشی بحالی کا کوئی اور راستہ نہ ملا تو اس نے چین کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اس جنگ کو پہلی جنگِ افیون (Opium War) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس جنگ میں برطانیہ کی جیت ہوئی جس کے عوض چین کو ڈیڑھ سو سال کے لیے ہانگ کانگ کا جزیرہ برطانیہ کے حوالے کرنا پڑا۔ 1854 میں چین کے کمشنر لن زیزو نے پیکنگ کی بندرگاہ پر برطانیہ سے درآمد شدہ افیون کے بیس ہزار بیگ جلا کر ایک بار پھر چین میں افیون پر پابندی لگا دی۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی سے فارغ ہو کر برطانیہ نے 1858 میں جواباً چین کے خلاف دوسری بار جنگ افیون کا اعلان کر دیا۔ برطانیہ یہ جنگ بھی جیت گیا لیکن چین میں عیسائی مشن نے افیون کے نشے میں کمزور ہونا شروع کر دیا۔ آخر کار 20 ستمبر 1906 میں چین کے حکمرانوں نے حالات کو اپنے قابو میں لے کر افیون کو مکمل طور پر ملک بدر کر دیا۔

امریکہ میں سین فرانسسکو کے ساحل پر چین کے لوگ اپنے ساتھ افیون لے کر انیسویں صدی کے درمیان اترنا شروع ہوئے تھے۔ 1875 تک امریکہ کا یہ شہر افیون کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ امریکی عورتوں نے افیون کی لالچ میں چینیوں کی گود میں بیٹھا شروع کر دیا تو حکومت ہوشیار ہوئی اور امریکہ میں افیون کے خلاف پہلا قانون پاس ہوا۔ جس کی رو سے شارعِ عام افیون کے استعمال پر پابندی لگا دی گئی۔ ریاست کیلی فورنیا نے 1891 میں شارعِ عام افیون کے استعمال پر پابندی لگا دی۔

ان پابندیوں سے بھی جب مسئلہ حل ہوتا نظر نہ آیا تو امریکی حکومت نے افیون کے کاروبار میں منافع دیکھتے ہوئے اس پر 1912 میں ٹیکس عائد کر دیا۔ انہی دنوں امریکہ میں شراب پر پابندی تھی۔ لوگوں اور حکومت نے شراب سے متبادل افیون کے کاروبار سے اپنے بنک بھرنا شروع کر دئے۔ اس سے پہلے کہ افیون کی وبا چین کی طرح امریکی عوام کو اپنی لپیٹ میں لیتی 1924 میں باسٹھ ممالک نے لیگ آف نیشن قائم کر کے افیون کو انسانی استعمال کے لیے خطرناک نشہ قرار دیتے ہوئے اس پر بین الاقوامی طور پر پابندی لگانے کا فیصلہ کیا۔

امریکہ نے افغان مجاہدین سے مل کر افیون کے پودے کی کاشت کو افغانستان سے ختم کرنے کی کوشش کی تھی جو کسی حد تک کامیاب رہی۔ افغان مجاہدین جب طالبان کے روپ میں برسرِ اقتدار آئے تو انہوں نے 2000 میں افیون کی پیداوار میں کمی کر دی۔ اب افغانستان میں افیون کی پیداوار میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ اس وقت دنیا کے کئی ممالک کھربوں ڈالر کی قانونی اور غیر قانونی طور پر افیون اور مارفین کے لیے پوپی کی کاشت کر رہے ہیں۔ کولمبیا کے کوکین کے بڑے بڑے گروؤں نے اس کاروبار میں منافع دیکھتے ہوئے افیون کے کارخانے لگانا شروع کر دیے ہیں۔ آج کل کالی افیون ایشیائی ممالک کی سوغات تصور کی جاتی ہے، بھوری افیون میکسیکو سے امریکہ لائی جاتی ہے اور سفید افیون کولمبیا سے امریکہ سمگل ہو رہی ہے۔

- بقیہ -

صحرا میں اذان

سب سے پہلے سٹیج سیکریٹری نے' تالیوں کی گونج میں ملک مہربان کو سٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ ملک مہربان اپنے دو وکلا شگوف بردار محافظوں کے بیچ سے اٹھ کر ایک ہاتھ میں موبائل فون اٹھائے اور دوسرا ہاتھ سامعین کی جانب ہلاتے ہوئے بڑے کرّ وفر سے سٹیج کی جانب چل پڑے۔ دوسرے نمبر پر سٹیج سیکریٹری کی جانب سے سرکاری افسر کو اُن کی طویل قومی' علمی' ادبی خدمات کی تفصیل و تحسین کے ساتھ پکارا گیا۔ جس کے جواب میں شانِ استغنیٰ کے ساتھ' تیز تیز قدم بڑھا کر' سرکاری افسر سٹیج پر چڑھ گئے۔ تیسرے نمبر پر بزرگ شاعر' ادیب' نقاد' دانشور اور ادبی دھڑے کے سربراہ کو بڑی تعظیم اور تکریم کے ساتھ اسٹیج سے پکارا گیا جس کے جواب میں بڑی عاجزی اور انکساری کے ساتھ مذکورہ بزرگ ایک معاون کی مدد سے سٹیج پر چڑھنے میں کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد خاتون کی باری تھی۔ جن کی تعریف میں سٹیج سیکریٹری رطب اللسان تھا۔ پہلے خاتون نے مسکرا کر اپنے دائیں بائیں دیکھا پھر شرما کر گردن نیچے جھکاتے ہوئے اپنا دوپٹہ درست کیا' پرس کھول کر' پڑھنے والے مضمون کی موجودگی پر اطمینان کا اظہار کیا اور آہستہ آہستہ سٹیج کی جانب روانہ ہو گئیں۔

گلے کو کھنکار کر صاف کرتے ہوئے تازہ جوش اور ولولے سے سٹیج سیکریٹری نے آج کے دولہا یعنی صاحب کتاب کو پکارا' ''اب میں آج کی تقریب کے دولہا یعنی صاحبِ کتاب! عزیز دوست' قابلِ احترام قلمکار' دوستوں کے لئے ڈھال' دشمنوں کے لئے تلوار جناب! دلبر صحرائی کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دوں گا۔۔۔ جناب! دلبر صحرائی سٹیج پر تشریف لائیے۔۔۔ میری درخواست ہے جناب! دلبر صحرائی سٹیج پر تشریف لے آئیں تا کہ جلسہ کی باقاعدہ کاروائی کا آغاز کیا جا سکے۔''

ہر پکار کے بعد سٹیج سیکریٹری' طاقت کا استعمال بڑھا دیتا ہے جس کے باعث اُس کی آواز باتھ روم میں بھی آسانی سے سنائی دے سکتی ہے ۔۔۔مگر۔۔۔ وہ کیا کرے؟۔۔۔ کہاں جائے؟۔۔۔ کس کو مدد کے لئے پکارے۔۔۔ انسانوں کے بیچ' جانے کے لئے۔۔۔ اُن جیسا چہرہ کہاں سے لائے۔۔۔!!!

"حکمِ الٰہی"

تجھے دنیا میں رہنا ہے

رضیہ اسماعیل
(یوکے)

محبت بال کھولے، سوختہ جاں، لڑکھڑاتی
ایک دن در پر مرے آئی
کہا!
کم ظرف لوگوں نے مجھے بدنام کر ڈالا
میں کتنی اجلی تھی، مجھ کو صبح سے شام کر ڈالا
کبھی آکاش ہوتی تھی
مجھے مٹی بنا ڈالا
میں اب فریاد کرتی ہوں
اسی کو یاد کرتی ہوں
کہا تھا جس نے مجھ سے
جاؤ سب کے من میں بس جاؤ
میں کس گھر میں بسوں!
جب کہ در و دیوار پر نفرت کے پہرے ہیں
زمانے کے لیے اب بس محبت لفظ ہے
اک نام ہے، وہ جام ہے
جس سے بجھا کر پیاس
اس کو توڑ دیتے ہیں
دلوں کو موڑ لیتے ہیں
اسی دُکھ کو سمیٹے میں
کبھی بادل میں ڈھلتی ہوں
کبھی برسات ہوتی ہوں
کبھی میں دُور ہوتی ہوں
کبھی میں پاس ہوتی ہوں
کبھی میں تیر بنتی ہوں
کبھی تلوار ہوتی ہوں
کبھی زخموں کا مرہم ہوں
کبھی نشتر چبھوتی ہوں
کہیں آنکھوں کا پانی ہوں
کہیں میں آگ ہوتی ہوں
کہیں میں آہ بن کر
آشیانے پھونک دیتی ہوں
کہا میں نے محبت تو بہت نازک
بہت پاکیزہ جذبہ ہے
یہ اتنی تلخیاں لے کر بہت سے دُکھ سمیٹے
کیسے اب خالق سے تو نظریں ملائے گی!
ترا مذہب نہیں نفرت
زمانہ تجھ سے کتنا تلخ ہو جائے
تجھے نفرت کے گھر میں قید کر ڈالے
تمہاری نوچ لے آنکھیں
تمہیں برباد کر ڈالے
ترے تن پر، ترے من پر
ہزاروں زخم آ جائیں
تو چاہے کتنی گھائل ہو
تجھے دنیا میں رہنا ہے
سبھی کا درد سہنا ہے
یہی تقدیر ہے تیری
یہی حکمِ الٰہی ہے!

○

وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار

ڈاکٹر رؤف خیر (حیدرآباد،دکن)

شمس رحمٰن عرف فاروقی
تھے جو شب خون کے سپہ سالار

ہاتھ میں لے کے ذوالفقارِ قلم
سو مناتِ ادب پہ کی یلغار

دہریوں کو نکالا قلعوں سے
کردیے ان کے حوصلے مسمار

زعفرانی تھا گیانؔ یرقانی
اس سے دنیا کو کردیا ہشیار

میرؔ و غالبؔ کا شعرِ شور انگیز
اور باقی کے شعر بے معیار

چاند چہرہ وزیر خانم کا
تھا سرِ آسمان رونق بار

نثر کا امتیاز سمجھایا
شعر اور غیر شعر کا معیار

درس دیتے رہے بلاغت کا
لکھ کے بوطیقہء جدید آثار

آپ کے تبصرے بھی تھے بھرپور
اور تنقیدِ نَو بھی خوش اقدار

رد کیا جوشؔ ملسیانی کا
بن کے اقبال کا سپہ سالار

دشمنوں کی خبر وہ لیتے تھے
تھا ''خبر نامہ'' ان کا اک ہتھیار

تھے وہ علمِ عروض کے ماہر
تھے زبان و بیاں کے شاہ سوار

بے گماں دشمنوں کے دشمن تھے
جاں نثاروں کے اور یاروں کے یار

ناصرؔ کاظمی کبھی مشتاقؔ
ان کی نظروں میں تھے فراقؔ سے پار

بڑھ کے غالبؔ سے ہے ظفرؔ اقبال
کبھی ایسا بھی کردیا اظہار

لے لیا یہ بیان پھر واپس
اور ان اسناد کو کیا بے کار

وہ بدلتے رہے ہیں ترجیحات
اپنے الفاظ پر نہ تھا اصرار

خود میں اک انجمن تھے فاروقی
زیبؔ سر کرکے علم کی دستار

قلعہ شعر و ادب کا تاریخی
اس دسمبر میں ہوگیا مسمار

خیرؔ تاریخ کوئی ''پاک'' نکال
وقنا ربّنا عذاب النار

عصبیتوں کی دُھند میں گم شدہ چہرہ

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

دھند چھائی ہوئی ہے
چاروں اور
میرے پیارے وطن میں
چاروں اور

دھند چھائی ہوئی ہے
سرخ وسیاہ
یوم آغاز سے نہ دیکھ سکا
یوم آغاز سے ترستا ہوں
دیکھنے کے لیے وہ اک چہرہ
میرے پرکھوں نے اور
خود میں نے
اپنے خوابوں میں دیکھ رکھا تھا
دُھند چھائی ہوئی ہے چاروں اور
اب وہ چہرہ نظر نہیں آتا۔۔۔!!

○

نہ پوچھ مجھ سے اے ہم نشیں

یوگیندر بہل تشنہ
(کینیڈا)

نہ پوچھ مجھ سے اے ہم نشیں!
وہ کیا تھا میرا؟
میرا غمگسار، میرا ہمنوا، میرا ہمسفر
دمساز، ہمدم، ہمدرد آشنا میرا
دلدار ودلنواز وآسرا، میرا دستگیر
طرب ونشاط وغم میں
قدم قدم پہ میرے ساتھ ساتھ تھا
میں کیا کہوں وہ کیا تھا میرا
وہ کیا کیا نہ تھا
جب وہ جہاں سے اُٹھ گیا، میرا جہان بھی لُٹا!
وہ ساتھ اپنے میرا یہ سب کچھ لے گیا
اب ہر طور وطریق سے
مجھ پر ہے انگشتِ غار جہاں
اور کیسی کیسی بلاؤں کا ہو رہا ہے روز وشب نزول
میرا جی جانتا ہے اے ہم نشیں
اس شور وشغب میں کٹتے ہیں کیسے میرے
روز وشب!!!
نہ پوچھ مجھ سے اے ہم نشیں

○

کبھی شاید

حمیدہ معین رضوی
(لندن)

کبھی شاید انھیں لمحوں میں
تم بھی جاگتے ہو گے
فلک کو تاکتے ہو گے
تب ہی میں بھی۔۔اسی لمحے
پرانے زخموں پہ اپنے
ستارے ٹانکتی ہوں گی
سیہ راتوں کی خاموشی
جلا دیتی ہے زخموں کو
میں ان زخموں کو دل سے پیار کرتی ہوں
پلٹ کر دیکھتی ہوں دور تک اس راہ کو
جس پہ۔۔
میں چل کے آئی تھی اک دن ۔۔۔مگر حیران سی ہوں میں ،
مرے ہمراہ تھے کتنے
وہاں تو ایک میلہ تھا، بہت سے دوست تھے میر ے عجب رونق
سی تھی ہر سو
مگر دیکھو۔۔نہیں باقی ہے کچھ بھی اب۔۔۔یہ پنجہ قت کا کیسے
ہمارا خون کرتا ہے
یہی دستور ہے شاید
میں تکتی آسماں کو ہوں،
مین روتی ہوں، میں ہنستی ہوں میں
سب کو۔۔یاد کرتی ہوں۔۔کبھی شاید
انھیں لمحوں میں تم بھی یاد کرتے ہو۔
مجھے لگتا ہے کیوں ایسا؟
کبھی ایسا ہوا ہوگا
کہ تم بھی جاگتے ہو گے
فلک کو تاکتے ہو گے
تب ہی میں بھی
پرانے زخموں پہ اپنے
ستارے ٹانکتی ہوں گی
سیہ راتوں کی خاموشی
جلا دیتی ہے زخموں کو
میں ان زخموں کو دل سے پیار کرتی ہوں
پلٹ کر دیکھتی ہوں دور تک اس راہ کو
جس پہ میں چل کے آئی تھی لیکن
وہاں تو ایک میلہ تھا، بہت سے لوگ تھے جب تو
مگر اب تو نہیں باقی ہے کچھ بھی تو۔
میں تکتی آسماں کو ہوں،
مین روتی ہوں، میں ہنستی ہوں میں تم کو یاد کرتی ہوں
کبھی شاید مجھے تم بھی انھیں لمحوں میں۔۔۔۔۔

''اَنمٹ لکیر''

(ایک سانیٹ بہ زبانِ شمس الرحمٰن فاروقی)

علیم صبا نویدی
(چنئی)

مجھ کو پہچان نئے عہد کا سرمایہ ہوں
مجھ سے قائم ہے ہر اک دور کے ماتھے کی پھبن
ہے معطّر مری سوچوں سے زمانے کا بدن
ہر نظارہ مری آنکھوں سے جنم لیتا ہے
پھر میرا احساس اندھیروں کو مٹا دیتا ہے
مرے افکار نے روکا کئی طوفانوں کو
مری چاہت نے منوّر کیا ارمانوں کو
کتنے ارمانوں کی سوغات لیے آیا ہوں

مجھ سے پہلے بھی کئی آئے تھے میری ہی طرح
مجھ میں جو کچھ بھی ہے پوشیدہ وہ اوروں میں نہیں
مجھ سا روشن کوئی چہرہ یہاں چہروں میں نہیں
مٹ گئے کتنے یہاں بجھتی لکیروں کی طرح

میں صحیفہ ہوں کئی صدیوں پڑھا جاؤں گا
غالبؔ و میرؔ کی دنیاؤں پہ چھا جاؤں گا

نئے سال کی دعا

انجم جاوید
(کراچی)

نئے سال کی پہلی بارش میں رقصاں
ہماری محبت کے نازک سے جذبات
خوشبو کے مانند دوشِ ہوا پر
اُڑے جا رہے ہیں
لبوں پر دعائیں دِیوں کی طرح جگمگاتی ہیں
تو پھول کِھل کر ترے لب کی سرخی
ترے جسم کی دل کشی بنتے جاتے ہیں
اور حرف دل بن کے کہتے ہیں تم سے
سدا خوش رہو تم، سلامت رہو تم
محبت کی مانند علامت رہو تم

''اردو ادب''

بانہوں میں بھرنے آیا جو اردو ادب مجھے
حیرت سے دیکھنے لگے اہلِ عرب مجھے
دل کو سکون دینے کو کرتی ہوں شاعری
تحسین اور داد کی کب ہے طلب مجھے

ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی
(مصر)

نیا سال ۲۰۲۱ء مبارک

مشیر طالب

(نیویارک)

تبسم سرگراں ہے، لب پہ رقصاں کچھ دعائیں ہیں
نصیبِ خوش گمانی، صبحِ روشن کے گماں میں ہے
درِ اُمید پہ ہر آس کے ہاتھوں میں گجرے ہیں
خوشا! اے سال ٹونٹی وَن! تو نازِ دلبراں میں ہے

بدن جھلسے ہوئے ہیں دھوپ کی شدت سے، ٹونٹی وَن!
ہماری آبلہ پائی بھی فریادی ہے راہوں میں
جو گزری ہے گذشتہ سال ہم پر، وہ تو کیا جانے
کہ جیسے نامزد تھی دنیا نا کردہ گناہوں میں

گلی کوچے بڑے سنسان ہیں، اے سال ٹونٹی وَن!
ہوائیں سنسناتی ہیں اجل کی نامہ بَر ہو کر
سکوتِ مرگ کا باعث کرونا ٹین ایجر ہے
گھروں میں قید ہو جاتے ہیں سب پیاروں کو رو دھو کر

ترے آنے سے شاید یاسیت میں کچھ کمی آئے
تری آمد! المناکی کا سدباب ہو جائے
دریدہ دامنی! شاید تجھی سے چاک سلوائے
تجھے رخصت کریں جب ہم، تو ہو کے سرخرو جائے

مبارک ٹونٹی ٹونٹی وَن! مبارک ٹونٹی ٹونٹی وَن!
مہک اٹھیں تری خوشبو سے ویرانے و دشت و بن!

○

چیتھڑے

وشال کھلّر

(لدھیانہ)

چینی لفافوں پر
ہندوستانی عینک چڑھائے
اس نے حد کر دی

پسینے سے شرابور جسم پر
بارود کے چیتھڑے
چپکا کر
گیان وگیان کی باتیں

ہمارے عہد کا لہو
پانی میں وجود
چاروں جانب دھوپ!

سانحہ بلوچستان کے حوالے سے

بس اتنی اسیروں کی تقدیر بدلتی ہے
زندان بدلتے ہیں، زنجیر بدلتی ہے
ایوان سیاست میں تصویر بدلتی ہے
جلّاد بدلتا ہے، شمشیر بدلتی ہے

سید نصرت بخاری

(اٹک)

تاریخ کے نقوش

ڈاکٹر مبارک علی
(لاہور)

کچھ کتابوں کے بارے میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے دنیا کو بدل ڈالا۔ ان کتابوں کا انتخاب اہل دانش اپنی مرضی اور حالات کے مطابق کرتے ہیں۔ لیکن جہاں کتابیں دنیا کو بدلتی ہیں وہیں کچھ کتابیں ایسی بھی ہیں جو دنیا کو گمراہ کر کے اُس کی پسماندگی کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔

یورپ میں سائنسی انقلاب اور روشن خیالی کی تحریک کے بعد تین مفکروں کی کتابیں تھیں کہ جنہوں نے دنیا کے بارے میں نظریات اور خیالات کو الٹ کر رکھ دیا۔ ان میں چارلس ڈارون (Charles Darwin) کی کتاب اوریجن آف سپیشیز (Origion of Species) جو 1859ء میں شائع ہوئی۔ اس نے انسانی ارتقاء کے بارے میں سائنس کی بنیاد پر ثبوت دے کر تخلیق کے عقیدے پر کاری ضرب لگائی جس کی وجہ سے اب تک اس کائنات کو مذہب کی نظر سے دیکھا اور سمجھا جاتا تھا اُس کی نوعیت بدل گئی اور اُس کی جگہ سائنس نے لے لی۔ یہ اس بات کا سبب بنا کہ کائنات اور انسان کا مطالعہ سائنسی بنیادوں پر کیا جائے۔ اب تاریخ کے ایک نئے مکتبہ فکر جو بگ ہسٹری کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ کائنات اور انسان کے ارتقائی عمل پر تحقیق کر رہا ہے جس کی وجہ سے مفروضوں کی زنجیریں ٹوٹ رہی ہیں۔

ڈارون کے ہی ایک ہم عصر کارل مارکس (Karl Marx) اور اس کے ساتھی اینگلز (Engles) نے 1848 میں کمیونسٹ مینی فیسٹو (Manifesto) شائع کرایا۔ اس کے بعد 1867ء میں کارل مارکس کی کتاب (Das Capital) شائع ہوئی۔ ان دو کتابوں نے تاریخ معیشت، فلسفے اور سیاسیات کے وہ دریچے کھولے جن کی وجہ سے کسان اور سوسائی کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کی آگاہی پیدا ہوئی۔ وہ نظریات تھے کہ جو دنیا بھر میں انقلابات کا باعث ہوئے۔

تیسرا اہم شخص سگمنڈ فرائڈ (Sigmand Freud) جس نے انسانی نفسیات کے پیچیدہ اسرار و رموز کھول کر اس کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کو بے نقاب کیا۔ لیکن جہاں ان کتابوں میں کائنات دنیا اور انسان کے بارے میں خیالات اور افکار کو بدل وہیں اسی کتابوں کی بھی کمی نہیں کہ جنہوں نے نسلی تعصّبات، انسان دشمنی اور یورپی سامراج کو تقویت دے کر ایشیا اور افریقہ کی حکومتوں کو جائز ثابت کیا۔ گوبینو نے اپنی کتاب "An Essay on the Inequality of the Human" جو 1852ء میں شائع ہوئی۔ اس میں سفید اقوام کو برتر ثابت کرتے ہوئے یہ دلیل دی ہے کہ بیان کا حق ہے کہ وہ غیر یورپی اقوام پر حکومت کریں۔ اس نظریے کو انگلستان کے فلسفی ہربرٹ سپنسر (Herbert Spencer) نے سوشل ڈارون ازم (Social Darwinism) کے تحت سروائی ول آف دی فٹیسٹ کے ذریعے یہ دلیل دی کہ انسانی ارتقاء سے ہی ثابت ہوتا ہے کہ طاقتور قوموں کو زندہ رہنے کا حق ہے۔ کمزور قوموں کی قسمت میں موت کا ہونا لازمی ہے۔ ہربرٹ سپنسر اس کا بھی مخالف تھا کہ ریاست کو فلاحی Welfare بنایا جائے کیونکہ سوسائٹی میں جو کمزور لوگ ہیں انہیں زندہ رکھنے کے لئے اُن پر خرچ کرنا بے سود ہے۔ لہذا جب ایڈولف ہٹلر نے 1925ء میں اپنی کتاب "Mein Kampf" شائع کی تو اس میں نسل پرستی کے انکار کی وہ بازگشت نظر آتی ہے جو ہٹلر سے پہلے یورپ کے نسل پرست دانشور اور سائنسدان کہہ چکے تھے۔ لہذا جب 1933 عیسوی میں ہٹلر برسر اقتدار آیا تو اس نے اپنے نسل پرستانہ خیالات کو عملی جامہ پہناتے ہوئے یہودیوں اور خانہ بدوشوں کا قتل عام کیا۔ اُس نے Eugenic پر عمل کرتے ہوئے اور پیدائشی طور پر کمزور بچوں کو اس تصور کے تحت مارڈالا کہ جن قوم کو صحت مند اور مضبوط ہونا چاہیئے۔ یورپ نے ان کتابوں کا نقی عذاب سہا اور اس کا حل بھی تلاس کرنے کی کوشش کی۔ مگر ان کتابوں کے نسلی تعصّبات آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔

اب ہم مختصراً یہ جائزہ لیں گے کہ مسلمانوں کے معاشروں میں وہ کوئی کتابیں تھیں کہ جنہوں نے فکری عمل کو روک دیا۔ یونانی فلسفے کے تراجم کے بعد مسلمانوں کی سوسائٹی میں جو ایک روشن خیالی کی لہر کی تھی اس کو روکنے اور ختم کرنے کا کام امام غزالی نے 1111ء میں کیا۔ اپنی کتاب تحافتل فلسفہ میں انہوں نے فلسفے پر تنقید کرتے ہوئے اُس کو اس قدر رد کیا کہ مسلم معاشرے میں اس کی کوئی جگہ نہیں رہی۔ اپنی کتاب "احیاء العلوم میں انہوں نے مذہب میں کسی بھی نئی تشریح کے راستوں کو بند کر دیا۔ جس کی وجہ سے مسلم دنیا ایک جگہ ٹھہر کر روایتوں کی زنجیروں میں اسیر ہو گئی۔ جس سے اُسے اب تک نجات نہیں کی ہے۔

ہندوستان کا مسلم معاشرہ مغل زوال کے بعد اور برطانوی اقتدار قائم ہونے پر جن کتابوں سے متاثر ہوا ان کی مدد سے ہم اس کی ذہنی پختگی اور فکر کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ شروعات میں جن کتابوں نے اُس کو اپنے سحر میں مبتلا کیا۔ ان میں طلسم ہوشربا، داستان امیر حمزہ، قصہ حاتم طائی اور قصہ چہار درویش وغیرہ تھیں۔ یہ کتابیں ایک مایوس اور بے بس معاشرے کے لئے نشہ آور تھیں جو انہیں حقیقی دنیا سے دور طلسماتی اور خوابوں کی سرزمین پر لے جاتی تھیں۔ جو انہیں وقتی طور پر سکون دینے میں مدد دیتی تھیں۔ اس کے بعد کتابوں کا نیا سلسلہ وجود میں آیا یہ اسلامی تاریخی ناول تھے۔ بہت جلد انہیں مسلمان معاشرے میں مقبولیت ملی کیونکہ وہ قوم جو عملی طور پر زوال شدہ تھی، شکست خوردہ تھی، ان ناولوں کے کرداروں میں وہ خود کو سوتے ہوئے کافروں سے جنگ لڑ رہے تھے۔ انہیں شکست دے رہے تھے۔ فاتح ہو رہے تھے اور آخر میں کسی عیسائی دوشیزہ کو بھی انعام میں پاتے تھے۔

باقی صفحہ ۱۱۰ پر ملاحظہ کیجیے

بادِ سازگار لوگ

ناصر علی سید
(پشاور)

تب بہار جاتے جاتے رک گئی تھی، یہ 1988 کا زمانہ تھا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ کسی نے بہار میں آنے کا وعدہ کیا تھا مگر کتنی ہی بہاریں اسی طرح رک رک کے اپنی باری بھر کر چلی جاتیں مگر آنے والا لوٹ کر نہ آیا مگر لگتا تھا کہ اب کے اس کے کانوں میں صوفی تبسم کے شعر نے سرگوشی کی،

تم تو کہتے تھے بہار آئی تو لوٹ آؤں گا
لوٹ آؤ میرے پردیسی بہار آئی ہے

پھر شعر کا جادو چل گیا اور سارے ملک میں اس خبر کی خوشبو پھیل گئی کہ اپریل میں سب کا دلدار اور یارِ خوش گفتار و خوش اطوار دلیپ کمار اپنی جنم بھومی پشاور آرہا ہے، جاتی بہار نے اپنے قافلہ کو ایک بار پھر اکھڑے خیمے لگانے کا حکم دیا، مجھے یقین ہے کہ ایسا نہ بھی ہوتا تو پھر بھی بہار کا سا سماں اس لئے ہوتا کہ دلیپ کمار بلکہ یوسف خان بلکہ پشاوری روزمرہ کے مطابق یوسف جان کے شہر کے باسی ہمیشہ کہتے ہیں ''باغ دی بہار اے کہ دل دی بہار ہے'' اور دل کی کلی یہ خبر سن کر کھل اٹھی تھی۔ میرے لئے یہ خبر دہری خوشی لے کر آئی ایک تو میرے محبوب فنکار کی پشاور آنے کی خوشی اور دوسری خوشی یہ تھی کہ ایک سہانی صبح شفیق دوست ڈاکٹر سیمیں محمود جان میرے گھر نہ صرف یہ خبر لے کر آئیں۔ بلکہ مجھے یہ کہہ کر بہت بہت سرشار بھی کر دیا کہ یوسف بھائی پشاور فاطمید فاؤنڈیشن پشاور کے جس مرکز کے افتتاح کے لئے آ رہے ہیں اس تاریخی تقریب کے میزبان (کمپئر) آپ ہوں گے۔ ایک لمحے کو تو مجھ بہت بولنے والے کو چپ سی لگ گئی۔ کیا واقعی خوابوں کو تعبیر بھی مل جاتی ہے؟ میں سوچنے لگا۔۔۔ خیر کمپیرنگ کے اعزاز کے ساتھ ساتھ کچھ نئے احباب سے تعارف اور ملاقاتیں بھی میرے لئے دائمی خوشی کا باعث بن گئیں، فلمسٹار سائرہ بانو، ناظم جیوا، یوسف خان کے چھوٹے بھائی احسن خان (جنہوں نے شو کے فوراً بعد سٹیج پر آ کر میری میزبانی کو سراہتے ہوئے مجھے چائے کی دعوت دی، میں انہیں نہیں جانتا تھا مگر ان کے بے حد اصرار پر میں، رفعت اور چار سالہ افراز پشاور کے اکلوتے پنج ستاری ہوٹل چلے گئے، وہاں جب انہوں نے اپنا تعارف کرایا تو ہم سب کی حالت دیدنی تھی) اور دلیپ کمار کی استقبالیہ کمیٹی کے فعال، محبتی، ہنس مکھ اور خوبصورت 'ٹال' جواں رعنا ایک ڈاکٹر جن کے ماتھے پر دلیپ کمار کی سی ایک لٹ بھی ان کے چہرے کی بلائیں لے رہی تھی ویسے بھی یہ وہ دن تھے جب ہماری آنکھوں میں ایک ہی شبیہہ رکی ہوئی تھی جی ہاں یوسف جان کی شبیہہ۔ پھر ڈاکٹر سیمیں محمود جان نے تعارف کرایا یہ ڈاکٹر ریاض احمد ہیں، یہ ملاقاتیں بس تعارف اور یوسف خان کے پشاور رہنے تک ہی محدود رہیں، بعد کے زمانے میں صرف سیمیں جی سے ملاقات رہی، لیکن جاتی بہار کا وہ پھیرا دل میں ایسا تر و زور رہا کہ کوئی ربع صدی بعد جب ایک شام میرے فون پر ایک محبت بھری آواز نے کہا میں ڈاکٹر ریاض احمد ہوں آپ کو یاد ہوگا جب۔۔۔ میں نے انہیں بات مکمل کرنے کا موقع دیئے بغیر کہا، ڈاکٹر صاحب آپ کہاں ہیں آپ سے تو پھر نشتر ہال کے بعد ملاقات ہی نہیں ہوئی میں تو سمجھا آپ یوسف خان کے ساتھ بمبئی چلے گئے،، ہنس کر کہنے لگے میں پشاور میں ہوں اور آپ کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں پڑھتا اور دیکھتا رہتا ہوں، پھر کہنے لگے مجھے گلزار جاوید نے آپ سے رابطہ کرنے کا کہا ہے آپ ان کو جانتے ہیں میں نے کہا میں تو بس ایک ہی گلزار جاوید کو جانتا ہوں جس کی ''چہارسو'' گونج ہے، ہنس پڑے۔ جی وہی وہی۔ وہ ''چہارسو'' کا ایک ''قرطاسِ اعزاز'' آپ کے نام کرنا چاہتے ہیں، میں نے کہا اس کا مطلب ہے کہ میں تو انہیں جانتا ہوں وہ مجھے نہیں جانتے۔۔۔ بھائی اتنے معتبر جریدے میں یہ اعزاز قد آور قلمکاروں کو دیا جاتا ہے اور ''من آنم کہ من دانم''۔ خیر یہ قصہ تو دوست جانتے ہیں، اس فون کے بعد ڈاکٹر ریاض سے ملاقات تو نہ ہو پائی مگر رابطہ استوار ہو گیا، پاکستان میں بھی اور امریکہ میں بھی جہاں وہ میری دعوت پر نعتیہ مشاعرے میں آئے تھے۔ معلوم ہوا کہ حضرتِ ریاض احمد ڈاکٹر تو قلیم شاعری کے چھپے رستم نکلے جو چہارسو کے گلزار جاوید نے دریافت کئے، ایک بڑے اور مؤقر جریدے میں تواتر سے شائع ہونا بجائے خود ایک اعزاز سے کم نہیں، جس پر رشک ہی کیا جا سکتا ہے، اب کچھ دن پہلے مجھے چہارسو کے انعام الحق کی طرف سے گلزار جاوید کے اس حکم نامہ کے ساتھ ایک مسودہ موصول ہوا کہ چند سطریں اس پر لکھوں تو معلوم ہوا کہ یہ تو ڈاکٹر ریاض کا پہلا شعری مجموعہ ہے، میں تھوڑی سی اداسی اور بہت سی فرصت میں اسے پڑھ کر اس پر چار سطریں لکھنا چاہتا تھا مگر میں ایک مبتلا شخص بے کار کے کاموں میں کولہو کے بیل کی طرح جتا رہا۔ تاوقتیکہ گلزار جاوید کی ناراضی کا دھڑکا سا لگ گیا تو فکر دنیا سے چند لمحے مستعار لے کر یہ چند سطریں لکھنے بیٹھا جو کسی طور ڈاکٹر ریاض کی شعری ریاضت اور فکری منظر نامہ پر کا تجزیہ اور تبصرہ نہیں کہلایا جا سکتا بس ایک تاثر ہے جو پیش ہے، میں نے جتنا وقت بھی ریاض کے شعر کے ساتھ گزارا ہے اس نے مجھے کئی حوالوں نے اپنے سحر میں گرفتار رکھا، اور میں دیر دیر تک یہی سوچتا رہا کہ اردو شعر کی جو عمومی فضا ہمارے ہاں بنتی ہے ، جانے انجانے میں ہم نے اسے ایک ہی کھونٹے سے باندھ رکھا ہے، جون ایلیا نے کہا ہے کہ:

یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا

اس شعر میں خود کلامی کا رومینس اپنی جگہ مگر اردو شعر کی دنیا کا حتمی سچ بس یہی ہے، جس کی طرف جون ایلیا نے اشارہ کیا ہے اردو شاعری اُسی ایک شخص کے گرد ہی گھومتی ہے اور شاعر باقی جہاں سے کنارہ کئے رہتا ہے، ادیب سہارنپوری کا بھی مصرع ہے کہ ''چن لیا میں نے تمہیں، سارا جہاں رہنے دیا'' سو

''چہارسُو''

ہماری اردو شاعری کی جولان گاہ بس یہی ہے، مگر ڈاکٹر ریاض کا شعری اور فکری منظر نامہ محبت کے جن موسموں سے ترتیب پاتا ہے اس میں ''اُس شخص'' سے زیادہ ذکر ''جہان'' کا ہے جہان جس میں ہمارے کچھ بہت ہی میٹھے اور دل کو کہیں بہت اندر سے چھوتے وہ رشتے سانس لیتے ہیں جانے کیوں ہم نے انہیں شعر کی قلمرو سے دیس نکالا دیا ہوا ہے، مگر ریاض احمد نے ایسے تمام پوتر اور منزہ رشتوں کو محبت، خلوص اور احترام سے شعر میں برتا ہے، اور ان کے بارے میں برملا کہا ہے

زندگی میں لوگ کچھ ہوتے ہیں بادِ سازگار
پھیل جاتی ہے چمن میں جن سے خوشبوئے بہار

سو اس مجموعہ میں شامل اشعار کا ذائقہ آپ کو قدرے مختلف مگر بہت سچا لگے گا، ہمارے ہاں بہت سے اردو شعرا ایسے ہوتے ہیں جس میں شاعر کا مطالعہ تو جھلک رہا ہوتا ہے، مگر اس میں مذکور خواب کبھی خود شاعر کے لئے واردات نہیں بنے ہوتے، اس کے برعکس اس مجموعہ کی نظمیں جہاں انسانی رشتوں کے سچے بندھنوں کی کہانی سناتی ہیں وہاں کائنات کے اسرار و رموز کو قرانی بصیرت کے ساتھ سمجھنے اور سمجھانے کی ایک شعوری کوشش بھی ہیں، سیانے کہتے ہیں کہ آسمان کو چھونے کی خواہش میں بس اتنی احتیاط لازم ہے کہ اپنی زمین سے پاؤں اٹھنے نہ پائیں اور اس شعری مجموعہ میں شاعر نے کہیں بھی خود کو اپنے معروضی حالات سے الگ نہیں رکھا، ان کی رواں دواں نظمیں پڑھنے والے کو نہ صرف ساتھ لے کر چلتی ہیں بلکہ بہت بیر تک خورسند بھی رکھتی ہیں۔ اچھے مصرعے اور شعر ڈاکٹر ریاض کی شعری ریاضت کے گواہ بھی ہیں مگر چپکے چپکے کہہ بھی رہے ہیں کہ شعر کے معبد میں وہ اب زیادہ وقت گزارتے ہوئے اُن، اَن چھوئے اہداف کو حاصل کرنے کی سعی کریں جن کا حصول کسی بھی شاعر کو ''بقائے دوام کے دربار میں'' اعلیٰ نشست کا سزاوار ٹھہراتا ہے۔ میں ان کے شعر لکھنے کی بجائے پڑھنے والوں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اس شعری مجموعہ کے کوہ ندا سے آنے والی صدا ''یا اخی۔۔یا اخی'' پر لبیک کہتے ہوئے اس مجموعہ کی سیر کریں جس میں غزل کے عمدہ شعر اور بے ساختہ مصرعے اسی طرح روک روک لیتے ہیں جس طرح 32 برس پہلے کی جاتی ہوئی بہار نے اپنے قافلے کو روک روک لیا تھا۔ اور جس نے مجھے خورسند اور سرشار کر کے کیٹس کا ہمزبان کر دیا تھا کہ

'' حسن دائمی مسّرت بخشتا ہے''

بقیہ : تاریخ کے نقوش

لہٰذا کتابوں میں تحریر شدہ ان فتوحات میں ہندوستان کے مسلم معاشرے میں ان حالات میں برتری کے ایسے احساسات پیدا ہوئے جبکہ حقیقت میں وہ گراوٹ اور پسنی کے عالم میں تھے۔ یہ ایک ایسے فریب میں مبتلا تھے کہ جس سے چھٹکارا پانا اُن کے لئے مشکل تھا۔ تاریخی ناولوں کے اس سلسلے کو آگے چل کر صادق حسین صدیقی سردھنوی نے آگے بڑھایا اور تقریباً ڈیڑھ سو ناول لکھ کر معاشرے کے ذہن کو نشہ آور بنایا۔ ان ناولوں کی جدید شکل نسیم حجازی کے یہاں ملتی ہے۔ جو اب تک اپنی مقبولیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔

جب تاریخی ناولوں کا جادو ٹوٹا تو جاسوسی ناولوں کی لہر آئی۔ خاص طور سے ابن صفی کے جاسوسی ناول دلچسپی کا باعث بن گئے۔ جاسوسی ناولوں کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں سراغ رساں یا تحقیقی افسر اپنی ذہانت اور تجربے سے جرم کے سربستہ رازوں کو فاش کرتا ہے۔ اس بیانیے میں قاری حیرت زدہ ہو کر سراغ رساں کے کارناموں سے متاثر ہوتا ہے، اور پھر اس تاثر کو اپنی عملی زندگی میں قومی رہنماؤں سے جوڑتا ہے جو ایک سراغ رساں کی طرح معاشرے کے تمام مسائل حل کر دیں گے جبکہ سوسائٹی خاموشی کے ساتھ اُن کے عمل کو دیکھے گی اور اُن پر انحصار کرے گی۔ اس ذہنیت کے نتیجے میں سوسائٹی تماشائی بن جاتی ہے۔

آخر میں میں مولانا اشرف علی تھانوی کی کتاب ''بہشتی زیور'' کا ذکر کروں گا۔ یہ کتاب اس وقت لکھی گئی کہ جب ہندوستان کے مسلم معاشرے میں یہ بحث ہو رہی تھی کہ کیا عورتوں کو پڑھانا چاہئے یا نہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی اس کے حامی ہیں کہ عورتوں کو صرف اس قدر تعلیم دینی چاہئے کہ وہ گھر کا حساب کتاب کر سکیں۔ وہ عورت پر مرد کی بالادستی کے قائل ہیں اور عورت کے لئے گھر کے علاوہ کسی اور جگہ اس کی موجودگی کو پسند نہیں کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کتاب میں عورت کو بطور غلام عادی ہونے کی ہدایات اور ترکیبیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب لڑکیوں کو جہیز میں دی جاتی ہے کہ وہ تابع اور فرمانبردار بن کر رہیں۔

کسی بھی سوسائٹی میں کتابوں کی اشاعت سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کیا شائع ہونے والی کتابیں دنیا کو بدلنے والی ہیں یا اسے فرسودہ روایات میں جکڑ کر رکھنا چاہتی ہیں۔ اس نقطہ نظر سے ہم پاکستان میں شائع ہونے والی کتابوں کا جائزہ لیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ یہ کتابیں مذہبی تعصبات، فرقہ وارانہ جذبات اور بے جا قومی فخر کے جذبات سے لوگوں کے ذہنوں کو متاثر کر رہی ہیں۔ اس ذہنیت کا اظہار آج کے پاکستانی معاشرے میں نظر آتا ہے۔

سادگی وتہہ داری کی ایک مثال

ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی
(شموگا، کرناٹک)

ڈاکٹر ذاکر فیضی کی کہانیوں کی کتاب ''نیا حمام'' کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ یہ ایسا حمام جس میں سبھی ننگے ہیں، مگر اپنے ننگے ہونے کا احساس کسی کو نہیں ہے۔اب ''نیا حمام'' کہانی کو ہی دیکھ لیجیے بظاہر یہ ایک اندھی، گونگی اور بہری بچّی کی المناک کہانی ہے۔مگر سچ یہ ہے کہ یہ بچّی اپنے وجودی تضاد اور ملال کی وجہ سے پورے سماج کا شناخت نامہ بن گئی ہے۔یہ بچّی جو اندھی، گونگی اور بہری ہے، ظاہر ہے کہ نہ اپنے والدین کے لیے راحت اور مسرت کا باعث ہے نہ ملک وسماج کے لیے مفید ہے، مگر تضاد دیکھیے کہ یہی اپاہج اور معذور بچّی جس کی اپنوں کی نظر میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔میڈیا کے لیے لاکھوں کروڑوں کا مال ہے۔جس کی زندگی کے کوئی معنی، مطلب نہیں ہے۔اس کی موت بلکہ اس کا قتل انمول ہے۔

آپ چاہیں تو اپنی سہولت کے لیے بچّی کی جگہ ہندوستان کے عوام کو، ماں کی جگہ حاکم یا حکمران کو اور میڈیا کی جگہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے مالکان کو بھی رکھ سکتے ہیں۔اس طرح یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجائے گی کہ ہم جس صارف سماج کا حصّہ ہیں وہاں ہر چیز بکتی ہے بلکہ بہت مہنگے داموں میں بکتی ہے۔کہانی ''نیا حمام'' کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''دیکھو، جب تم بچّی کو ختم کر رہے ہوگے تو کوئی مشہور نیوز چینل اپنے چھپے کیمرے میں قید کر کے ٹی وی پر دکھائے گا۔۔۔۔کوئی کمپنی اس پروگرام کو اسپانسر کرے گی۔تب کمپنی کا بزنس بڑھے گا، چینل کی ٹی آر پی بڑھے گی اور تمہارا بینک بیلنس بڑھے گا۔''

اس سیدھی سادی اور مختصر سی کہانی کے پسِ منظر اور بین السطور پر نظر کریں تو یہ چھوٹی سی کہانی بہت بڑی کہانی نظر آئے گی، اتنی بڑی کہ آج کی زندگی کی ساری سچائیاں اس میں جذب نظر آئیں گی۔یہ کہانی ہمیں اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔مگر ہماری حیرتوں کو نہیں جگا پاتی ہیں۔مگر اس میں کہانی کار کا کوئی قصور نہیں ہے۔قصور ہے اس سماج اور معاشرے کا جس میں ہم رہتے ہیں۔کیوں کہ اس سماج میں اس طرح کی کہانیوں سے ہر آن ہمارا سابقہ پڑتا ہے۔

ساری دنیا میں پھیلے یتیم خانے ہوں کہ اولڈ ایج ہوم، خیراتی تعلیمی ادارے ہوں کہ انسانی حقوق۔اور بچّوں کے حقوق کے تحفّظ کے نعرے لگانے والے ادارے، یا پھر طرح طرح کی این جی او، ہر جگہ یہی کھیل کھیلا جاتا ہے۔ایسے ہی ڈراموں اور اسی طرح کی قربانیوں سے شہرت اور دولت کمائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر ذاکر فیضی کی بیشتر کہانیاں مشاہدات اور حادثات کو واقعات میں بدلنے کی شعوری کوشش کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔اسی لیے ابھی واردات کی منزل دور نظر آتی ہے۔''ٹوٹے گملے کا پودا'' بھی سرسری نظر میں ایک سیدھی سادی المیہ کہانی نظر آتی ہے۔ایسی المیہ کہانی جو ہماری بارہا کی دیکھی اور سنی ہے۔مگر اس کہانی کی ندرت اور خوب صورتی سادگی میں پیوست پیچیدگی میں مضمر ہے۔

اس کہانی کے دو خاص کردار ہیں حنا اور پانی کا نل، جو ایک ہی سکّے کے دو رخ ہیں۔اس کہانی کا مرکز پانی کا نل ہے یا حنا اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ویسے نل کو اس کہانی کی دھری کے طور پر دیکھنا غلط نہ ہوگا کیوں کہ اسی دھری پر پوری کہانی گھومتی ہے۔پانی کا نل اس کہانی میں کئی طرح کی نفسیاتی گرہوں کی اشاریہ بن جاتا ہے۔جس سے اس سادہ سی کہانی میں گہرائی اور جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے۔

کبھی ایسا لگتا ہے کہ پانی کا یہ نل اس بڑے اور خوشحال خاندان کے مٹتے آثار کا اشاریہ ہے۔جس کا فرض تھا کہ وہ اپنے لوگوں کی سیری اور سیرابی کو یقینی بناتا۔مگر وہ اپنی ہی سیری کے لیے رنڈی کے کوٹھے تک محدود ہو کر رہ گیا۔اور جب اس نل کا پانی خشک ہو گیا تو کوٹھے والی نے ٹھوکر مار کر اسے وہاں سے نکال دیا۔

مگر یہاں جو گھر میں نل ہے وہ اپنا پانی کھو کر بھی اپنے پورے وجود کے ساتھ موجود ہے حنا اس نل کو چپل مار کر کھوکھلی شان وشوکت پر غصّہ اتار کر سیری اور تسکین حاصل کرتی ہے، تو دوسری طرف یہی نل اس کے خواب میں سیندھ لگا کر اس کی جنسی تشنگی کی مبہم علامت بن کر ابھرتا ہے۔اور کبھی یہی نل اور اس کا پائپ اس کے گلے کا پھندا بن جاتا ہے، جس کی وجہ سے اس کی گھٹن کا احساس شدید ہو جاتا ہے۔جس طرح خاندان کی جھوٹی شان اور شوکت کا احساس حنا کی پیاس بجھانے سے معذور ہے۔اسی طرح یہ نل بھی پانی کی دو بوند ٹپکانے سے محروم ہے۔اس پر سے ستم یہ کہ اس کا پورا گھرانہ اور یہ نل اپنے وجود کے پورے غرور کے ساتھ موجود ہے۔

یہ کہانی بہت ساری نفسیاتی گتھیوں سے گوندھ کر اس سادگی سے بیان کی گئی ہے کہ سرسری انداز میں دیکھنے سے کسی قسم کی پیچیدگی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔مگر جب رک کر غور کیا جاتا ہے تو سادگی میں پرکاری کا محاورہ سچ ہوتا نظر آتا ہے۔

کہانی میں ایک طرف نل ہے جو حنا کے جذبۂ تنفر کے اظہار کا مرکز ہے تو دوسری طرف خود حنا ہے جو گھر والوں کے جذبۂ تنفر کے اظہار کا محور ہے۔حنا کو نل سے نفرت ہے کہ پانی نہیں دیتا ہے۔اور گھر والوں کو حنا سے شکایت ہے، حسن اور جوانی کے باوجود کسی کو اپنے عشق میں مبتلا نہیں کر سکتی۔

کہانی کا المیہ صرف یہی نہیں ہے کہ نہ نل نے کسی کی پیاس بجھائی اور نہ حنا نے کسی کے عشق کی آگ کو بھڑکائی۔کہانی کا اصل المیہ یہ ہے کہ گھر والوں نے آخر تک حنا کی تشنہ زندگی کے کرب کو نہیں سمجھا جبکہ حنا نے نل کی تشنگی اور اس کے وجود کو شدّت سے محسوس کیا اس لیے وہ کہانی کے آخر میں اس سے لپٹ کر رو پڑی۔

باقی ۱۱۵ پر ملاحظہ کیجیے

ایک صدی کا قصّہ

شکیل بدایونی

دیپک کنول (ممبئی)

گوالیار میں ایک مشاعرے کا اہتمام ہو رہا تھا جس میں اُردو کے بلند پائے شاعروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ ناگپور سے حضرت ناطق گہلاوٹی کو خاص طور پر دعوت دی گئی تھی۔ ابھی مشاعرہ شروع نہیں ہوا تھا کہ ایک خوش پوش نوجوان اسٹیج کی طرف بڑھنے لگا۔ اُس نے ایک گرم سوٹ پہنا تھا۔ گلے میں ٹائی باندھی تھی۔ وہ کسی فلمی ہیرو سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ لوگ آگے بڑھ کر اُس سے آٹو گراف لے رہے تھے اور وہ مسکراتے ہوئے آٹو گراف دئے جا رہا تھا۔ اتنے میں ایک لمبے قد کا ایک تنومند معمر آدمی پٹھانی سوٹ میں ملبوس سیدھے پنڈال میں گھسا۔ اُسے دیکھ کر پنڈال میں بیٹھے سارے شعرا حضرات ادب سے کھڑے ہو گئے۔ یہ خوش پوش نوجوان شاید اُس بزرگ کے سبھاؤ سے واقف تھا اسلئے وہ آگے بڑھا اور اُسے خوش کرنے کے لئے اُسی کا ایک شعر پڑھا۔

وہ آنکھیں تو دل لینے تک بس دل کی ساتھی ہوتی ہیں
پھر لے کر رکھنا کیا جانے دل لیتا ہے یا کھوتا ہے

یہ اُردو کے بہت بڑے شاعر ناطق گہلاوٹی تھے جن پر اس خوشامد کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اُلٹے اس نوجوان کو دیکھ کر اُن کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ وہ بڑی بیزاری کے لہجے میں اُس نوجوان سے یوں گویا ہوئے۔ ''برخوردار تمہارے والد بھی شاعر تھے اور تمہارے چچا جان مولانا ضیا القادری بھی اُستاد شاعر تھے۔ تم سے چھوٹی موٹی غلطیوں کی اُمید ہمیں نہیں تھی۔ پہلے بھی تمہیں سنا پڑھا تھا مگر کچھ دن پہلے ایسا محسوس ہوا کہ تم بھی اُن ترقی پسندوں میں شامل ہو گئے ہو جو روایت اور تہذیب کے دشمن ہیں۔'' نوجوان اس بزرگ کی ڈانٹ سے گھبرا گیا۔ وہ اپنی خفت کو اپنی مسکراہٹ سے چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس نے بڑے ادب و احترام کے ساتھ بزرگ شاعر سے کہا۔ ''حضرت آپکی شکایت واجب ہے لیکن مہربانی کر کے غلطی کی نشاندہی بھی کر دیں تا کہ اُسے سدھارنے میں مجھے آسانی ہو''

بزرگ نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''برخوردار آجکل تمہارا ایک گانا اکثر ریڈیو پر سنائی دیتا ہے۔ اُسے بھی کبھی کبھار مجبوری میں ہمیں سننا پڑتا ہے۔ چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو، جو بھی ہو تم خدا کی قسم لاجواب ہو۔ میاں ان دونوں مصروں کا وزن الگ الگ ہے۔ پہلے مصرے میں تم لگا کر یہ کمی پوری کی جا سکتی تھی۔ کوئی اور ایسی غلطی کرتا تو ہم نہیں ٹوکتے۔ مگر تم ہمارے دوست کے فرزند ہو، ہمیں عزیز بھی ہو اسلئے ہم تمہیں آگاہ کرتے ہیں کہ بدایوں چھوڑ کر بھلے ہی بمبئی میں بس جاؤ مگر بدایوں کی وراثت کا تو پالن کرو۔''

بدایوں کی وراثت کا یہ علمبردار اور کوئی نہیں بلکہ شکیل بدایونی تھا جس کا اصل نام شکیل مسودی تھا۔ شکیل جو کہ تین اگست 1916 کو یوپی کے ضلع بدایوں میں پیدا ہوا۔ اُسکے باپ کا نام محمد جمال احمد سوختہ تھا۔ والد کی خواہش تھی کہ اُس کے بچے کا مستقبل سنہرا ہو اسلئے اُس نے اُسے گھر پر ٹیوشن دلانے کا انتظام کیا اور اسطرح اُسے ہندی، اُردو، فارسی اور عربی کی تعلیم گھر پر ہی دلائی گئی۔ شکیل کو بیشتر شاعروں کی طرح شاعری وراثت میں نہیں ملی تھی البتہ ایک دور کا رشتہ دار تھا۔ حضرت ضیا القادری بدایونی جو کہ صوفی شاعر تھا، اُس کی شاعری نے اُس پر اثر ڈالا اور وہ شعر و شاعری کی طرف مائل ہو گیا۔ اُس نے چودہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ شکیل اپنی زندگی کے بارے میں کہتے ہیں کہ بدایواں کے سوختہ خاندان سے ایک بزرگ تھے جن کا نام تھا منشی ہدایت اللہ۔ اُن کے دو صاحبزادے تھے۔ ایک کا نام منشی حضور احمد تھا اور دوسرے صاحبزادے تھے مولوی جمیل احمد قادری سوختہ۔ اُن کے صرف ایک لڑکا ہوا جو خاکسار ہے۔ منشی حضور احمد کی صاحبزادی ریاض بتول کی شادی مولوی قیصر حسین قادری سے ہوئی اور اُن کی بیٹی سلمہ سے میری شادی ہوئی۔ اُسی خط میں اُنہوں نے اپنی زندگی پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔ میرے والد مولوی جمیل احمد قادری سوختہ بمبئی میں خوجہ سنی مسجد میں امامت کرتے تھے اور عالم و واعظ تھے۔ اس لئے زیادہ تر بمبئی میں رہتے تھے اور میں بدایواں میں مولانا ضیا القادری کی زیر نگرانی رہتا تھا۔ مولانا ضیا القادری میرے والد کے بیحد عزیز دوست اور پڑوسی تھے۔ وہ نعت و منقبت کے مسلم الثبوت شاعر تھے اور پائے کے عالم، صوفی اور درویش تھے۔ میرے والد اور اُن کے تعلقات اس قدر گہرے تھے کہ لوگ اُن کو سگا بھائی سمجھتے تھے۔ اور اس طرح دونوں کا خاندان ایک ہی خاندان معلوم ہوتا تھا۔ بدایوں میں جتنے شعرا کرام اور علما آتے تھے مولانا ضیا القادری سے ملتے تھے۔ اس لئے مجھے بھی اُن سے ملنے کا شرف حاصل رہتا تھا اور مولانا ہی کے زیر تربیت مجھے شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔

1936 میں جب اُس نے علیگڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو اُس نے حکیم عبدل وحید اشک بجنوری سے باقاعدہ اُردو شاعری سیکھنے کے لئے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ وہاں کے مشاعروں میں وہ بلا ناغہ حصہ لینے لگا۔ انٹر کالج اور انٹر یونیورسٹی مشاعروں میں اُس نے کئی بار انعامات جیتے۔ 1940 میں اُس نے اپنی ایک دور کی رشتہ دار لڑکی سلمہ سے نکاح کیا جو کہ اُسی گھر میں بچپن سے رہ رہی تھی جس میں شکیل رہ رہا تھا مگر گھر میں پردے کا چلن ہونے کے باعث وہ کبھی اُسے دیکھ نہیں پایا۔ گھر کے مالی حالات ٹھیک نہیں تھے اس لئے بی اے پاس کرنے کے بعد اُسے محکمہ فوڈ اینڈ سپلائی میں نوکری مل گئی اور بطور ایک سپلائی افسر کے اُسے دلّی منتقل ہونا پڑا۔ یہاں کا ادبی ماحول بڑا خوشگوار تھا۔ شکیل بدایونی یہاں کے ہونے

والے مشاعروں میں بلاناغہ شرکت کرتا تھا۔ دلی کے مشاعروں نے اُسے خاصی شہرت دلائی۔ 1942 سے لے کے 1946 تک وہ دہلی میں محکمہ سپلائی میں کام کرتے رہے۔ دہلی میں اُسوقت ادبی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ مشاعرے ہوتے تھے جہاں بزرگ شعرا کلام سناتے اور نئے شعرا کی بھی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ شکیل بدایوانی ان مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ اس وقت تک اُنہیں کافی مقبولیت حاصل ہوچکی تھی۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام ''رعنائیاں'' شائع ہو چکا تھا۔ یہ مجموعہ کافی مقبول ہو چکا تھا۔ اُسی زمانے میں حفیظ جالندھری نے سر عبدالقادر سے ملاقات کرائی اور شکیل کو لاہور کی ادبی محفلوں میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ اُس نے شاعری میں خاصا نام کمایا۔ اُن دنوں زیادہ تر شاعر عوامی مسائل پر خامہ فرسائی کرتے تھے۔ ایک شکیل ایسا شاعر تھا جس کا محبوب موضوع رومانیت تھا۔ شکیل ایک غزل گو شاعر تھے۔ وہ اُردو اور فارسی کی کلاسیکی شاعری سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ اپنے دور کا ایک ہر دلعزیز شاعر تھا جس کے خواب نہایت ہی البیلے اور دلفریب تھے۔ شکیل حسن و عشق کے نغمے رسمی طور پر نہیں سناتے تھے بلکہ تخیل اور جذبے کی ہم آہنگی سے ان میں نئی وسعتیں پیدا کرتے تھے۔ شکیل کی مقبولیت کے پیچھے اُس کا لہجہ اور ترنم کا بڑا ہاتھ تھا۔ اُسکی رومانی شاعری سننے والوں کے دلوں کو چھوتی تھی۔ شکیل اکثر کہا کرتا تھا۔

میں شکیل دل کا ہوں ترجمان۔ کئی محبتوں کا ہوں رازداں
مجھے فخر ہے میری شاعری۔ میری زندگی سے جدا نہیں

ایک طرف جوش، اختر الایمان اور فیض اپنی انقلابی شاعری سے جادو جگا رہے تھے دوسری طرف شکیل رومانی شاعری کی جوت جگائے آگے بڑھ رہا تھا۔ سن 1944 میں شکیل ایک مشاعرے کے سلسلے میں بمبئی آئے۔ اُن دنوں اُردو شاعری کی بڑی دھوم تھی۔ لوگ مشاعرہ سننے کے لئے دیوانہ وار چلے آتے تھے۔ اس مشاعرے کو سننے کے لئے اُس زمانے کا مشہور فلمساز اور ہدایت کار عبدل رشید کاردار بھی موجود تھا۔ جب کاردار نے شکیل کو سنا تو وہ اُس کے کلام سے اس قدر محظوظ ہوا کہ وہ اُس سے جا کر ملا اور اُس سے پوچھا کہ کیا وہ اُس کی فلم کے لئے گانے لکھے گا۔ شکیل نے حامی بھری۔ کاردار اُن دنوں فلم ''درد'' کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس فلم کی موسیقی کا ذمہ نوشاد کو سونپا گیا تھا۔ وہ اُسے نوشاد علی کے پاس لے کے گیا۔ نوشاد نے اُس سے اپنی تخلیقی صلاحیت کا ایک شعر میں مظاہرہ کرنے کو کہا تو شکیل نے فی البدیہہ کہہ ڈالا۔ ہم درد کا افسانہ دنیا کو سنائیں گے۔ ہر دل میں محبت کی ایک آگ لگا دیں گے۔ نوشاد نے فی الفور اُس کا معاہدہ بنوا لیا اور اُسے فلم ''درد'' کے گانے لکھنے پر لگا دیا۔ فلم ''درد'' میں منور سلطانہ، ثریا اور شیام کام کر رہے تھے۔ یہ فلم 1947 میں ریلیز ہوئی۔ کون بھول سکتا ہے اومادیوی کا گایا ہوا یہ صدا بہار گانا ''افسانہ لکھ رہی ہوں دل بیقرار کا''۔ ثریا کا گایا گانا ہم تھے تمہارے تم تھے ہمارے، ہائے وہ دن زمانہ یاد کرو۔ کون چلا یہ کون چلا، ہائے یہ کون چلا۔ میری آنکھوں میں سما کر میری رگ رگ میں سما کر یہ کون چلا۔ ٹن ٹن کا یہ گانا آج مچی ہے دھوم، ثریا کا دل دھڑکے آنکھ موری پھڑکے۔ شمشاد بیگم کا یہ افسانہ نہیں ظالم میرے دل کی حقیقت ہے۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ منور سلطانہ پر اومادیوی کا گایا ہوا گانا۔ بے تاب ہے دل درد محبت کے اثر سے۔ اس فلم کے لئے شکیل نے دس گانے لکھے تھے جن میں سے پانچ ثریا نے گائے تھے۔ دو شمشاد بیگم نے گائے تھے۔ جب کہ تین اومادیوی (ٹن ٹن) نے گائے تھے۔ ''درد'' شکیل کی پہلی فلم تھی جس کے سبھی گانوں نے دھوم مچادی۔ ایسے بہت کم خوش نصیب ہوتے ہیں جنہیں پہلی ہی فلم سے کامیابی ملتی ہے۔ شکیل ایسے خوش نصیبوں میں سے ایک تھا۔

شکیل کی شاعری کی خصوصیت یہ تھی کہ اُس کی شاعری میں سادگی اور پرکاری ہوتی تھی اور اُسکی داخلی جذبات کی یہی سادگی و پرکاری سننے والوں کو متاثر کرتی تھی۔ ''درد'' کی کامیابی نے ایک جوڑی کی نیو رکھی جو دو دہائیوں تک فلمی جگت پر راج کرتی رہی۔ شکیل نے سرکاری نوکری چھوڑ دی اور وہ بمبئی میں آ کر بس گیا۔ فلم ''درد'' کے بعد اس جوڑی کی مانگ بڑھ گئی۔ ہر کوئی انہیں اپنی فلم میں لینا چاہتا تھا۔ ''درد'' کے بعد ایک اور کامیاب فلم منظر عام پر آئی جس کا نام ''دلاری'' تھا۔ محمد رفیع کی دل کو چھونے والی آواز میں اس فلم کا ایک صدا بہار گانا ''سہانی رات ڈھل چکی نا جانے تم کب آو گے'' سات دہائیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی اتنا ہی مقبول ہے جتنا کل تھا۔ ''دلاری'' کے بعد ایک اور کامیاب فلم ''دیدار'' نے شکیل بدایوانی کو شہرت کے معراج پر لا کے کھڑا کر دیا۔ اس کے بعد آئی ایک اور لافانی تصویر۔ ''بیجو باورا'' جس کی موسیقی نے ملک بھر میں تہلکہ مچا دیا۔ ایک ایک گانا نگینے کی طرح فلم میں پیوست تھا۔ وجے بھٹ اس فلم کے گانے مشہور شاعر پردیپ سے لکھوانا چاہتے تھے۔ نوشاد نے وجے بھٹ سے کہا کہ وہ ایک بار شکیل کو سن لیں۔ وجے بھٹ مان گیا۔ شکیل نے جب وجے بھٹ کو اپنا کلام سنایا تو وجے بھٹ موہت ہو کے رہ گیا۔ اُس نے پردیپ کو چھوڑ کر شکیل کو بیجو باورا کے گانے لکھنے کے لئے کہا۔ اس کے بعد کی کہانی ظاہر ہے۔ یہ فلم نوشاد اور شکیل کی زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ شکیل کو اُردو پر ہی نہیں ہندی پر بھی دسترس حاصل تھی۔ اس کا ثبوت وہ بھجن ہے جو اس فلم کے لئے شکیل نے لکھا۔ من تڑپت ہری درشن کو آج جسے محمد رفیع نے اپنی مدھر آواز سے امر کر دیا۔

شکیل اور نوشاد کی ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم بن چکے تھے۔ اُنہوں نے ایک نہیں انیک صدا بہار گانے دئے۔ ایک کے بعد ایک کامیاب فلم شکیل نوشاد جوڑی کی جگل بندی میں منظر عام پر آئی۔ جیسے ''شباب'' 1954 ''مدر انڈیا'' 1957 ''مغل اعظم'' 1960 ''گنگا جمنا'' 1961 ''میرے محبوب'' 1963۔ نوشاد نے اپنے ایک ریڈیو انٹرویو میں کہا کہ جب وہ فلم ''مغل اعظم'' کے گانے تیار کر رہے تھے تو ایک گانا ایسا پھنسا کہ وہ ساری رات کوشش کرتے رہے مگر گانا بن نہیں پایا۔ یہ وہی گانا تھا جو شیش محل میں

فلمایا جانے والا تھا۔ساری رات شکیل بدایونی مصرے لکھ لکھ کر نوشاد کو سناتے رہے اور نوشاد اُنہیں ناپسند کرتے رہے ۔ کمرہ کاغذ کے ڈھیر سے بھر گیا۔جس طرح کا گانا نوشاد کو چاہیے تھا وہ بن نہیں رہا تھا۔اچانک نوشاد کو ایک بھوجپوری گانے کا ایک مکھڑا یاد آیا۔بس پھر کیا تھا گانا یکدم بن گیا۔جب پیار کیا تو ڈرنا کیا ۔پیار کیا کوئی چوری نہیں کی، جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔اتنے سادہ بول۔اس ایک گانے نے تہلکہ مچادیا۔اسی طرح فلم ''گنگا جمنا'' کے گانے شکیل کے لئے ایک چیلینج کی طرح تھے۔بھوجپوری میں گانے لکھنا شکیل کے لئے ایک انوکھا تجربہ تھا۔ لاگا گوری گجریا سے نہا ہمار۔ہوئے گوا سارا چوپٹ ہمارا روزگار۔نین لڑگئی ہیں تو منوا ا کسک ہوئے بے کری۔نا مانو نا مانو رے۔دغا باز توری بتیاں نا مانو رے۔

شکیل نے نوشاد کے ساتھ ''اُڑن کھٹولہ'' اور ''امر'' جیسی فلمیں بھی کیں۔''اُڑن کھٹولہ'' کا یہ صدا بہار گیت ''او دور کے مسافر ہم کو بھی ساتھ لے لے ہم رہ گئے اکیلے'' میں جسطرح کا آرکسٹرا استعمال کیا گیا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔''امر'' کی یہ غزل ''نہ ملتا غم تو برباد ی کے افسانے کہاں جاتے'' سن کر ساحر لدھیانوی اتنا متاثر ہوا کہ اُس نے شکیل کو ایسی خوبصورت غزل لکھنے پر مبارک باد دی۔

شکیل اور نوشاد چوبیس سال تک ایک ساتھ کام کرتے رہے ۔نوشاد دھن بناتا تھا اور شکیل بدایونی اس دھن پر گیت لکھ دیتا تھا۔گیت بھی ایسا جو غزل سے بھی زیادہ خوبصورت ہوتا تھا۔ساحر لدھیانوی کی طرح شکیل نے اپنے فن کے ساتھ کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔اُس نے جو بھی گیت لکھا وہ معیار کی کسوٹی پر کھرا اُترتا ہے۔اس میں شک نہیں کہ وہ سیدھے سادے الفاظ میں گیت کو ایسے تراشتا تھا جو سننے والے کا من موہ لیتا تھا۔شکیل کا کوئی بھی گانا ایسا نہیں جسے غیر معیاری کہا جائے۔

شکیل نے نوشاد کو چھوڑ کے باقی موسیقاروں کے ساتھ 1960 تک کوئی کام نہیں کیا۔جب گورودت نے ''چودھویں کا چاند'' بنانے کا فیصلہ کیا تو اُس نے اس کے لئے روی شرما کو سنگیت کی ذمہ داری سونپی۔روی نے شکیل بدایونی کو اس فلم کے گیت لکھنے کے لئے مدعو کیا۔یہ پہلا موقع تھا جب شکیل کسی دوسرے موسیقار کے ساتھ کام کرنے جارہا تھا۔وہ کافی گھبرایا ہوا تھا۔اُس نے روی سے کہا۔ بھائی مجھے سنبھالنا۔میں نے نوشاد صاحب کے سوا اب تک کسی اور کے ساتھ کام نہیں کیا ہے۔روی نے شکیل کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا کہ آپ فکر مت کیجئے۔آج سے آپ میرے گیت کار ہوئے۔روی نے شکیل سے کہا کہ پہلے چودھویں کا چاند کا ٹائٹل سانگ لکھا جائے۔روی نے اُسے پہلا مصرعہ کچھ اس طرح سنایا۔چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو۔اُس نے شکیل سے کہا آگے کیا تو شکیل نے فوراً دوسرا مصرعہ جوڑ لیا۔جو بھی ہو تم خدا کی قسم لاجواب ہو۔بس پھر کیا تھا۔ایک سے ایک گانا شکیل کے قلم سے نکلتا چلا گیا۔بدلے بدلے میرے سرکار نظر آتے ہیں۔گھر کی بربادی کے آثار نظر آتے ہیں۔میرا یار بنا ہے دلہا۔فلم نے ملک بھر میں دھوم مچادی۔چودھویں کے چاند کے ٹائٹل سانگ لکھنے والے شاعر شکیل بدایونی کو 1961 کے فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔اسی گانے پر حضرت ناطق گلہاٹی نے شکیل کے اس گانے کے پہلے مصرعے کو بے وزن قرار دیا تھا۔میاں ناطق شاید یہ بھول گئے تھے کہ فلمی شاعری میں گیت پر دھن نہیں بنائی جاتی بلکہ دھن پر گیت لکھا جاتا ہے۔کیفی اعظمی مرحوم نے فلمی شاعری کا تجزیہ کچھ اس طرح کیا تھا کہ یہاں پہلے تابوت بنایا جاتا ہے اُس کے بعد اس میں مردہ ڈالا جاتا ہے۔کبھی تابوت چھوٹا پڑ جاتا ہے تو مردے کو ٹھونک پیٹ کے اس تابوت میں ڈال دیا جاتا ہے ۔فلمی شاعری میں بھی اسی طرح کا فارمولہ استعمال کیا جاتا ہے ۔ہمارے پرانے فلمی شاعروں نے اس طرح کی مشکل کے باوجود اپنی شاعری کا معیار بلند رکھا۔وہ چاہے ساحر لدھیانوی ہو، راجندر کشن ہو، شکیل بدایونی ہو، یا کیفی اعظمی ہو۔شکیل تو اس طرح کی شاعری میں اس طرح ماہر ہو گیا تھا کہ جو بھی گانا ہو وہ لاجواب ہوتا تھا۔''چودھویں کا چاند'' کے بعد شکیل اور روی کے درمیان ایسی ہم آہنگی پیدا ہوئی کہ اُنہوں نے مل کر سات فلمیں کیں ۔''گھرانہ'' ''گھونگھٹ''، ''گرہستی''، ''نرتکی''، ''پھول اور پتھر'' اور ''دو بدن''۔ان سبھی فلموں کا سنگیت بیحد کامیاب رہا۔حسن والے تیرا جواب نہیں ۔''گھرانہ'' کا یہ خوبصورت گیت شکیل کے زورِ قلم کا ہی نتیجہ تھا۔

ہیمنت کمار تیسرا موسیقار تھا جو شکیل کی شاعری کا مداح تھا۔ہیمنت کمار نے بھی شکیل کے ساتھ تین فلمیں کیں۔''بیس سال بعد''، ''صاحب بی بی اور غلام'' اور ''بن بادل برسات''۔''صاحب بی بی اور غلام'' گورودت کی صدا بہار کلاسک جس کے دو گانے مینا کماری پر فلمائے گئے ۔نہ جاؤ سیّاں چھڑا کے بہیاں، قسم تمہاری میں رو پڑوں گی اور دوسرا چلے آؤ کوئی دور سے آواز دے ایسے بے مثال گانے ہیں جو ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔اسی طرح ایس ڈی برمن نے شکیل کے ساتھ دو فلمیں کیں ۔''کیسے کہوں'' اور ''بے نظیر''۔سی رام چندر نے شکیل کے ساتھ دو فلمیں کیں ۔''زندگی اور موت''، ''وہاں کے لوگ'' اور روشن نے دو فلمیں کیں۔''بے داغ'' اور ''نور جہاں''۔

محمد رفیع، نوشاد علی اور شکیل بدایونی بڑے گہرے دوست تھے۔ہفتے عشرے میں کسی نہ کسی کے یہاں بریانی کی پارٹی ہوتی تھی۔ایک دن شکیل کے گھر ایک فون آیا۔فون شکیل کی والدہ نے اُٹھایا۔جب شکیل باہر سے آگئے تو والدہ نے کہا کہ موسیقار روی صاحب کا فون آیا تھا۔اُس نے تمہیں گھر پر بریانی کی دعوت دی ہے۔شکیل روی کے گھر پر پہنچا تو روی شکیل کو دیکھ کے حیران رہ گیا۔اُس نے شکیل سے اس طرح اچانک آنے کا سبب پوچھا تو شکیل نے کہا کہ آپ نے گھر پر فون کیا تھا تو روی نے کہا، نہیں میں نے کوئی فون نہیں کیا۔شکیل شرمندہ ہو کر رہ گئے ۔اُس نے روی سے کہا کہ شاید والدہ کو کچھ مغالطہ ہوا ہوگا۔روی نے کہا کہیں ایسا تو نہیں کہ اماں نے رفیع صاحب کی جگہ روی صاحب سمجھ لیا ہو۔شکیل نے روی کے بات کی تائید کی اور وہ دونوں رفیع صاحب کے گھر پہنچے۔دعوت واقعی

رفیع صاحب نے دی تھی۔اماں رفیع صاحب کو روی صاحب سمجھ بیٹھی۔

شکیل کو بیڈمنٹن بڑا پسند تھا۔اس کے علاوہ پتنگ بازی میں بھی وہ کافی شوق رکھتا تھا۔پتنگ بازی میں اُس کے ساتھی محمد رفیع اور نوشاد ہوا کرتے تھے۔کبھی کبھی جانی واکر بھی اُن کے ساتھ شمولیت کرتا تھا۔شکیل کے انڈسٹری میں کئی گہرے دوست تھے جن میں دلیپ کمار،لیکھک وجاہت مرزا،خمار بارہ بنکی اور اعظم باد پوری قابل ذکر ہیں۔اس کے علاوہ شکیل کے جو بہت عزیز دوست تھے،اُن میں نوشاد کے علاوہ موسیقار روی اور نوشاد کا اسسٹنٹ غلام محمد جس کے ساتھ اُسکی دوستی زندگی کے آخری لمحے تک رہی۔

شکیل بدایونی زیابیطیس کے مرض کے ساتھ ٹی بی کے مرض میں بھی مبتلا تھا۔جب اُسے پنچ گنی کے ایک سنٹوریم میں بھرتی کیا گیا،تب اُس کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔نوشاد نے ایک دوست کا فرض نبھایا۔وہ اُس کے پاس تین فلموں کی پیش کش لے کے گیا اور اُسے دس گنا معاوضہ ادا کیا۔شکیل نے وہیں بیٹھ کر وہ گانے لکھے۔ٹی بی سے تو وہ ٹھیک ہو گیا مگر ذیابطیس نے پیچھا نہیں چھوڑا۔اپریل 1970 میں وہ کافی بیمار ہوا تو اُسے بمبئی ہاسپٹل میں بھرتی کرانا پڑا۔اس بار وہ موت کو شکست نہیں دے سکا۔20 اپریل 1970 کو ترپن سال کی عمر میں اس جہان فانی کو الوداع کہہ کے چلا گیا اور پیچھے بیوہ دو بیٹے اور دو بیٹیاں چھوڑ کے چلا گیا۔اُسکی موت کے چند مہینے بعد اُس کی ایک بیٹی نجمہ جو کہ کالج میں پڑھتی تھی کا بھی انتقال ہوا۔

شکیل فلمی شاعری کی وجہ سے ہی مشہور نہیں تھا۔وہ جانا مانا غزل گو شاعر بھی تھا۔اُس نے کئی ساری غزلیں لکھیں۔اُس کی غزلیں بیگم اختر اور طلعت محمود نے گائیں۔اُردو کے مہان شاعر فراق گورکھپوری نے شکیل کو شاعر فطرت کا خطاب دیا تھا۔اُس کا ماننا تھا کہ شکیل کی شاعری میں الفاظ کی جگل بندی نہیں ہوتی بلکہ اُس کی شاعری میں اُس کی زندگی کا عکس ملتا ہے۔علی سردار جعفری کا ماننا تھا کہ شکیل کی غزلیں دل کو چھو لیتی ہیں۔ساحر کا کہنا تھا کہ جگر اور فراق کے بعد شکیل واحد شاعر ہے جس نے غزل کی آبرو برقرار رکھی۔اُس نے غزل گوئی میں اپنی تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لائیں اور غزل میں نت نئے تجربے کر کے اسے زیادہ مقبول بنا دیا۔شکیل کی غزلوں کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ بیگم اختر ریڈیو یا ٹی وی پر شکیل کی یہ غزلیں بار بار گایا کرتی تھیں۔میرے ہم نفس میرے ہمنوا اور اے محبت تیرے انجام پہ رونا آیا۔اسی طرح طلعت محمود شکیل کی یہ غزلیں ہر کنسرٹ میں گایا کرتا تھا۔ہنگامہ غم سے تنگ آ کر.....اور غم عاشقی سے کہہ دو.....۔

طلعت محمود نے شکیل کو خراج تحسین ان الفاظ کے ساتھ پیش کیا۔

آنکھوں سے دور صبح کا تارا چلا گیا
نیند آ گئی تو غم کا نظارہ چلا گیا
جلوہ کہاں جو ذوق تماشہ نہیں شکیل
نظریں چلی گئیں تو نظارہ چلا گیا

شکیل نے نواسی فلموں کے گانے لکھے۔اس کے علاوہ اُس نے کئی ساری غزلیں لکھیں جنہیں بیگم اختر کے علاوہ پنکج اُداس نے گایا۔شکیل ہمہ جہت فن کار تھا۔اُس نے فلمی اُفق پر اپنے گیتوں کی جو کہکشاں سجا کے رکھی وہ تب تک فروزاں رہے گی جب تک یہ دنیا ہے۔ہند سرکار نے شکیل کو گیت کار اعظم کے خطاب سے نوازا۔شکیل کی موت پر اُسی کی فلم ''اُڑن کھٹولہ'' کا یہ گانا یاد آ رہا ہے۔

چلے آج تم جہاں سے ہوئی زندگی پرائی
تمہیں مل گیا ٹھکانہ ہمیں موت بھی نہ آئی۔
اودور کے مسافر ہم کو بھی ساتھ لے لے رے،
ہم رہ گئے اکیلے۔
تو نے وہ دے دیا غم بے موت مر گئے ہم
دل اُٹھ گیا جہاں سے لے چل ہمیں یہاں سے
اودور کے مسافر ہم کو بھی ساتھ لے لے رے،
ہم رہ گئے اکیلے۔

☆

- بقیہ -

سادگی وتہہ داری کی ایک مثال

یہ کہانی تضادات سے بنی گئی ایک اچھی کہانی ہے۔ایک تضاد تو یہ ہے کہ گھر والوں کو اپنے گئے وقتوں کی شان وشوکت اتنی عزیز ہے کہ اس کے لیے کسی ایرے غیرے کا رشتہ منظور نہیں ہے۔دوسرا تضاد یہ ہے کہ وہی گھر والے حنا کو کتاب پڑھتا دیکھ کر مذاق اڑاتے ہیں کی بھلا انٹرنیٹ کے زمانے میں بھی کوئی کتابوں میں سر کھپاتا ہے،تیسرا تضاد یہ ہے کہ حنا کی بھابھیاں حنا سے اس لیے پرخاش رکھتی ہیں کہ اگر اس نے دو چار عشق کیے ہوتے تو آج وہ اپنے کنوارے پن کے عذاب کے ساتھ تنہا جینے پر مجبور نہیں ہوتی۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر ذاکر فیضی اگر اپنی کہانیوں کی بنت پر اسی طرح توجہ کرتے رہیں گے تو بہت جلد اچھے کہانی کار کے طور پر پہچان بنا لیں گے۔

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار (راولپنڈی)

برادرم گلزار جاوید، السلام علیکم!

آپ بہت اہتمام سے پرچہ مرتب کرتے ہیں۔ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ اس بار آپ نے ہمیں اس توجہ اور عنایت کا مستحق گردانا کہ خصوصی گوشہ ہمارے لیے ترتیب دیا۔ آپ کی نوازش اور محبت ہے۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ اس گوشے کی ترتیب میں بھی خاص اہتمام صاف طور سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ مضامین اور ان کے ساتھ ہماری غزلیں، نظمیں، افسانہ اور مضمون، اور پھر ان سب کو پیش کرنے کا قرینہ اور حسن بلاشبہ لائقِ ستائش ہے۔ خدا کرے آپ کی یہ مساعی آپ کے قارئین کے لیے بھی پسندیدہ ہوں۔ اپنے عہد میں کام کرنے والوں کی تحسین کا یہ طریقہ بلاشبہ قابلِ قدر اور قابلِ داد ہے۔

مبین مرزا (کراچی)

میرے گلزار، خوش رہو۔

زندگی کا بیشتر حصّہ دہلی میں گزارنے کے سبب حالت زار بیان کرنے کے لیے ہندوستان کے آخری فرماں روا بہادر شاہ ظفر کی مدد کا طلب گار ہوں:

لگتا نہیں ہے دل مرا اجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالم ناپائیدار میں

گزشتہ دنوں کی بات ہے عزیزہ پروین شیر مزاج پُرسی کے لیے غریب خانہ پر تشریف لائیں تو اہلِ خانہ کے رُوبرو میں نے عرض کیا کہ مجھے دو چیزوں نے زندہ رکھا ہوا ہے ''اوّل گلزار جاوید دوئم چہارسُو'' میرے عزیز عمر کے ترانوے برس میں داخل ہوگیا ہوں اور جس تیزی سے جسمانی قویٰ بے وفائی بلکہ بے مروّتی پر آمادہ ہیں اُس کی روشنی میں گلزار جاوید اور چہارسو زیادہ کامگار نظر نہیں آتے۔ یہی سبب سابقہ شمارے سے غیر حاضری کا بنا حالانکہ میرے محبّی اور مہربان مہندر پرتاپ چاند کی جدائی سے دل و دماغ بُری طرح متاثر ہوئے مگر کوشش کے باوجود اُن کے شایانِ نشان خراج عقیدت بھی پیش نہ کرسکا۔

چہارسو کے توسط اور تمہاری مساعی کے طفیل ایسے ایسے انمول نگینوں سے تعارف نصیب ہوا کہ جس پر دل جھوم جھوم جاتا ہے۔ مبین مرزا مغل خاندان کے چشم و چراغ اور دہلی کے پسِ منظر کے بہت ہی انمول شخصیت کے مالک ہیں۔ کیا نثر، کیا نظم اور کیا تہذیب و تمدن ہر چیز میں انفرادیت نظر آتی ہے۔

شمارے کے دیگر مشمولات کی بابت بھی بہت کچھ کہنے کو جی چاہتا ہے مگر ہمت جواب دے گئی ہے۔ چہارسو اور لکھنے والوں کے علاوہ قارئینِ چہارسو کے لیے بھی بے شمار دعائیں اور نیک تمنائیں۔

یوگیندر پال تشنہ (یو۔ایس۔اے)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم!

مبین مرزا میرے بہت عزیز اور پرانے دوست ہیں۔ آپ کے پرچے میں ان کا خاص نمبر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ آپ نے بہت سلیقے سے یہ ساری چیزیں ترتیب دی ہیں۔ میرا ایک مضمون بھی ان میں شامل ہے۔ اس کی اشاعت پر آپ کا شکریہ، مبین مرزا کے بارے میں شائع ہونے والے سارے مضامین بہت اچھے ہیں۔ یہ ایک بھرپور نمبر بن گیا ہے۔ مبین مرزا اس عہد کے ایک بہت اہم، ادیب، افسانہ نگار، شاعر اور نقاد ہیں۔ میری تو یہ رائے ہے کہ اس وقت ہمارے ہاں جو چند ایک لوگ بہت اچھی اردو نثر لکھ رہے ہیں ان میں مبین مرزا شامل ہیں۔ ان کا کام ہر طرح قابلِ توجہ اور قابلِ داد ہے۔ ان کی خدمات کا اعتراف کیا جانا چاہیے۔ آپ کے رسالے میں اپنے عہد کے ایک اہم ادیب کی پذیرائی یقیناً قابلِ داد ہے اور یہ نمبر ایک اہم حوالے کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ اس میں مبین مرزا کی شخصیت کے سارے پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے جو امید ہے اور لوگوں کو بھی کام کی طرف مائل کرے گا۔ میں آپ کی مزید کامیابیوں کے لیے دعا گو ہوں۔

سلیم یزدانی (کراچی)

گلزار صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو کا مبین مرزا نمبر دیکھا۔ بہت اعلیٰ! مبین مرزا سے میری صرف ایک ملاقات ہوئی ہے مگر اس کی خوشگوار یادیں ذہن میں اب بھی تازہ ہیں۔ گئے دنوں کی بات ہے۔ سعودی عرب میں ملازمت ختم ہونے کے بعد میں کراچی واپس آ گیا تھا۔ اسی سال میری پہلی کتاب ''جلاوطن کہانیاں'' شایع ہوئی تھی۔ میں انہیں کتاب دینے ان کے دفتر سمن آباد (فیڈرل بی ایریا) گیا۔ بہت محبت سے پیش آئے۔ بہت دیر تک ہم باتیں کرتے رہے۔ اس ملاقات کے چند دنوں بعد ہی میں دوبارہ جدہ چلا گیا۔ انہوں نے ''مکالمہ'' میں میری کتاب پر بہت اچھا تبصرہ شائع کیا۔ مبین مرزا ہمہ جہت فنکار ہیں۔ افسانہ نگار، شاعر، نقاد اور مبصر۔ وہ بڑے سے بڑا کام بہت آسانی سے کر جاتے۔ یہ شعر گویا انہوں نے اپنے ہی بارے میں کہا ہے:

یہ کام اس کے لئے جیسے مسئلہ ہی نہ تھا
وہ پر سکون تھا کار محال کرتے ہوئے

ان کا افسانہ "والٹس ایپ" پڑھ کر بہت لطف آیا۔ آخر میں انہوں نے چونکا دیا۔ مبین مرزا صاحب کی خدمت میں چہارسو کے توسط سے سلام عرض ہے۔ ایسا اچھا شمارہ نکالنے پر آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

جمیل عثمان (امریکہ)

جناب گلزار جاوید، السلام علیکم۔

''چہارسو'' میں اس بار مبین مرزا کا خاص گوشہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ایک جینوئن تخلیق کار کو اس کی زندگی میں اعزاز پیش کرنے کی جو روایت آپ کے پرچے نے قائم کی ہے، وہ قابلِ تعریف ہے۔ مبین مرزا نے شاعری بھی کی ہے، افسانے اور تنقید کے شعبوں میں بھی انھوں نے بہت کام کیا ہے۔ وہ ایک ذہین اور قابل تخلیق کار ہیں۔ پچھلی صدی میں اسّی کی دہائی کے جن تخلیق کاروں نے ادب

میں نمایاں مقام حاصل کیا، ان میں مبین مرزا ایک بہت اہم نام ہے۔ وہ ایک نظریاتی تخلیق کار ہیں۔اس کا اعتراف انظار حسین، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر انوار احمد اور رضی مجتبیٰ جیسے نمائندہ لوگ بھی کرتے ہیں۔ اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا تو میں بھی اس شمارے میں اپنا حصہ ضرور ڈالتا۔ بہرحال آپ کا یہ خصوصی شمارہ ایک یادگار کے طور پر دیکھا جائے گا اور آئندہ کام کرنے والوں کو بھی اس سے تحریک ملے گی۔

صبا اکرام (کراچی)

میرے بھائی گلزار، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارا تسکین قلب و جاں ہوا۔ اب اس کے رنگا رنگ صفحات بھی دل کو لبھاتے ہیں۔ اس دفعہ قرعہ فال محترم مبین مرزا صاحب کے نام نکلا۔ نہ صرف میں بلکہ مجھے یقین ہے کہ آج اردو ادب کا ہر قاری ان کے نام سے بخوبی واقف ہے۔ یہ آپکا کمال ہے کہ آپ ہمیشہ ایسے قلمکاروں کا انتخاب کرتے ہیں جو حقیقت میں اردو ادب کا روشن ستارہ کہلانے کے مستحق ہیں۔ یہ میری عین خوش قسمتی ہے کہ میں ان سے ایک آدھ بار ہمکلام ہو چکا ہوں اور میرے ذہن پر یہ بات اعزاز کے ساتھ نقش ہے (جس میں انکی فیاضی اور خوش اخلاقی کا عمل دخل ہے کہ جب میں نے فون پر ان سے اپنا تعرف کروانے کی کوشش کی تو انہوں نے نہایت محبت سے کہا کہ وہ میرے نام سے واقف ہیں۔ اس کے علاوہ میں انکا ممنون ہوں اور انکا یہ احسان ہے کہ انہوں نے مکالمہ کے ایک شمارے میں میرا افسانہ بھی شامل کیا تھا۔

مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ اس وقت اردو قلمکاروں (مجھے لفظ لکھاری بیحد ناپسند ہے) کی صف اول میں شامل ہیں۔ شمارے میں عطیہ سکندر نے ''قلب دروں'' کے عنوان سے جوانکے اور مشاہیر کے درمیان مراسلت کا انتخاب کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اشفاق احمد، وزیر آغا، شمس الرحمٰن فاروقی اور دیگر مصنفین سے انکے کتنے گہرے روابط ہیں۔ اس میں عرش صدیقی کے خط نے مجھے بیحد متاثر کیا کیونکہ یہ تو میری اپنی ہی داستان لگتی ہے۔ تعلیم کے زمانے میں انکے مالی حالات اور انکی جدوجہد اور پھر موجودہ کامیابی و ترقی سے مجھے اپنی زندگی کا وہ دور یاد آ گیا جب میں انہی حالات سے گذر رہا تھا۔ بیشک اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو رائیگاں نہیں جانے دیتا۔ انہیں کے خط میں لفظ ''رکابی'' کا استعمال دلچسپ لگا کیونکہ میرے ابا جو مراد آباد، آگرہ اور امروہہ کی پیداوار تھے وہ بھی پلیٹ کو رکابی ہی کہتے تھے۔

آپکا ''براہ راست'' بہت طویل، عمیق اور ہمیشہ کی طرح بہت چبھتا ہوا تھا مگر مرزا صاحب نے انکے جواب بھی خوب خوب دئے۔ جہاں تک ادب میں انکے مرتبے کے تعین کا سوال ہے تو ان پر لکھے گئے مضامین پڑھ کر، جن میں پروفیسر فتح محمد ملک، سحر انصاری، سلیم یزدانی، تحسین فراقی اور سلیم آغا قزلباش شامل ہیں، مزید کسی بحث کی گنجائش نہیں رہتی۔ سلیم یزدانی صاحب کا مضمون مجھے دلچسپ لگا کہ اس میں بہت اپنائیت تھی، انکا انداز یعنی پہلا درویش، دوسرا درویش وغیرہ وغیرہ دلچسپی کا باعث تھا۔ ''موج رواں'' کے تحت فاری شانے انکی شاعری کا انتخاب کیا ہے طوالت کے ڈر سے میں اس پر مزید تبصرہ نہیں کرونگا مگر انکی شاعری دل کے اندرونی احساسات کا احاطہ کرتی ہے۔

افسانے اگرچہ سب ہی اچھے اور قابل ذکر ہیں مگر مجھے جس افسانے نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ صاحب قرطاس مبین مرزا کا افسانہ والس ایپ ہے۔ بہت روانی، اسکے ساتھ تجسس اور اسکا پلاٹ اور پھر اسکا انجام سب ہی قاری کو گرفت میں لے لیتے ہیں، شمع خالد کا ''انعوا'' بھی اچھا تھا مگر پلاٹ پرانا تھا کہ اولاد کبھی بھی والدین کا حق ادا نہیں کر سکتی بالکہ آخیر تک ان سے فائدہ اٹھاتی ہے، پھر بھی تحریر جاندار تھی۔ جعفری صاحب کا گئو رکشک موجودہ ہندوستان میں ہندو قدامت پرستوں کی تصویر کشی ان کانگریسی مسلمانوں کے لئے لمحہ فکریہ ہے جو پاکستان کے خلاف تھے۔

چہارسو میں سفرنامہ اور تراجم کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا ہے جو بہت قابل تعریف ہے۔ یعقوب نظامی کا سفرنامہ دلچسپ ہے، اس میں بھی ہم پاکستانیوں کے لئے سبق ہے کہ وہ ممالک جو ہم سے نہ صرف پیچھے تھے بلکہ جنگ کی تباہ کاریوں کا شکار تھے وہ بھی ہم سے آگے نکل گئے ہیں۔۔ شاعری میں نوید سروش، نسیم سحر، سبھاش گپتا شفیق، اور ڈاکٹر ریاض قابل توجہ ہیں۔ اس دفعہ عبدا لحمید عدم اور مجاز لکھنوی بھی شامل ہیں۔ آپ یہ اچھی روایت ڈال رہے ہیں کہ ہر شمارے میں ایسے مشہور شعرا کا مختصر کلام شامل ہونا چاہئے۔

ظفر قریشی کے ترجمے چہارسو کے لئے اچھا اضافہ ہیں۔ ثریا پر مضمون معلومات سے پر ہے مگر ہندوپاک کی فلمی تاریخ میرا بھی مضمون ہے اس لئے میرے لئے یہ معلومات نئی نہیں تھیں، ثریا کی نانی نے ثریا کو سونے کی چڑیا سمجھتے ہوئے اسکے پر کاٹ دیئے اور اسکے دل کی تمنا دل ہی میں رہ گئی۔ اسکی کبھی شادی نہیں ہوئی اور دیو آنند نے ہر مرد کی طرح کلپنا کارتک کے ساتھ خوش باش زندگی گزار دی۔

فیروز عالم (کیلی فورنیا)

مکرمی گلزار جاوید، آداب۔

''چہارسو'' کا مبین مرزا صاحب کے حوالے سے خصوصی شمارہ ملا۔ سب سے پہلے تو مبارک باد قبول کیجیے کہ ایسے زمانے میں جب زندگی کے معمولات متاثر ہیں اور کام نارمل طریقے سے نہیں ہو رہے آپ نے نہ صرف اپنا کام جاری رکھا، بلکہ اپنے معیار کو برقرار رکھتے ہوئے پرچہ اسی آب و تاب سے شائع کیا جو آپ کی روایت رہی ہے۔ اس بار پرچے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں ہمارے عہد کی ایک ممتاز و معروف شخصیت کو اعزاز پیش کیا گیا ہے۔ مبین مرزا صاحب اس عہد کے ہمہ جہت لوگوں میں ہیں اور ان کی ادبی خدمات کا اعتراف بھی بجا طور پر کیا گیا ہے۔ آپ نے اپنے رسالے میں بہت بھرپور گوشہ ان کے بارے میں شامل کیا ہے۔ سارے ہی مضامین بہت عمدہ ہیں۔ اس کے علاوہ مرزا صاحب کی غزلیں، نظمیں اور نثری نگارشات کا انتخاب بھی بہت اعلیٰ ہے۔ یہ گوشہ ہر طرح شان دار اور یادگار ہے۔ اس میں ہمارا بھی ایک مضمون شامل ہے۔ اس کی اشاعت کے لیے آپ کا شکریہ۔ ایک بار پھر مبارک باد۔

عنبریں حسیب عنبر (کراچی)

بھائی گلزار جاوید صاحب، سلام۔

چہارسو ۲۰۲۱ء کا برقی شمارہ پیشِ نظر ہے۔ اس شمارے میں قرطاس اعزاز کے گوشے میں مبین مرزا براجمان ہیں۔ آپ کا خطوط اساسی مصاحبہ اس مزاج کا ہوتا ہے جیسے سچ مچ رو در روبات چیت ہو رہی ہو۔ مصاحبہ قدرے طویل ہو گیا ہے لیکن آپ دونوں نے معاصر ادب اور ادب کو چھان پھٹک کر رکھ دیا ہے۔ پڑھنے میں دلچسپی بھی رہی۔ گوشے میں شامل تحریری مواد پر بات کروں تو اچھا خاصا مقالہ مرتب ہو جائے گا۔ ڈاکٹر عنبرین حسیب عنبر کا تحریر کیا ہوا مبین مرزا کا خاکہ ''مبین مرزا بطور شخصیت'' ایسی تحریر نہیں ہے جس سے سرسری گزرا جا سکے۔ یہ ایک انتہائی اعلیٰ معیار کا خاکہ ہونے کے علاوہ اپنے آپ کو پڑھوانے کی صفت سے معمور ہے۔ گوشے کے علاوہ ''شمس حیران ہے'' کے تحت جناب افتخار عارف کی غزل۔۔۔ دل میں چبھ گئی۔ مبین مرزا کی غزلوں نے بھی بہت متاثر کیا۔ وہ سچی شاعری کرتے ہیں۔

ہوا کرتے تھے ہم اپنے لئے بھی
مگر اب تو زمانے کے لئے ہیں

کچھ بھی اس سے پوچھنے کہنے کی مہلت ہی نہ تھی
اس ادا سے اس نے محوِ گفتگو رکھا ہمیں

پوشیدہ نہیں مجھ سے یہ دنیا کی حقیقت
باہر سے میرے ساتھ ہے، اندر سے الگ ہے

کبھی خدا کبھی خود سے سوال کرتے ہوئے
میں جی رہا ہوں مسلسل ملال کرتے ہوئے

مزید پسندیدہ اشعار لکھے نہیں جا رہے۔ اجازت چاہتا ہوں۔ آپ کا یہ شمارہ اچھا ہی اچھا ہے لیکن اس میں ایک عیب۔۔۔ برقی ہونا ہے۔

عبداللہ جاوید (کینیڈا)

گلزار جاوید صاحب، السلام وعلیکم۔

اس مرتبہ قرطاس اعزاز جناب مبین مرزا کے حصے میں آیا ہے جن سے ہمارے دیرینہ مراسم ہیں۔ اس سبب سے میں نے ''براہِ راست'' میں آپ کے سوالات اور ان کے جوابات دونوں میں قدرتی طور ذاتی نوعیت کی دلچسپی لی۔ سوالات اور جوابات دونوں میں ایسا بے ساختہ انداز ہے کہ پڑھ کر حیرانی ہوئی۔ باتیں عالمانہ لیکن پیرایۂ گفتگو نہایت شگفتہ۔ ڈاکٹر عنبرین حسیب عنبر کا تحریر کردہ خاکہ ''مبین مرزا صاحب بطور شخصیت'' لائقِ تحسین ہے۔ مرزا صاحب کی شخصیت پرت پرت سامنے آتی جاتی ہے۔ مرزا صاحب کی شاعری سے تھوڑی بہت واقفیت تو تھی ہی آپ کے پرچے میں ان کے منتخب اشعار پڑھنے کو ملے۔ ان کی شاعری میں ''آورد'' کا نام و نشان نہیں ملتا اور زبان انتہائی سادہ۔ عبداللہ جاوید اور مجھ کو، بلکہ جاوید کی کتاب ''دی جوک'' کو بھی آپ نے چہارسو کی محفل میں شامل کیا بہت شکریہ۔ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے باقی رسالہ آہستہ آہستہ پڑھوں گی۔

شہناز خانم عابدی (کینیڈا)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ اپنی باوقار ادبی روایت کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ مبین مرزا ہمارے عہد کے اہم شاعر، افسانہ نگار، ناول نویس، نقاد، مترجم اور مدیر کی حیثیت سے اردو دنیا میں پہچانے جاتے ہیں۔ وہ مہذب، پڑھے لکھے فعال ادبی شخصیت ہیں۔ آپ بھی کیسے کیسے چنیدہ لوگوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ ''براہِ راست'' آپ کے اہم اور مشکل سوالات کے جوابات صاف گوئی اور اپنے مطالعے اور مشاہدے کے پس منظر میں دیے ہیں مگر خاندانی پس منظر کے متعلق بتانے میں ذرا کنجوسی سے کام لیا۔ آپ کے ترقی پسند افسانہ نگاری کے خلاف علامتی اور تجریدی افسانہ نگاروں کے ردِعمل کے سوال میں مبین مرزا نے حقیقت پسندی سے جواب دیا ہے۔ اُن کا یہ بیانیہ بھی ایک اہم، باخبر اور حساس تخلیق کار ہی کا ہو سکتا ہے۔

''اس وقت دنیا کی تمام مقتدر اقوام کا ایک ایجنڈا ہے اور وہ یہ کہ کم زور ممالک کے وسائل پر قبضہ جمایا جائے اور ان کے عوام کو ایک صارف معاشرہ بنا کر اس طرح مطیع کر دیا جائے کہ اس کے بعد وہ ایک نہ ختم ہونے والی نادیدہ غلامی میں رہیں۔۔۔'' (ص:۱۵)

مبین مرزا کی شخصیت پر ڈاکٹر عنبرین حسیب عنبر کا مضمون مبین مرزا کی وہ خوبیاں سامنے لاتا ہے جو اکثر عام اور اہم لوگوں کو معلوم نہیں ہوتی۔ سلیم یزدانی کا خاکہ پہلا درویش دلچسپ ہے تحریر میں زبردست روانی ہے۔ پروفیسر سحر انصاری نے مبین مرزا کی غزلیہ اور نظمیہ شاعری کا تجزیہ حقائق اور دلائل کے ساتھ کیا ہے۔ علی احمد فاطمی، تحسین فراقی اور پروفیسر فتح محمد ملک کی تحریریں اور ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کا ''زمینیں اور زمانے'' پر زبردست مضمون ہے۔ عطیہ سکندر علی نے قلبِ دروں کے عنوان سے مبین مرزا کے نام نامور شخصیات کے اہم خط سلیقے سے مرتب کیے ہیں۔ ''موجِ رواں'' میں فاری شانے کیا زبردست غزلوں کا انتخاب کیا ہے۔ تعریف تو بنتی ہے۔ ''احساس کی رنجشیں'' کے عنوان سے نظمیہ کلام کو منتخب محمد انعام الحق نے خوب کیا ہے۔ سرورق اور پس ورق کی خوب صورتی کے لیے شعیب حیدر داد کے مستحق ہیں۔

محترمہ پروین شیر کی عظیم مصور کلاؤڈ آسکر مونے پر تحریر معلوماتی اور دلچسپ ہے۔ محترمہ کی مناظرِ فطرت سے گہری انسیت کے سبب اُن کی اکثر تحریریں سرسبز ہو جاتی ہیں بہت خوب۔ دیپک کنول نے اس بار معروف و خوبصورت ادارہ وگلوکارہ ثریا کی کامیابیاں، داستانِ عشق، محبت میں ناکامی، خونی رشتوں کی بے حسی اور تنہائی، اختتام موت کی کہانی سنائی ہے۔ رہے نام اللہ کا۔

قیصر نجفی کی حمد میں عقیدت کے پھول کھلے ہیں۔

حمد گوئی شعار کرتا ہے
حرف کو باوقار کرتا ہے

''چہارسُو''

(قیصر نجفی)

انجم جاوید کی نعت منفرد اور عشقِ نبیؐ سے سرشار ہے۔

منزلوں کا نشاں، راستوں کا بھرم
اُن کا نقشِ قدم، اُن کا نقشِ قدم
ذکر ہو آپ کا، ذکر ہو آپ کا
ذکر ہو آپ کا اور نکل جائے دم

(انجم جاوید)

افتخار عارف، عبداللہ جاوید، نسیم سحر، ڈاکٹر ریاض احمد، مراق مرزا، نسیم عزیزی، وشال کھلّر، سیفی سرونجی، جہانگیر اشرف، تصور اقبال، نزہت شاہ کی غزلوں کے اکثر اشعار اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ فیصل عظیم کی نظم ''اذیت کی انتہا''، نصیر احمد ناصر کی نظم ''اجلی روحیں'' اور محترمہ پروین شیر کی نظم ''ماندگی'' حقیقت کے قریب اور پراثر ہیں۔ شاید میری غلطی ہو میری نظم کا نام ''صدائے حسرت'' ہے ''آ'' کا اضافہ زائد ہے نظم کا دوسرا مصرع یوں ہے ''ایک پیڑ تنہا سا'' ہے۔ رس رابطے میں نسیم سحر، ڈاکٹر فیروز عالم، تابش خانزادہ، رینو بہل، فرح کامران اور فیصل عظیم کے خط تنقیدی بصیرت کا نمونہ ہیں۔ شمع خالد کا افسانہ ''انعوا'' نصرت بخاری ''تندور والے کی کہانی'' اور رعنا کوثر کا افسانہ ''شجرِ تنہا'' ہی پڑھ سکا ہوں۔ ان کہانیوں کی بنت اچھی ہے۔

نوید سروش (میر پور خاص)

محترم گلزار جاوید صاحب، سلام اور احترام۔

اس شمارے میں مبین مرزا صاحب کا انٹرویو بہت اچھا تھا۔ اس میں یوں تو دعوتِ فکر کے لیے بہت کچھ تھا مگر جو چیز سب سے زیادہ قابلِ توجہ رہی وہ اس دور کی مادّیت پرستی اور صارف معاشرے کا ذکر تھا جواب کوشش سے بہت آگے جا کر حقیقت بن چکا ہے اور ہم سب اس کے شکنجے میں آ چکے ہیں بلکہ اس طرح آ چکے ہیں کہ اس سے بچنے کے لیے اب اپنی کھال کھینچے بغیر کچھ نہیں ہوگا۔ مبین مرزا صاحب کا منتخب کلام پڑھ کر تو لطف آیا اور مضامین سے ان کی دلچسپ شخصیت کے کئی پہلوؤں سے شناسائی بھی ہوئی مگر ان کا افسانہ بہت خوب تھا جو بہت آخر میں کہیں جا کر کھلا اور یوں پڑھتے ہوئے ذہن پر اس کی مضبوط گرفت کا احساس ہوا۔ حمد اور نعت میں آپ نے چونکا دیا کہ انجم جاوید صاحب لاہوری ہو گئے اور قیصر نجفی صاحب بھارتی۔ یقیناً کاتب کا کام ہوگا کہ ''جو چاہے کاتبِ حسنِ کرشمہ ساز کرے''۔ دو ایک غزلوں میں ایسا لگا کہ نظر ''ثانی'' میں ''ثانی'' کافی نہیں تھی، کچھ اور نظر ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ویسے غزلوں کا انتخاب اچھا تھا، مثلاً واصف حسین واصف صاحب کی غزل۔ افسانوں میں نصرت بخاری کا ''تندور والے کی کہانی'' اور ڈاکٹر اشرف آثاری کا ''ملفوف کی پشت'' بہت اچھے تھے۔ تابش خانزادہ صاحب کا ''منچورین کینڈیڈیٹس'' جو تجزیہ بھی ہے اور اشاریہ بھی، یقیناً تشویش اس میں مذکور باتوں کے لیے بہت چھوٹا لفظ ہے، جانے ہمیں ابھی اور کیا کیا دیکھنا ہے۔ آپ نے یہ جو مختلف زبانوں کے ادب کا ترجمہ شامل کرنا شروع کیا ہے، اس پہ آپ کو الگ سے داد۔ یوں یہ کہانیاں ہمیں مختلف ذہنوں اور معاشروں میں جھانکنے کا موقع فراہم کرتی ہیں اور پھر پابلو نرودا کی نظم، کیا کہنے۔

فیصل عظیم (کینیڈا)

جناب گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم

امید ہے مزاج بخیر ہونگے اور حسبِ معمول اپنی روزمرہ کی زندگی کے ساتھ ساتھ زبان وادب کی آبیاری میں مشغول ہونگے۔ میں بحمداللہ ٹھیک ہوں۔ کئی بار سوچا کہ آپکو مبین مرزا نمبر کی مبارک باد پیش کروں لیکن مزاج کے آلسی پن نے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ بحرحال کل اپنے مزاج پر لاحول پڑھ کر مبین مرزا نمبر کا مطالعہ کیا لیکن بحرحال اتنا تو ہو ہی گیا کہ کچھ لکھ سکوں۔ ماشاللہ بہت عمدہ اور بے مثال کام کر رہے ہیں آپ ہمارے بھارت میں اس طرح کے جریدے اب نہیں نکلتے تمام مصنفین اور شعراء کا کلام بہت عمدہ اور اعلیٰ ہے محترم مبین مرزا کی بیمثال شاعری پہلی بار پڑھی لیکن اگر نہ پڑھتا تو بہت کمی رہ جاتی۔ جزاک اللہ خیر

افق فریدی (میرٹھ)

یارِ سدا بہار گلزار جاوید۔ سلام مسنون۔

نئے سال کی مبارکباد۔ خدا کرے کہ یہ سال ۲۰۲۰ء سے یکسر مختلف ثابت ہو جس میں تقریباً سارا سال ہی دنیا بھر میں زندگی اور موت کے درمیاں ٹونٹی ٹونٹی میچ کھیلا جاتا رہا۔ ''چہارسُو'' کے تازہ شمارے پر تبصرہ بھیجنے کی مہلت پانچ دن کی ملی تھی سو اس کے ختم ہونے سے دو گھنٹے پہلے بھیج رہا ہوں، اور ایک پرانا شعر آپ کی نذر کر رہا ہوں:

مرے محبوب نے وعدہ کیا ہے پانچویں دن کا
کہیں سے سُن لیا ہوگا، قیامت چار دن کی ہے

''چہارسُو'' اگرچہ کاغذی صورت میں نہیں آ رہا، مگر ہم جیسے کاہل الوجود لوگوں نے بھی اس کے برقی وجود کو ڈاؤن لوڈ کر کے کاغذی صورت میں ڈھالنے کا طریقہ سیکھ ہی لیا ہے۔ اس کی مزید مقبولیت اور ''ریڈرشپ'' کا اندازہ 'رس رابطے' میں موجود خطوط کی زیادہ تعداد سے ہوا۔ اِس مرتبہ قرطاسِ اعزاز آپ نے ایک بہت عمدہ شاعر، افسانہ نگار، نقاد اور ''مکالمہ'' کے مدیر جناب مبین مرزا کے نام کیا ہے، اور حق یہ ہے کہ گذشتہ کئی شماروں کے بعد اس شمارے میں یہ حصہ انتہائی بھرپور اور نہ صرف موصوف بلکہ اس لحاظ سے آپ کے بھی شایانِ شان ہے کہ ان کا انٹرویو لیتے ہوئے بقول شخصے آپ نے قلم ہی توڑ دیا ہے۔ جناب مبین مرزا سے تاحال میری گنی چنی ملاقاتیں بس چلتے پھرتے ہی کسی نہ کسی تقریب میں ہوئی ہیں، اس لیے ان کے کام اور ان کی ذات کے بارے میں بہت کچھ اس شمارے سے معلوم ہوا اور حیرت ہوئی کہ ایک اکیلا شخص اتنا بہت کچھ کرنے کے باوجود خبطِ عظمت کے جال میں گرفتار نہیں ہے۔ ان سے آپ نے کئی حوالوں سے بڑے نازک سوالات بھی کیے جن کا انہوں نے بھی نازک تر جواب دے کر یہ احساس دلایا کہ یہ دو بڑے لوگوں کا میدان ہے جن کی گفتگو بیشتر ادبی اور شخصی پہلو روشن کر رہی ہے۔ میں چونکہ براہِ راست درخواست کے باوجود آج تک ''مکالمہ'' حاصل کرنے والوں کی فہرست میں شامل نہیں ہو سکا اس لیے اِدھر اُدھر سے ''مکالمہ'' کے چند شمارے ہی حاصل کر سکا ہوں، اور اس کے مضامین و دیگر

مشمولات کا مطالعہ کر کے حیران بھی ہوتا ہوں۔اب ایک مرتبہ پھر اُن سے رابطہ کر کے درخواست کرتا ہوں (بلکہ اگر وہ اسی خط کو درخواست سمجھ لیں!) کہ میرا نام مفت خوروں کی فہرست میں نہیں بلکہ چاہنے والوں کی فہرست میں شامل کر لیں تو ان کی عنایت ہوگی۔ان پر لکھی ہوئی پروفیسر فتح محمد ملک، جناب سلیم یزدانی اور ڈاکٹر علی احمد فاطمی کی تحریروں نے ان کی شخصیت وفن کے کئی دریچے وا کیے ہیں۔

اور اب آتا ہوں ''زہریلا انسان'' کے مصنف جناب تابش خانزادہ کے مضمون ''مینچورین کینڈیڈیس'' کی جانب، جس میں انہوں نے سیاست کے عالمی کھلاڑیوں کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کیے ہیں، اور ایل ایس ڈی جسے عام لوگ صرف ایک نشہ آور محلول ہی سمجھتے تھے، اس کی عالمی سطح پر دہشت انگیزی اور قتل وغارت میں استعمال ہونے کی تفصیل دی ہے۔زہریلا انسان میں تو ایک فرد ہی کا قصہ تھا، مگر اس مضمون میں ایل ایس ڈی کے زہر نے خاص طور پر امتِ مسلمہ کی تباہی میں جو کردار ادا کیا ہے وہ ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ شاہ فیصل کا قتل کس طرح انہی کے بھتیجے کو ایل ایس ڈی کا عادی بنا کر بلیک میل کر کے کیا گیا اور پھر کس طرح جنرل ضیاء الحق کو ذوالفقار علی بھٹو کے قتل پر آمادہ کیا گیا۔تابش خانزادہ صاحب نے مضمون کے آخر میں لکھا ہے کہ یہ مقالہ کافی اختصار سے لکھا گیا ہے اور وہ اس پر ایک ضخیم کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔میری درخواست ہے کہ وہ اس کتاب کو بھی کتابی صورت میں لانے سے قبل ''چہارسُو'' کے صفحات پر ہی قسط وار شائع کرنے کا آغاز کر دیں۔یہاں یہ بھی ذہن میں آرہا ہے کہ کہیں ایل ایس ڈی کی طرح گذشتہ برس کے آغاز میں کرونا وائرس کا پھیلاؤ بھی اسی کھیل کا حصہ تو نہیں ہے؟اس بارے میں تاحال جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے ڈانڈے بھی انہی عالمی کھلاڑیوں کے ساتھ عالمی کاروباری اداروں کی جانب بھی اشارہ کرتی ہیں۔

برسبیلِ تذکرہ جناب تابش خانزادہ نے ''زہریلا آدمی'' کی اشاعت کی دعوت ناشرین کو دیتے ہوئے اس کی چند کاپیاں قیمتاً خریدنے کی پیشکش بھی کی ہے۔خدا کرے کہ ایسا ہو جائے اور یہ یادگار ناول ہمیں کتابی صورت میں بھی میسّر ہو جس کی اشاعت کے بارے میں سوچ کر ہی اسے قندِ مکرر کے طور پر پڑھنے کی خواہش جاگ اٹھی ہے۔اپنی گنجائش کی حد تک اس ناول کی چند کاپیاں تو میں بھی خرید کر دوستوں میں بانٹ دوں گا۔

پیشتر اس کے کہ یہ پانچواں دن اختتام پذیر ہو کر چھٹے دن کی جانب روانہ ہو، میں یہ خط ختم کرتا ہوں تا کہ اس کے بعد ای میل کے مراحل بھی آج ہی کے دن طے ہو جائیں۔اللہ آپ اور دیگر سب دوستوں کو سلامت رکھے۔آمین۔

نسیمِ سحر (راولپنڈی)

محترم گلزار بھائی، سلام وواجبات۔

چہارسو کا پیڈی ایف موصول ہوا۔جس کی ایک ایک سطر میں آپ کی اردو سے محبت ظاہر ہو رہی ہے۔اس پرآشوب ۲۰۲۱ کے دور میں جب انسان بہت سی ذہنی اور مالی پریشانیوں میں گھرا ہوا ہے۔اس وقت بھی آپ ایک سچے اردو دوست بنے رہے اور لگاتار کوشش کا نتیجہ یہ دیدہ زیب اور بہترین مواد سے پُر چہار سوا پرچہ ہے اگرچہ یہ مبین مرزا نمبر پر نکالا ہوا خاص نمبر ہے لین مایوس دیگر لوگ بھی نہیں ہیں۔

چہارسو میں چھپنے والی تمام نگارشات نہایت اعلیٰ اور پراثر ہوتی ہیں۔مبین مرزا صاحب کی تحریر نمائیش پسندی کے دور میں ادب اور عنبرین حسیب عنبر صاحبہ کی تحریر مبین مرزا بطور شخصیت اور اسکے ساتھ ہی فاری شاہ کی موجِ رواں (مبین مرزا کا غزلیہ کلام) ان تینوں تحریروں نے مبین مرزا صاحب کی شخصیت کا مکمل تعارف پیش کر دیا اسکے لئے عنبرین حسیب عنبر صاحبہ اور فاری شاہ صاحب قابل مبارک باد ہیں۔افق صاحب کی غزل بھی پسند آئی۔اسکے علاوہ عبداللہ جاوید صاحب نے حسرت موہانی کی شاعری پر بہترین لکھا ہے یعقوب نظامی صاحب نے بھی اپنے سفرنامہ ''برطانیہ سے جاپان'' میں خوب سیر کرائی۔لکھنے کو تو اور بھی بہت کچھ ہے لیکن ظاہر ہے کہ ہر ایک لکھاری اور مصنف کا نام لیکر لکھنا تو یہاں مناسب نہیں۔تمام مصنفین کو بہت بہت مبارک باد ساتھ ہی دعا گو ہوں کہ اللہ آپکو مکمل صحت کے ساتھ سلامت رکھے اور آپ اسی طرح خدمت ادب مصروف رہیں آمین۔

نصرت شمسی (رامپور)

گلزار جاوید صاحب، آداب۔

اس مرتبہ بھی چہارسو کا نیا شمارہ آپ بروقت لانے میں کامیاب رہے، بہت بہت مبارکباد۔حالات چاہے کیسے بھی ہوں، آپ اپنا کام وقت پر کر ہی لیتے ہیں یہ آپ کی فطرت ہے یا کام کا جنون؟

بہرحال، چہارسو پریوار کے لیے یہ خوشی کی بات ہے۔مبین مرزا صاحب کی ادبی شخصیت کے بارے جان کر خوشی ہوئی۔حسبِ معمول براہِ راست کے سوالات دلچسپ بھی تھے اور انفرادی بھی۔انٹرویو پڑھ کر ہی مبین صاحب کی پوری زندگی کے سفر اور اُن کی ادبی خدمت کی جانکاری حاصل ہوگئی۔شاعری کے علاوہ ان کا افسانہ ''واٹس ایپ'' بہت پسند آیا۔مردوں کی نفسیات کا خوب اچھے سے تجزیہ کیا ہے۔آپ کو اور مبین مرزا صاحب کو بہت بہت مبارکباد۔

شہناز خانم صاحبہ کا افسانہ دلچسپ ہے۔مشرق کی عورت دنیا کے کسی کونے میں چلی جائے رہے گی وہ مشرقی خیالات کی ہی۔گئو رکشک موجودہ حالات کی اچھی عکاسی کرتا ہے۔اغوا، تندور والے کی کہانی بھی اچھی ہے حالانکہ اختتام پہلے ہی واضح ہو جاتا ہے۔

عورتوں اور مردوں کی نفسیات اور رشتوں پر مبنی سیمیں کرن کی کہانی بھی دلچسپ ہے۔''چھن'' انسان کی لاچاری، اس کے خوابوں کی تعمیر اور شجرِ تنہا بزرگوں کی تنہائی کے مسئلے پر اچھے افسانے ہیں۔

ایک مدت بعد مجاز کی نظم جبیں پر شکن ''نورا'' پڑھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔کہاں سے ڈھونڈ لیتے ہو آپ یہ نگینے۔حسرت موہانی کی شاعری پر لکھا مضمون مختصر تھا مگر معلوماتی رہا۔پروین شیر کا سفرنامہ مونے کی کہانی بھی دلچسپ تھا۔اُن کے اندازِ بیاں کی میں ہمیشہ قائل رہی ہوں۔نثر میں بھی شاعری کا مزا

آتا ہے۔ثریا کی زندگی کی کہانی دل کو چھوگئی۔

دعا ہے کہ پرماتما آپ کو صحت عطا کرے اور آپ اسی طرح اپنی محنت اور لگن سے چہارسو کی خوشبو چہارسو پھیلاتے رہیں۔(آمین)

رینو بہل (چندی گڑھ)

جناب گلزار جاوید، السلام علیکم۔

انفرادیت آپ کا خاصہ ہے۔پی۔ڈی۔ایف کتابیں تو بہت پڑھی ہیں لیکن جیسی رنگین فائل آپ نے بھیجی، ایسی تو اس سے پہلے نہیں دیکھی۔مبین مرزا صاحب کے کوائف اس ہنرمندی سے لکھے گئے کہ ان کی علمی شخصیت کے خدوخال نمایاں ہوجاتے ہیں۔انٹرویو کرکر کے آپ اس فن میں طاق ہوچکے ہیں۔

دوسروں کے خط اگرچہ پڑھنا گناہ ہے لیکن میں شوق سے پڑھتا ہوں۔اشفاق احمد، ڈاکٹر وزیر آغا، شمس الرحمٰن فاروقی کے علمی خطوط بہ غور پڑھنے کے بعد، ساقی فاروقی کے خط نے وہ مزا دیا جو سکول کے زمانے میں "تفریح" دیا کرتی تھی۔اشفاق احمد، ڈاکٹر وزیر آغا، شمس الرحمٰن فاروقی کے خطوط میں ان نابغہ روزگار شخصیات کی نفسیات پر بہت سی باتیں ہوسکتی ہیں۔خط کی افادیت ہی یہ ہے کہ لکھنے والا اس میں وہی لکھتا ہے جو اس کا دل چاہتا تھا؛ یہاں خط میں انسان کی شخصیت بے نقاب ہوجاتی ہے۔

انٹرویو کرنے والا اگر تخلیقی صلاحیت رکھتا ہو تو انٹرویو کی اہمیت اور افادیت بڑھ جاتی ہے؛ آپ بہ ظاہر لگتے نہیں ہیں لیکن اللہ نے آپ کو تخلیقی انٹرویو کی صلاحیت سے نواز رکھا ہے؛ اور یہ وہ صلاحیت ہے جو کسی کسی کے ہاں دکھائی دیتی ہے، ٹی۔وی ٹاک شوز کے اینکر دیکھ لیجیے۔آج بھی این۔آر۔او کے متعلق سوالات کررہے ہیں۔ایسا اس لیے ہے کہ وہ تخلیقی صلاحیت سے عاری ہیں۔مجھے مبین مرزا کا یہ جملہ بہت پسند آیا۔" گھٹیا دشمن بار بار آپ کو اپنی سطح پر لانے کی کوشش کرتا ہے"۔

شعر اور افسانے کے حوالے سے تو یقیناً دوسرے دوست گفتگو کریں گے میں چاہتا تھا کہ میں خطوط اور انٹرویو کے متعلق اپنے تاثرات درج کروں۔

سید نصرت بخاری (اٹک)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ ''چہارسو'' میرے ہاتھ میں تھا اور میں نے اسے پڑھا مگر فون میرے ہاتھ میں تھا اور اسی پر انتہائی حسین سرورق جگمگا رہا تھا۔ جناب مبین مرزا صاحب کی پروقار تصویر تھی جن کے بارے میں ایک گلدستہ کی طرح مضامین سجائے گئے تھے۔پڑھ کر بے حد لطف آیا۔کاش کے رنگین رسالہ میرے ہاتھ میں ہوتا تو یقیناً ایک دن میں ہی ختم ہوجاتا۔

ادب کی چاشنی تو اپنے وطن میں ہی مٹھاس دیتی ہے وہاں ہوتے تو آپ سب لوگوں سے ملاقات ہوتی۔مبین مرزا کا انٹرویو آپ نے نہایت ذہانت سے لیا ہے اور ان کے جواب انتہائی پُرلطف اور بہت مفصل طریقے سے دیئے گئے ہیں۔یوں ان سے آدھی ملاقات ہوگئی۔ان کی شخصیت سے اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ہمارے ہاں سبھی والدین پلیٹ کو ''رکابی'' کہتے تھے کھانا کھالیں کا لفظ عام تھا نہ کے کھانا ڈالیں۔ان کا افسانہ والٹس ایپ کا اختتام پسند آیا۔خوبصورت افسانہ ہے۔سلیم یزدانی کا ''پہلا درویش''، مبین مرزا سے ملواتا ہے۔ڈاکٹر عنبرین حسیب عنبر کا مبین مرزا صاحب بطور شخصیت بہت دلچسپ مضمون لگا۔

افسانے سب ہی اچھے تھے خاص طور پر ملفوف کی پشت، چھن، تندروو والے کی کہانی۔سچ مگر تکلیف دہ حقیقت۔

شاعری میں سیفی سرونجی، پروین شیر اور تمام شعراء کا کلام قابلِ تعریف ہے۔مشیر طالب کا دلیپ کمار اچھا لگا۔نمائش پسندی کے دور میں ادب بات بالکل صحیح ہے۔لگتا ہے چکا چوند کے پیچھے سادہ ادیب دب جائے گا۔بے شمار مضامین پر بات کی جاسکتی ہے مگر اتنا ہی کافی ہے کہ اظہار رائے دینے والے اور بھی ہیں۔اگلے شمارے کا انتظار رہے گا۔خدا کرے کہ آپ استقامت اور ہمت سے یہ پرچہ نکالتے رہیں۔

رعنا کوثر (نیویارک)

برادرم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ عصرِ حاضر کی اہم اور ہمہ جہت شخصیت جناب مبین مرزا سے منسوب ہے۔جنہیں اردو ادب کی دنیا میں بطور افسانہ نگار، شاعر، نقاد اور دیگر ادبی خدمات کے حوالہ سے خاص مقام حاصل ہے۔''براہِ راست'' میں ان کے ساتھ آپ کا مکالمہ خوب ہے جس میں مبین مرزا صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلو قارئین چہارسو کے ساتھ شیئر کیے گئے ہیں۔کہتے ہیں سوال کرنے کی خوبی آدھا علم ہے۔قارئین سے مبین مرزا صاحب کی ادبی خدمات کے حوالہ سے تفصیلی تعارف کروانا آپ کا قابل تحسین عمل ہے۔

شمارہ میں دلچسپ افسانے، مضامین اور عمدہ شاعری شامل کی گئی ہے۔ڈاکٹر اشرف آثاری کا افسانہ ''ملفوف کی پشت'' اُداس کردینے والی سبق آموز تحریر ہے۔یہ غور کرنے کی بات ہے کہ کیا وجوہات تھیں جن کی وجہ سے ایک دوست وطن سے دُور سعودی عرب میں اور دوسرا وطن میں رہنے اور مال، اولاد ہونے کے باوجود تکلیف دہ تنہائی کا یوں شکار ہوتے کہ ایک کو Old age Home میں رہنا پڑا اور دوسرا وطن لوٹنے کے انتظار میں تنہائی کا شکار ہوا۔ میرے خیال میں اس کی بڑی وجہ رشتوں میں محبت اور چاشنی کی کمی ہے جو نوجوان نسل کو اپنے بزرگوں سے جذباتی طور پر دُور کرنے کی بنیادی وجہ ہے بالخصوص سسرالی رشتوں میں اگر نئی آنے والی دلہن کے ساتھ خلوص اور پیار کا رشتہ خصوصی توجہ سے روا رکھا جائے وہ اپنے آپ کو اس خاندان کا ایک اہم ممبر محسوس کرے اور بزرگوں کو اپنے لیے لازمی جزو زندگی سمجھتے ہوئے ان سے دوری کا خیال بھی تصور میں نہ لائے چہ جائیکہ خدمت کے بجائے اولڈ ایج ہوم (Old age Home) بھیجنے کا کوئی خیال اپنے دل میں لائے اور موتیوں کی لڑی کی طرح تمام افرادِ خانہ باہم زندگی گزاریں۔

شہناز خانم عابدی کے افسانے کا عنوان ''میٹا مورفورسس'' بیشتر قارئین کے لیے سمجھ سے بالاتر ہے۔ بہتر ہوتا اگر ادیبہ اس عمدہ اردو افسانے کا عنوان بھی اردو میں لکھتیں۔ افسانہ حقیقی دنیا کے بالکل قریب ایک دلچسپ داستان ہے جس میں ایک تعلیم یافتہ لڑکی کینیڈا جا کر شادی شدہ زندگی میں اپنے شوہر کے اصلی مزاج سے جب بتدریج واقف ہوتی ہے تو نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتی ہے اور زندگی دشوار تر ہو جاتی ہے جو آخر کار علیحدگی کا سبب بنتی ہے۔ برسوں کی علیحدگی کے دوران شوہر اپنی محنت سے زندگی کی تمام بنیادی ضروریات بدرجۂ اتم حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن آخر کار محسوس کرتا ہے کہ عیش وعشرت کی زندگی ازدواجی زندگی کی خوشیوں کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ یہ احساس اُسے اس وقت جکڑ لیتا ہے جب بیماری کی وجہ سے وہ تنہا زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ تب اُسے اپنے رفیقہ حیات کی موجودگی اور محبت کا احساس بے چین کر دیتا ہے جس پر وہ اپنی رفیقہ حیات کو واپس بلا لیتا ہے اور وہ بھی سب کچھ فراموش کر کے اُس کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ یہاں غور کرنے کی خاص بات یہ ہے کہ شادی سے پہلے دیگر امور کے علاوہ جس چیز کی خاص طور پر پیشگی تحقیق کرانا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ لڑکے اور لڑکی کا اپنی نجی گھریلو زندگی میں بنیادی یا اصلی مزاج (Temprament) کیا ہے اور کیا وہ اس مزاج کو تبدیل کیے بغیر کامیاب ازدواجی زندگی گزار سکیں گے کیونکہ ظاہری اور اصلی چہرے میں بیشتر اوقات پریشان کن فرق نکل آتا ہے۔

شمع خالد کا افسانہ ''اغوا'' ایک انوکھی اور سبق آموز تحریر ہے لڑکپن اور اوائل عمر کی بے اعتدالیاں نتائج کے اعتبار سے تباہ کن ثابت ہو سکتی ہیں اور ضمیر پر مسلسل بوجھ بھی رہتا ہے۔ اگر والدین اپنی اولاد کی تربیت اور نگرانی میں کوتاہی نہ کریں تو ایسے واقعات سے بچا جا سکتا ہے۔

پروین شیر صاحبہ نے بے شمار ممالک کی سیاحت کی ہے۔ ''مونے کی کہانی'' میں انہوں نے فرانس کے شہر پیرس سے پچاس میل دور ایک نہایت خوبصورت اور پُرسکون قصبہ جورنی کی منظر کشی کی ہے جو عظیم فنکار مونے (Claude Oscar Monet) کو اتنا پسند آیا کہ وہ بس وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ مونے نے اس قصبہ میں ایک شاندار گھر بنایا جس میں ایک نہایت خوبصورت باغ بنایا جو پھولوں اور پانی کی موجودگی میں دیکھنے والوں کو سحر زدہ کر دیتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک وسیع اسٹوڈیو بھی بنایا جس میں خوبصورت فن پارے بنائے اور رکھے گئے۔ ۱۹۲۶ء میں مونے کی وفات کے بعد اس کے وارث بیٹے کی نگرانی میں اسے دوبارہ تزئین وآرائش کے بعد کھول دیا گیا جسے دیکھنے کے لیے ہر سال تقریباً پانچ لاکھ سیاح یہاں کھچے چلے آتے ہیں۔ پروین شیر صاحبہ نے کچھ اس انداز میں منظر کشی کی ہے کہ قاری خود بھی ایک سیّاح کی طرح تصور کی آنکھ سے یہ سارا منظر سامنے دیکھ رہا ہوتا ہے۔

شاعری میں عمدہ کلام شامل کیا گیا ہے۔ خصوصاً افتخار عارف، اسرار الحق مجاز، مشیر طالب اور پروین شیر کا کلام بہت خوب ہے۔ یوسف عزیز زاہد نے اپنے کلام میں بڑی خوبصورتی سے ناصر علی سید صاحب کا سوانحی بیانیہ سمو لیا ہے۔ موجودہ حالات میں ''چہارسو'' کا بروقت اجراء اور اعلیٰ معیار قائم رکھنے پر آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

جناب گلزار جاوید، السلام علیکم۔

آپ کے مؤقر رسالے ''چہارسو'' کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ بہت عمدہ پرچہ ہے۔ مبین مرزا پر خصوصی گوشہ بہت اہم اور بھرپور ہے۔ آپ نے بالکل درست شخصیت کا انتخاب کیا ہے۔ مبین مرزا اس دور کی ایک بڑی ادبی شخصیت ہیں اور اسم بامسمّٰی۔ ایسی ہمہ جہت شخصیت اس زمانے میں خال خال ہی دکھائی دیتی ہیں۔ مبین مرزا نے تنقید، افسانے، شاعری اور خاکے جس صنف میں بھی کام کیا، اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا ہے۔ ان کے تخلیقی کام کا اعتراف شمس الرحمٰن فاروقی اور انتظار حسین جیسے بڑے لوگ بھی کر چکے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس عہد کے تنقیدی منظر نامے پر بھی مبین مرزا کا نام بہت نمایاں اور روشن ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ تنقید کا یہ عہد جن معدودے چند ناموں سے عبارت ہے، ان میں مبین مرزا اپنی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ میں یہ باور کرتا ہوں کہ وہ ایک تہذیبی نقاد ہیں اور اپنی نسل کے سب سے نمایاں آدمی ہیں۔ آپ نے ان پر ایک بھرپور گوشہ شائع کر کے حق بحق دار رسید کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا یہ شمارہ ایک حوالے کی دستاویز قرار پائے گا۔ میری طرف سے دلی مبارک باد۔

رضی مجتبیٰ (کراچی)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''پہلے آپ کا پرچہ پابندی سے ملتا تھا، لیکن بعد میں ملنا بند ہو گیا۔ میں نے سمجھا کہ شاید پرچہ شائع ہی نہیں ہو رہا۔ حالات بھی ایسے تھے، سارے ہی کام تعطل کا شکار ہوتے جا رہے تھے۔ اب معلوم ہوا کہ نہیں، آپ تو پابندی سے اپنا رسالہ شائع کر رہے ہیں، لیکن اب اس کی ہارڈ کاپی نہیں بلکہ سوفٹ کاپی آ رہی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ آپ نے اپنا کام جاری رکھا ہوا ہے۔

اس بار چہارسو کا مبین مرزا نمبر شائع ہوا۔ دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ مبین مرزا میرے دیرینہ دوست ہیں اور ایک جینوئن تخلیق کار اور اسکالر ہیں۔ ان جیسے تخلیق کار کو خراجِ عقیدت پیش کرنا قابلِ تعریف ہے۔ اگر پہلے معلوم ہوتا کہ آپ مرزا صاحب پر نمبر شائع کر رہے ہیں تو میں بھی آپ کو مضمون ارسال کر سکتا تھا۔ مرزا صاحب کے افسانوں پر مضمون لکھ چکا ہوں۔ شخصیت کے حوالے سے بھی مضمون بھیج سکتا تھا۔ خیر، آئندہ کبھی آپ کی محفل میں شرکت کا کوئی اور موقع ملے گا تو ضرور شریک ہوں گا۔ مبین مرزا نمبر کی اشاعت کی بے حد مبارکباد۔

کرن سنگھ (کراچی)

☆

..... دوستوں کے درمیاں .....

احمد شمیم اور منیرہ احمد شمیم وہ خوبصورت لوگ ہیں جن کے ہونے سے آگاہ ہونا زندگی کی خوبصورتی کو دریافت کرنے کے عمل کا نام ہے۔ احمد شمیم مرحوم کی نظموں کو پڑھتے ہوئے جس طرح قاری کے جمالیاتی اور فکری منطقے آباد ہوتے ہیں اس کا بیان ناممکن ہے اسی طرح منیرہ احمد شمیم کے افسانے انسانی وجود کے سفر اور اس کی تلاش کو جس انداز میں پیش کرتے ہیں وہ اپنی جگہ پر ایک منفرد تخلیقی رنگ ہے۔ ان دونوں شخصیات جن کو محبت نے ایک اکائی کا روپ دے دیا کے نام، کام اور ذات کو جاننا بھی ایک بڑے اعزاز سے کم نہیں اور میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے احمد شمیم مرحوم کی نظم سے لے کر آپی منیرہ احمد شمیم کی دعاؤں تک کی دولت نصیب ہوئی۔ آج جب آپی منیرہ احمد شمیم کی طرف سے احمد شمیم کے ان کے نام خطوط پر مشتمل کتاب ''ہوا نامہ بر ہے'' احمد شمیم کے فکر وفن کے بارے دوسرے ادیبوں کی تحریروں پر مشتمل کتاب ''میں آپ اور وہ'' اور اپنے افسانوں کی کتاب ''بے گیان گوتم'' محبت اور دعا آمیز لفظوں کے ساتھ مجھے عطا ہوئیں تو مجھے یوں لگا کہ ایک لازوال خزانہ مل گیا ہے اور ہر سُو لفظ، خیال اور جذبوں کے شوخ اور انمٹ رنگ بکھر گئے ہیں۔ منیرہ آپی آپ سلامت رہیں اور احمد شمیم مرحوم کے گھرانے کے سب لوگ شاد وآباد رہیں۔ آمین۔

از ہر ندیم

اشاعت: ۲۰۲۰ء، قیمت: ۵۰۰ روپے، دستیابی: مثال کتاب گھر، امین پور بازار، فیصل آباد۔

..... کشف .....

''کشف'' کی ایک انفرادیت اور کمال یہ ہے کہ اس کی ۹۵ فیصد سے زائد غزلوں کی زمینیں، قافیے اور ردائف بظاہر نئی نہ بھی ہوں لیکن ان کا استعمال اور برتاؤ بہت اچھوتا اور نیا پن لیے ہوئے ہے۔ جنید آزر نے ماضی کی متنازعہ تحریکِ لسانی تشکیلات سے دامن بچاتے ہوئے بھی ادبی تشکیلات اور تراکیب کے استعمال میں حد درجہ ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایک نئے راستے کا تعین بھی کیا ہے جس پر چلنا سہل نہیں۔

''کشف'' کی شاعری میں انفرادی اور اجتماعی اشکال کی ذہنی، فکری اور نفسیاتی جہتوں کی کمال آفرینی بھی اس مجموعے کے قد وقامت میں اضافہ کرتی ہے۔ اس میں عصری شعور کا علامتی بیان قاری کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے اور یوں یہ دل سے زیادہ دماغ کو متاثر کرتی ہے۔ میں نے جنید آزر کے اس موضوعاتی اور لسانیاتی برتاؤ کو سوچنے اور کریدنے کی کوشش کو تو بلاشبہ مجھے اپنی نارسائی کا احساس ہونے لگا اور ظاہر ہے اس میں قصور میرا ہی ہے کیونکہ آج کل ایک ابنوہِ بے کراں جس طرح کی شاعری کر رہا ہے اور ہم تن آسانی کے تناظر میں جو کچھ پڑھ رہے ہیں وہاں ''کشف'' کی شاعری کو سوچنے، سمجھنے اور اسے رگوں میں اتارنے کے لیے کسی کرامت کی ضرورت ضرور پڑتی ہے۔ بس جنید آزر نے اپنے ''کشف'' سے جو کرامت تخلیق کرنے کی سعی کی ہے اسے اس سلسلے میں سرخرو قرار دیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر نذیر تبسم

اشاعت: ۲۰۲۰ء، قیمت: ۵۰۰ روپے، دستیابی: بیلا پبلی کیشنز، اسلام آباد۔

..... درکار .....

میرے نزدیک اقرار مصطفیٰ کے کلام کی بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے قافیے کی رعایت سے مضامین تلاش نہیں کیے (یہ مرض آج کل پورے زوروں پر ہے) بلکہ مضامین کو مہارت سے اپنے انداز کا تخلیقی سانچہ دیا ہے جس طرح شعائی خطوط کو شمار نہیں کیا جاسکتا بالکل اسی طرح اُن کی غزل کے مضامین کی سمتوں کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ فکری جہات رمز وایما کے ذریعے اُن کی شناخت متعین کرتی ہے۔ داخل سے مکالمہ ہو کر خارج سے وہ کسی کی پاس داری، وفاداری یا وکالت نہیں کرتے بلکہ ان کے نزدیک جو درست ہے اسے اپنے انداز میں کہنے کا خاص ملکہ رکھتے ہیں۔ روایت کے خوب شناسا ہیں مگر کسی کے مقلد نہیں۔ ماضی گواہ ہے کہ بہت سے خلاق شاعر تقلید کے چکر میں اپنی صلاحیتیں ضائع کر بیٹھے ''درکار'' کے شاعر کی طبع اختراع پسند ہے اس لیے نئی نئی زمینوں میں اظہار کرتے ہیں۔ اُن کے ہاں نیا پن، موضوعی اعتبار سے کہیں زیادہ پیش کش کے انداز پہ استوار ہے یقیناً اس خوبی کو فنی خوبیوں میں بلند تر مقام حاصل ہے۔

ڈاکٹر غلام شبیر اسد

اشاعت: ۲۰۲۰ء، قیمت: ۵۰۰ روپے، دستیابی: بخن پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور۔

ماہنامہ
چہارسُو
راولپنڈی
دشت جنوں
DASHTE JUNO
Dr. Walaa Jamal El-Esselly
ارژنگ
ہیڈرڈ سے ادھوری ملاقات
محورِ دو جہاں
اللہ
رسول
محمد
گمشدگی سے خالی راستے